چالباز

مغربی تہذیب کے شکار اُن ابن الوقت لوگوں کی کہانی جو اپنی اصل کو بھلا کر پرائی تہذیب کے خود ساختہ سحر میں کھو جاتے ہیں اور اس طرح اپنے شناختی مرکز سے جدا ہو کر (شعوری یا غیر شعوری طور پر) اپنی پہچان کے سلسلوں کو مٹاتے مٹاتے اپنی دنیا اور عاقبت دونوں کو خراب کر لیتے ہیں۔ مذکورہ کہانی ان افراد اور خاندانوں کے لئے ایک شفاف آئینہ ہے جو شیشہ گران فرنگ کی کھوکھلی تہذیب کی دغا باز روشنی کی زد میں آئے ہوئے ہیں جو دور سے نگاہوں کو خیرہ کر دیتی ہے اور نزدیک جانے پر آنکھوں میں ذلت و رسوائی کے ڈنک مارنا شروع کر دیتی ہے اور پھر بے حسی اور خود نمائی کا زہر انسان کے خون میں شامل ہو کر پورے جسم میں دوڑنے لگتا ہے۔ گویا انسان نے خود ہی اپنے اشرف المخلوقات ہونے کی نفی کرنے پر کمر باندھ رکھی ہے۔ اس کہانی کا مرکزی کردار ایک ایسا راست باز نوجوان ہے جو ٹیلی پیتھی کی صلاحیتوں سے مالا مال ہے۔ اس تحریر میں ٹیلی پیتھی کا ''ٹچ'' قارئین کے لئے یقیناً ایک سرپرائز ہے جس نے واقعات کی دلچسپی کو بامِ عروج تک پہنچا دیا ہے۔ انسانی فطرت کے مطابق جب کسی تحریر میں کوئی ایسی صورت حال پیدا ہو جاتی ہے جہاں ظلم و ستم اور ناانصافی حد سے بڑھ جاتی ہے یا بڑھنے لگتی ہے تو قاری محسوس یا غیر محسوس انداز میں ایسی صورت حال کی اصلاح چاہتا ہے۔ اور اگر واقعی کوئی مردِ میدان ایسی صورت حال کی اصلاح کر دے تو وہ قاری کے لئے تسکین کا باعث بنتی ہے اور اس کہانی میں قدم قدم پر آپ کے لئے تسکین کا سامان موجود ہے جس میں محبت کے پُر خلوص جذبوں کی تاثیر بھی شامل ہے۔

محمد علی قریشی

میں نیند سے بیدار ہوا تو میں نے اپنے آپ کو اُوپر والے برتھ پر لیٹا ہوا پایا۔ ریل گاڑی اپنی پوری رفتار سے سفر طے کر رہی تھی۔ میں چند لمحوں تک چھت کو ایک ٹک دیکھتا رہا۔ یہ فرسٹ کلاس ایئر کنڈیشنڈ کوپہ تھا۔ یہ صرف تین مسافروں کا تھا۔ اُوپر صرف ایک برتھ جس پر میں دراز تھا، نیچے دو برتھیں تھیں۔ کوپہ میں نائٹ بلب کی نیلگوں روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ وہ کبھی اس قدر تیز ہو جاتی تھی کہ اس کی روشنی ساٹھ واٹ کے بلب اتنی ہوتی تھی۔ کبھی اس قدر ہلکی کہ کوئی چیز واضح طور پر دکھائی نہیں دیتی تھی۔ میرا بستر بڑا آرام دہ تھا۔ کوپہ اس طرح ہل رہا تھا جیسے پالنا ہلایا جا رہا ہو۔

میرے ہم سفروں میں ایمی اور کرٹس تھے۔ وہ نیچے والی برتھوں پر سو رہے تھے۔ میں برتھ سے اُتر کر سیدھا ملحقہ ٹوائلٹ میں گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد نکلا تو ٹھٹک کر رُک گیا۔ میری نگاہ اُس برتھ کی جانب اُٹھ گئی جس پر ایمی گہری نیند سو رہی تھی۔ لیکن اُس کا حسن و شباب جاگ رہا تھا۔ شب خوابی کے نامناسب سے لباس میں اُس کے بدن کی حشر سامانیاں قیامت برپا کر رہی تھیں۔ اُس کے انگ انگ سے مستی اُبلی پڑ رہی تھی۔ اُس کے سینے میں سانسوں کا زیر و بم ہچکولے کھا رہا تھا۔ اس وقت وہ کسی کھلی کتاب کی طرح پڑی تھی۔ کرٹس دوسری برتھ پر سو رہا تھا اور اُس کا منہ دیوار کی طرف تھا۔

ایمی کے پُر شباب گداز بدن کے طلسم نے جیسے مجھے اسیر کر لیا تھا۔ میں نہ چاہتے ہوئے بھی اُسے دیکھنے پر مجبور تھا۔ نگاہ کی پیاس تھی کہ بجھنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ ایمی بہت حسین تھی۔ جتنی حسین تھی اس سے کہیں پُرکشش بھی تھی۔ اُس کے چہرے پر بلا کی معصومیت تھی۔ اُس کی عمر بائیس برس کی ہوگی۔ وہ دراز قد تھی جس نے اُس کے سراپا اور جسمانی نشیب و فراز میں اضافہ کر دیا تھا اور یہ اُس کی شخصیت کا نمایاں پہلو بھی تھا۔ اُس کے ریشمی گہرے بھورے بال عارض پر بکھرے ہوئے تھے۔ اس وقت رات کے گیارہ

بجکر چالیس منٹ ہو رہے تھے۔ وہ پلکوں کے دریچے بند کئے خوابوں کا نگر آباد کئے میری اس حرکت سے بے خبر تھی کہ میں اُسے پُرستائش نظروں سے اور آزادی، سکون اور اطمینان سے اس طرح دیکھ رہا ہوں جیسے وہ لندن کے عجائب گھر میں رکھا ہوا کوئی مجسمہ ہو۔ اُس کا پیکر اور چہرے کے خدوخال میرے دل پر بجلی بن کر گر رہے تھے۔

مجھے یکلخت یہ احساس ہوا کہ میری یہ حرکت بڑی معیوب اور ناشائستہ سی ہے جو مجھے زیب نہیں دیتی ہے۔ ایمی اچانک بیدار ہو گئی تو وہ مجھے اس طرح اپنی جانب دیکھتا پاکر دل میں کیا سوچے گی؟ زبان سے تو کچھ نہیں کہے گی لیکن اس کی آنکھیں اور بشرہ سب کچھ کہہ دے گا۔ مجھے ملامت کرے گا۔ اس وقت میری کیا حالت ہو گی؟

پھر میں اپنی برتھ پر آ گیا۔ میرے سرہانے میرا اٹیچی کیس اور بریف کیس رکھا ہوا تھا۔ میں نے کسی خیال کے زیر اثر بریف کیس کو کھولا، اُس میں کچھ کاغذات، پاسپورٹ اور ایک لفافہ تھا۔ لفافے میں غیر ملکی کرنسی امریکن ڈالر اور برٹش پاؤنڈ تھے۔ میری جیب میں پاکستانی کرنسی تھی۔ اس میں سو، پانچ سو، پچاس اور ہزار کے نوٹ تھے۔ کل کتنی رقم ہے؟ یہ مجھے یاد نہیں تھا اور نہ ہی انہیں گن کر دیکھنے کا موقع تھا اور نہ ہی اس کی کوئی ضرورت تھی۔

میں بستر پر دراز ہو گیا۔ لیکن میری نگاہ ایمی کی طرف اُٹھ گئی۔ کرٹس میری برتھ کے عین نیچے سو رہا تھا۔ وہ میری نظر بازی کو نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میں نے ایک لمحے کے لئے سوچا کہ اللہ نے بھی عورت کیا چیز بنائی ہے...... کائنات کا سارا حسن، اس کی دلکشی اور رعنائیاں عورت کے دم سے ہیں۔ دنیا کی کسی چیز میں اتنی کشش، حسن اور ایسی جاذبیت نہیں ہے جتنی عورت میں ہے۔ رات میں اس کا حسن اور بلاخیز ہو جاتا ہے، نکھر جاتا ہے۔

میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ میں نے سونے کی بہت کوشش کی۔ نیند مجھ سے رُوٹھ کر جیسے کوسوں میل دُور چلی گئی تھی۔ میں سو جانا چاہتا تھا تاکہ میں ایمی کو نہ دیکھوں۔ وہ اس طرح چھلک رہی تھی جس طرح کانچ کی صراحی میں شراب چھلکتی ہے۔ میں بستر پر کروٹیں بدلنے لگا۔ میری ہر کوشش بے سود رہی۔ مجھے جبھی نیند آ سکتی تھی کہ ایمی میری نظروں کے سامنے سے ہٹ جائے۔ پھر میرے دل میں ایک خیال آیا۔ اُس کی چادر جو اُس کے پیروں کے پاس پڑی تھی، وہ اُس کے جسم پر پھیلا دُوں۔ سینے تک ڈھانپ دُوں۔ اس طرح میں سو سکتا ہوں، ورنہ میں ساری رات ایک پل کے لئے بھی سو نہیں سکوں گا۔

اگلے لمحے میں برتھ سے اُتر آیا۔ پھر میں نے سب سے پہلے کرٹس کی طرف دیکھا، اس خیال سے کہ کہیں وہ بیدار تو نہیں ہے؟ میری اس حرکت کو نجانے کیا خیال کرے؟ وہ یہی سمجھے گا کہ میں دل اور پراگندہ جذبات کی رو میں بہہ کر ایمی کی نیند سے فائدہ اُٹھانے کے لئے اس کی برتھ کی طرف بڑھ رہا ہوں، ایمی کے حسن و شباب نے میرے دل میں فتور پیدا کر دیا ہے۔ جب مجھے اچھی طرح سے اطمینان ہو گیا کہ کرٹس گہری نیند میں غرق ہے تب میں ایمی کی برتھ کی طرف چوروں کی طرح بڑھا۔ میرا دل بہت تیزی سے دھڑکنے لگا اور پیر من من بھاری ہو گئے۔ میں نے ایئر کنڈیشنڈ ہونے کے باوجود اپنی پیشانی عرق آلود محسوس کی۔ چند قدموں کی مسافت جیسے صدیوں کی بن گئی۔ جب میں اُس کی پائنتی پہنچ کر رُکا تو ایسا لگا جیسے کوئی آتش فشاں دہک رہا ہو۔ میں نے فوراً ہی چادر اُٹھائی، پھر اُس کا سارا جسم ڈھانپ دیا۔ جب میں اپنی برتھ پر آ کر لیٹا تو مجھے ایسا لگا جیسے سر سے بہت بڑا بوجھ اُتر گیا ہے۔ اب میں سکون سے سو جاؤں گا۔ مجھے نیند آ جائے گی۔

لیکن یہ میری بھول تھی۔ جب میں نے اُس کی طرف دیکھا تو ایسا محسوس ہوا کہ اُس کا بھڑکیلا بدن اور بھڑک اُٹھا ہے۔ چادر سے اُس کے جسم میں ابہام کی کیفیت آ گئی تھی۔ جسم قدرے پردے میں ہوا تو اس کا جادو اور بڑھا۔ چادر میں انگ انگ بول رہا تھا۔ یہ کیا......؟ میں نے اپنا سر پیٹ لیا۔ یہ تو اُلٹ ہو گیا۔ پھر اچانک میرے ذہن میں ایک خیال آیا، نائٹ بلب آف کر دُوں۔ اس طرح اندھیرا پھیل جائے گا۔ نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری۔

میں اس خیال سے اُٹھنے والا تھا کہ گاڑی کی رفتار اچانک اس طرح سے تیزی سے کم ہونے لگی جیسے کوئی اسٹیشن آ رہا ہو۔ چند لمحوں کے بعد وہ ایک جھٹکے سے رُکی تو کرٹس نیند سے بیدار ہو گیا۔ پھر وہ برتھ سے نکل کر کھڑا ہو گیا، پھر وہ ٹوائلٹ کی طرف بڑھا۔ گاڑی شاید سگنل کی وجہ سے رُک گئی تھی۔ چند لمحوں کے بعد وہ ٹوائلٹ سے باہر آیا۔ پھر گاڑی رینگنے لگی۔

کرٹس اپنی برتھ پر جانے کی بجائے ایمی کی برتھ پر جا کر بیٹھ گیا۔ پھر اُس کا شانہ آہستگی سے ہلایا۔ ''ایمی!...... ایمی!......''

ایمی نے چند ثانیوں کے بعد اپنی آنکھیں کھول دیں۔ کرٹس کو دیکھ کر وہ دلفریب انداز میں مسکرائی، پھر اُس کی حسین آنکھوں کی گہرائیوں میں برقی قمقموں جیسی روشنی پھیل گئی۔ وہ مترنم لہجے میں بولی۔ ''کیا بات ہے؟ تم نے مجھے جگایا کس لئے......؟''

''اس لئے کہ تم سے باتیں کروں۔'' کرٹس نے جواب دیا۔ ''اب میں بیدار ہو گیا ہوں۔ شاید ہی اب مجھے نیند آئے۔''

''میں بڑی گہری نیند سو گئی تھی۔'' ایمی بولی۔ ''میں شاید نہ سوتی اگر تم نہ سوتے۔''

''معلوم نہیں...... مجھے کس لئے نیند جلدی آ گئی...... ورنہ میں بارہ بجے سے پہلے سوتا کہاں ہوں؟ میں نو بجے ہی سو گیا تھا۔''

''نیند بڑی ظالم ہے۔'' ایمی نے اُسے محبت بھری نظروں سے دیکھا۔ ''وہ تو سولی پر بھی آ جاتی ہے۔''

''لیکن تم اس سے زیادہ ظالم ہو۔'' کرٹس نے اُس کا بوسہ لیتے ہوئے کہا۔

''میں ظالم ہوں......؟'' ایمی کے حسین چہرے پر استعجاب چھا گیا۔ ''وہ کیسے......؟''

''تمہارا یہ حسن و شباب اور جسم کی بے پناہ کشش نیند اُڑا دیتی ہے۔'' کرٹس اُس کے بالوں کو سہلانے لگا۔

ایمی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اُس کی آنکھوں میں مستی چھانے لگی۔ وہ اُٹھ بیٹھی۔ پھر اُس کے گلے میں مرمریں عریاں بانہیں حمائل کر دیں۔ پھر وہ شوخی سے بولی۔ ''کرٹس! تم بہت شاعری کرنے لگے ہو۔''

''کیا خیال ہے، کچھ پی لیا جائے؟'' کرٹس نے اُس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

''خیال تو بہت اچھا ہے...... ایمی نے شگفتگی سے کہا۔ ''لیکن تم بہت جلد بہکنے لگتے ہو۔''

''تمہارے سامنے شراب کیا چیز ہے......'' کرٹس مسکرایا۔ ''تم ایک ایسی شراب ہو جو بن پیئے ہی نشہ طاری کر دیتی ہے۔''

''شراب پی کر قابو میں رہنا۔'' ایمی نے سرگوشی میں آہستگی سے کہا۔ ''زیادہ بہکنا نہیں۔''

''کم بہکنا یا زیادہ بہکنا کیا بات ہوئی؟'' کرٹس نے حیرت سے کہا۔ ''تمہیں کس کا ڈر خوف ہے؟''

''میں اس لئے کہہ رہی ہوں کہ اس کوپے میں صرف ہم دونوں نہیں ہیں، ایک ہمسفر بھی ہے۔'' وہ بولی۔

''تم اُس کی فکر نہ کرو...... وہ گہری نیند سو رہا ہے۔ اُس کے بیدار ہونے سے بھی کیا فرق پڑے گا؟''

''تم بہت شریر اور جذباتی ہو...... تم پر ہر وقت جنون سوار رہتا ہے۔'' ایمی ہنس پڑی۔

''یہ کوئی اچھی بات ہے کہ ایک اجنبی ہم دونوں کی رنگ رلیوں سے محظوظ ہو...... اُف! مردوں کو ذرہ برابر بھی احساس نہیں ہوتا ہے بے حجابی کا......''

''مردوں کو نہیں، عورتوں کو کوئی احساس نہیں ہوتا ہے۔'' کرٹس نے کہا۔ ''مرد بیچارہ مفت میں بدنام ہے۔''

''تم عورتوں کو الزام مت دو۔'' ایمی مسکرائی۔ ''تم یہ بات کس بناء پر کہہ رہے ہو...؟''

''جسم کی نمائش عورت کرتی پھرتی ہے، مرد نہیں۔'' کرٹس نے جواب دیا۔ ''تم نے اس وقت جو لباس پہنا ہوا ہے کیا اس نے تمہیں بے حجاب نہیں کر دیا ہے......؟ نائٹ کلبوں، فلموں اور رسالوں میں دیکھو، عورت ہر زاویئے سے بے حجابی کی نمائش کرتی ہے۔''

''اس میں عورت کا نہیں مردوں کا قصور ہے۔'' ایمی نے کہا۔ ''مرد نے عورت کی مجبوریوں اور کمزوریوں سے فائدہ اُٹھا کر اسے قدم قدم پر بے حجاب رہنے اور جسم کی نمائش پر مجبور کر دیا ہے۔ یہ لباس میں نے نہیں خریدا ہے، اسے تم نے مجھے گفٹ کیا ہے۔''

''اب بحث و مباحثے کا وقت نہیں ہے۔'' کرٹس نے کہا۔ ''رات باتوں میں گزر جائے گی۔''

کرٹس نے دستی بیگ اپنی برتھ کے نیچے سے نکالا۔ اُس میں سے ایک شراب کی بوتل اور دو گلاس نکالے۔ اُس نے بوتل اور گلاس میز پر رکھ کر دستی بیگ کو واپس برتھ کے نیچے رکھ دیا۔ پھر اُس نے دو بڑے پیگ بنائے۔ دونوں پینے لگے۔ ایک دوسرے کی آنکھوں میں محبت بھری نظروں سے جھانکنے لگے۔ ایمی کی بڑی بڑی آنکھوں میں خمار چھانے لگا۔

کچھ دیر تک دونوں پیتے اور سرگوشیوں میں محبت بھری باتیں کرتے رہے۔ پھر کرٹس نے اپنا گلاس خالی کرنے کے بعد ایمی کی طرف دیکھا۔ ایمی اُس کے مقابلے میں بہت آہستہ آہستہ پی رہی تھی۔ وہ چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھر رہی تھی۔ کرٹس نے اُس کے ہاتھ سے گلاس لے کر رکھ دیا۔ جب وہ خالی ہو گیا۔ ایمی نے نصف گلاس سے کم شراب ایک ہی سانس میں خالی کر دی تھی۔

''کیا تم اور پینا پسند کرو گی......؟'' کرٹس نے اُسے محبت بھری نظروں سے دیکھا۔

''ایک چھوٹا پیگ بنا دوں؟''

"نو...... تھینکس۔" ایمی نے جواب دیا۔ "تم نے مجھے بہت زیادہ شراب پلا دی ہے۔ اب گنجائش نہیں ہے۔"

"میں نے بھی کچھ زیادہ ہی پی ہے۔" کرٹس نے کہا۔ "اس لئے مجھ پر نشہ سا طاری ہونے لگا ہے۔"

"اب تم بستر پر جا کر سو جاؤ...... اور مجھے سونے دو۔" ایمی نے انگڑائی لیتے ہوئے اُس کی طرف شوخ نظروں سے دیکھا۔ "مجھے نیند آ رہی ہے۔ میں اب گہری نیند سو جانا چاہتی ہوں۔ شب بخیر۔"

"رات سونے کے لئے نہیں، جاگنے کے لئے ہوتی ہے۔" کرٹس نے کہا۔ "نہ میں سوؤں گا اور نہ تمہیں سونے دُوں گا۔"

"مردوں میں شاید لطیف جذبات اور ایک عورت کی تھکن اور اُس کے آرام کا کوئی احساس نہیں ہوتا ہے۔" ایمی کہنے لگی۔ اُس کا لہجہ قدرے شوخ تھا۔ "انہیں تو صرف جانوروں کی طرح صرف بھوک کی ہوک اُٹھتی ہے۔ وہ ایک ہی جذبہ رکھتے ہیں اور اس کے حصول کے لئے انتہا پسند ہو جاتے ہیں اور جذبات کے اندھے جنون میں کچھ بھی کر گزرتے ہیں۔"

اُس کی آنکھوں میں ایک مخصوص قسم کی چمک اُبھری۔ پھر اُس کی جگہ خود سپردگی نے لے لی۔ پھر اُس کے بھرے بھرے سرخ ہونٹوں پر شرارت بھری مسکراہٹ چٹکنے لگی۔ اُس نے اپنی جگہ سے اُٹھ کر نائٹ بلب کا سوئچ آف کر دیا۔ پھر وہ کرٹس کے قریب جا کر کھڑی ہو گئی اور اُس کے گلے میں بانہیں حمائل کر کے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ کرٹس نے وارفتگی سے اُسے اپنی آغوش میں لے لیا۔

پھر وہ دونوں حیوان بن گئے اور غلاظت کے دلدل میں پھسل پڑے۔ میں نے دیوار کی طرف کروٹ لے لی۔ گو کہ کوپے میں اندھیرا چھا گیا تھا لیکن ہیولے واضح تھے۔ مجھے اُن کے اُس کھیل، بے حجابی، بے حیائی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی نہ میں محظوظ ہونا چاہتا تھا۔ اُنہیں اس بات کا ذرہ برابر بھی احساس نہیں تھا کہ میری آنکھ کسی بھی لمحے کسی وجہ سے کھل سکتی ہے۔ چونکہ مغربی تہذیب اور معاشرے میں سب کچھ جائز تھا۔ اُن میں اور حیوانوں میں کوئی فرق نہیں تھا اس لئے وہ ان باتوں کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ پھر میری نظروں نے

بغاوت نہیں کی۔ اگر روشنی ہوتی تو شاید میں اپنی نظروں پر قابو نہیں پاتا۔ میں اُن دونوں کے بارے میں سوچنے لگا۔ میرے تصور میں ایک فلم سی چلنے لگی......

ایمی نے جب جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا تو اُسے احساس ہوا کہ اُس کی زندگی کسی جہنم سے کم نہیں ہے۔ جب وہ دس برس کی تھی تب اُس کی زندگی میں ایک طوفان آیا تھا جس نے گھریلو زندگی کو ایک مفتوحہ بستی کی طرح تاخت و تاراج کر کے رکھ دیا تھا۔

اُس کا باپ چارلس ہر شام اُسے پارک لے کر آتا تھا۔ پارک میں بڑی رونق، گہما گہمی اور چہل پہل ہوتی تھی۔ وہ خود ایک تتلی کی طرح تھی اور پارک میں تتلیوں کو پکڑنے کے لئے بھاگتی تھی۔ چارلس اپنی بیٹی کو اِدھر اُدھر بھاگتے ہوئے دیکھتا۔ اُسے ایسا لگتا کہ پارک میں ان دونوں کے سوا کوئی نہیں ہے۔ جبکہ پارک میں بہت سارے ہر عمر کے بچے اپنی ماؤں، آیاؤں اور بڑی بہنوں کے ساتھ آتے تھے۔ پھر وہ عورتیں ایک قطعہ کی گھاس پر بیٹھ جاتی تھیں، بچوں کو کھیلتا چھوڑ کر، اس سے بے نیاز ہو کر وہ تازہ افواہوں، سکینڈلز، فیشن اور ملبوسات کے بارے میں گفتگو کرتی رہتی تھیں۔ جوان جوڑے بھی آتے اور کسی ایسے گوشے میں چلے جاتے جہاں وہ ایک دوسرے کی سپردگی سے فائدہ اُٹھا سکیں۔ بوڑھے مرد بھی اخبار یا ناول لا کر ایک خالی بنچ پر بیٹھ جاتے یا ماضی کے دُھندلکوں میں کھو جاتے۔

ایک روز حسب معمول وہ اپنی بیٹی ایمی کو لے کر پارک آیا تھا۔ سورج غروب ہونے میں چند لمحوں کی دیر تھی لیکن ایسا لگ رہا تھا کہ وہ غروب ہو چکا ہے۔ پارک میں دُھندلکا تیزی سے پھیل رہا تھا۔ اسی لمحے ایک بہت ہی خوبصورت تتلی پکڑے ایمی اُس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ چارلس نے اپنی بیٹی کو محبت بھری نظروں سے دیکھا اور اُس کے خوبصورت اور پیارے پیارے ہاتھوں کو چوم لیا۔

اُس کی بنچ کے پاس سے گزرتی ہوئی دو عورتیں آپس میں باتیں کرتی جا رہی تھیں۔ ایک عورت کہہ رہی تھی۔ "آج دس منٹ دیر ہو گئی۔ جارج ٹھیک سوا سات بجے گھر پہنچ جاتا ہے۔ اُسے کھانا ملنے میں پانچ منٹ دیر ہو جائے تو میری پٹائی کر دیتا ہے۔"

"یہ شوہر کس قدر ظالم اور تشدد پسند ہوتے ہیں۔ انہیں ہم پر بالکل بھی رحم نہیں آتا۔" دوسری عورت نے کہا۔

چارلس نے لمحے کے لئے سوچا کہ وہ اس عورت سے کہے کہ ایسی بات نہیں ہے۔ شوہر

دنیا کی سب سے مظلوم ترین ہستی ہے۔ پھر یکلخت اُس کی نظریں گرجا گھر کے گھڑیال کی طرف اُٹھ گئیں۔ وہ اُس کی سوئیوں کو دیکھتے ہی چونک پڑا۔ ساڑھے چھ بجے اُسے گھر پہنچنا تھا اور اب چھ بج کر پینتیس منٹ ہو چکے تھے۔ پانچ منٹ کی تاخیر اُس کے لئے کسی عذاب جان سے کم نہیں تھی۔ کیونکہ اُس کی بیوی ایک بدمزاج اور غصے کی تیز عورت تھی۔

اگلے لمحے وہ ایمی کا ہاتھ پکڑ کے اُسے تیز تیز قدموں سے لے کر چلنے لگا۔ ایمی اُس کی رفتار کا ساتھ نہیں دے پا رہی تھی۔ پھر وہ آگے جا کر رُک گیا۔ اُس کا سانس پھولنے لگا اور جسم پسینے میں شرابور ہو رہا تھا۔ اُسے اس لئے بھی جلد گھر پہنچنا تھا کہ اُس کی بیوی نے جاتے ہوئے اُس سے کہا تھا کہ وہ ٹھیک ساڑھے چھ بجے گھر پہنچ جائے گی۔

اس وقت ایمی کے باپ چارلس کی عمر پینتالیس برس کی تھی۔ اُس کا جسم فربہی مائل تھا لیکن وہ ایک چاق و چوبند اور پھرتیلا شخص تھا۔ بے حد اسمارٹ بھی تھا۔ اُس کے بالوں میں سفید بال چاندی کے تاروں کی طرح جھلملانے لگے تھے۔ وہ دیکھنے میں ایک عام قسم کا شخص دکھائی دیتا تھا۔ وہ عورتوں کے لئے کوئی کشش نہیں رکھتا تھا۔ اُسے باپ کے ورثہ میں معقول جائیداد ملی تھی۔ جائیداد سے جو آمدن تھی اُس کے لئے اس لئے اطمینان بخش تھی کہ وہ متوسط طبقے سے تعلق رکھتا تھا اس لئے اُس نے کہیں ملازمت نہیں کی تھی۔ ایک طرح سے اُس نے اپنی بیٹی کی پرورش کی تھی۔ وہ اپنا وقت گھر پر بیٹی سے کھیلنے اور اُسے پڑھانے میں گزارتا تھا۔

اُسے اپنی بیٹی سے بہت زیادہ پیار تھا۔ وہ اُس کے لئے جگر کا ٹکڑا تھی۔ ایلن سے اُس کی شادی کو گیارہ برس بیت چکے تھے۔ ایلن ایک بہت ہی حسین اور پُر شباب گداز بدن کی عورت تھی۔ اُس کی عمر تیس برس تھی لیکن وہ بیس برس کی دکھائی دیتی تھی۔ وہ اُس سے پندرہ برس چھوٹی تھی۔ اُسے پندار حسن تھا، اس وجہ سے وہ اپنے شوہر سے ناروا قسم کا سلوک کرتی تھی۔ جب وہ اُس کی طلب محسوس کرتا تو انکار یا بہانہ نہیں کرتی تھی لیکن اس طرح سرد مہری سے پیش آتی جیسے چارلس اُس کا شوہر نہیں بلکہ کوئی درندہ ہے جو اُس کی عزت کے درپے ہے۔ اور پھر اُس کے ہر کام میں کیڑے نکالتی تھی۔ بات بات پر طعنہ زنی اور سرزنش کرنا اُس نے اپنا وطیرہ بنا لیا تھا۔ اُسے سب سے زیادہ غصہ اس بات پر تھا کہ وہ سارا دن گھر پر کیوں بیکار پڑا رہتا ہے؟ جبکہ اُس کا یہ کہنا تھا کہ اس نے دس برس زندگی

بڑی کٹھن اور دُشوار گزاری ہے اس لئے اب وہ آرام کرنا چاہتا ہے۔ اور پھر جب اُسے اس قدر فراغت ہے تو اسے کچھ کرنے دھرنے کی کیا ضرورت ہے؟

اُس نے اپنی بیوی کی درشت بولی اور ترش خوئی سے تنگ آ کر سوچا تھا کہ ایلن سے علیحدگی اختیار کر لے۔ لیکن ایک تو وہ ایمی کی وجہ سے ایلن کو طلاق دینا نہیں چاہتا تھا۔ دوسری بات یہ تھی کہ وہ ایلن کو اس لئے بہت چاہتا تھا کہ وہ ایک پُر شباب، گداز بدن کی تھی۔ ایک نوجوان لڑکی دکھائی دیتی تھی۔ رات جب وہ ایلن کو دیکھتا تو اُس کا خوبصورت بدن چارلس کو متزلزل کر دیتا۔ وہ اُسے طلاق دینے کا خیال دل سے نکال دیتا۔ گو کہ اُس کی بیوی اپنے آپ کو ایک سرد لاش کی طرح اُس کے حوالے کر دیتی تھی، پھر بھی وہ اُس سے خوش اور مطمئن تھا کہ ایلن نے اُسے کبھی جھڑکا یا کسی بات سے انکار نہیں کیا تھا۔

عمارت کے صدر دروازے پر رُک کر چارلس نے اپنی پھولی ہوئی سانسوں پر قابو پایا۔ پھر اُس نے اپنا پسینہ خشک کیا، پھر اُس نے ایمی کی طرف دیکھا۔ تیز چلنے کے باعث اُسے بھی پسینہ آ گیا تھا۔ اُس نے ایمی کے چہرے سے بھی پسینہ پونچھا، پھر وہ دوسری منزل کی طرف بڑھا۔ دوسری منزل پر اُس کا اپنا اپارٹمنٹ تھا۔ یہ عمارت اُسے ورثے میں ملی تھی۔ ماں کی طرف سے ایک بوڑھی ملازمہ روزی ملی تھی جو خاندانی یا جدی ملازموں کی قسم سے تعلق رکھتی تھی۔ وہ چارلس کی پیدائش سے پہلے اُس کی آنجہانی ماں کی ذاتی خادمہ تھی۔ اُسی کی گود میں چارلس نے پرورش پائی تھی۔ روزی نے اُسے ایک خادمہ کی طرح نہیں بلکہ ماں بن کر پالا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ پینتالیس سال کی عمر، ایک حسین بیوی کا شوہر اور ایک بچی کا باپ ہونے کے باوجود روزی اُسے آج بھی ایک بچے کی طرح سمجھتی تھی۔ آج بھی اُس کی صحت قابل رشک تھی۔ وہ بڑی مستعد عورت تھی۔

اُس نے اطلاعی گھنٹی بجائی تو روزی نے دروازہ کھولا۔

چارلس نے اُس سے سرگوشی میں آہستگی سے پوچھا۔ ”کیا ایلن آ گئی ہے؟ وہ کہاں ہے؟“

روزی معنی خیز انداز میں مسکرائی۔ ”کیا کبھی مادام ساڑھے چھ بجے گھر آئی ہیں جو آج آ جائیں گی؟“

”یہ تو بہت اچھا ہوا“ وہ جھینپی سی ہنسی ہنسا۔ ”اُس کے آنے سے پہلے میں نہا دھو کر تیار ہو سکتا ہوں۔ کیوں؟“

روزی نے اُسے ہمدردی اور کسی قدر تحقیر آمیز نظروں سے دیکھا۔ ''تم ٹھیک کہتے ہو۔ تمہارا نہانا اس لئے بھی ضروری ہے کہ تم پسینے میں نہا رہے ہو...... شاید اس لئے پسینہ پسینہ ہو رہے ہو کہ تم اس ڈر سے بھاگے ہوئے آئے ہو کہ کہیں تمہیں دیر نہ ہو جائے۔ تم نے خواہ مخواہ اس قدر تیزی دکھائی۔ لیکن افسوس ہے کہ مادام کی واپسی کا ایک ڈیڑھ گھنٹے تک انتظار کرنا پڑے گا اور کھانا بھی اُسی وقت ملے گا کیونکہ مجبوری ہے...... بھاپ میں دم کیا ہوا مرغ ٹھنڈا ہو کر اچھا نہیں لگتا۔''

''کوئی بات نہیں۔'' چارلس نے جلدی سے کہا۔ ''میں ذرا نہا لوں۔ تم ایمی کا خیال کرو۔ اس کے کپڑے بدل دو! بہت میلے ہو گئے ہیں۔''

چارلس نے اپنی خواب گاہ میں داخل ہو کر اُس کا دروازہ مقفل کیا۔ یہ اس کی ایک طرح سے پناہ گاہ تھی۔ اپنی مخصوص جگہ بیٹھ کر وہ ستانے لگا۔ اب وہ روزی کے طنز اور بیوی کے تکبر کا عادی ہو گیا تھا۔ لیکن ایک بات نے اُسے کئی ماہ سے پریشان کیا ہوا تھا۔ وہ روزی کا چہرہ اور اُس کی آنکھیں...... صاف ظاہر ہوتا ہے کہ روزی اُس کی بیوی اور اُس کے عزیز دوست آرتھر کو پسند نہیں کرتی۔ لیکن کیوں اور کس لئے......؟ اُسے اس بات کا خوف و خدشہ تھا کہ روزی کی یہ ناپسندیدگی بلکہ نفرت کسی دن ضرور کوئی گل کھلائے گی...... کہیں وہ اُس کا گھر نہ برباد کر دے۔ ایلین سے اُس کی نفرت چھپی نہیں رہی تھی بلکہ سب پر عیاں ہو رہی تھی۔ کیونکہ اس کا اظہار کسی نہ کسی موقع پر روزی کے بشرے سے ظاہر ہو جاتا تھا۔ بسا اوقات اُسے ادب آداب کا لحاظ بھی نہ رہتا۔

ایک روز تنگ آ کر ایلین کو کہنا پڑا کہ اگر روزی نے اپنا رویہ نہ بدلا تو وہ اس بڑھیا کو لات مار کر گھر سے نکال باہر کرے گی۔ کبھی کبھی یہ جان کر چارلس کو حیرت ہوتی تھی کہ ایلین جیسی بے خوف اور بے باک عورت اس بوڑھی خادمہ سے دب کر رہتی ہے۔ اُس نے ایلین کا یہ رویہ مروت پر محمول کیا تھا کہ بہرحال اُسے معلوم ہے کہ روزی ہی نے اس کے شوہر کو پالا پوسا ہے۔ لیکن اب کچھ دنوں سے معاملات حد سے تجاوز کر رہے تھے۔ اگر یہی صورت حال رہی تو آگے اچھا نہیں ہوگا۔ کسی دن کوئی زبردست ہنگامہ کھڑا ہو جائے گا۔ گھر میں کوئی اُلجھن، انتشار پیدا ہونے کا اندیشہ اُسے مایوس کر دیتا تھا۔ اُسے گھبراہٹ ہونے لگتی تھی کہ کچھ نہ کچھ ہونے والا ہے۔ کیا اس ضمن میں اُسے اپنے سب سے عزیز

دوست آرتھر سے مشورہ کرنا چاہئے؟ مگر روزی اس سے بھی تو سخت نفرت کرتی ہے اور اس بات کا احساس آرتھر کو بھی ہے۔ اُسے یہ خدشہ لاحق تھا کہ کہیں آرتھر روزی کو ملازمت سے نکال دینے کا مشورہ نہ دے بیٹھے۔ اس میں آرتھر کی کسی بھی رائے کو مسترد کر دینے کا ذرہ برابر بھی حوصلہ نہیں تھا۔ آرتھر شادی سے پہلے بھی اُس کا واحد دوست تھا اور آج بھی تھا۔ وہ ہر وقت اُس کی طرف داری پر کمربستہ رہتا۔ صرف اس پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ اس کی بیوی ایلین کے کسی سخت رویئے پر اکثر ایلین سے برہمی کا اظہار کرنے میں پس و پیش نہیں کرتا۔ ایلین کی چیرہ دستیوں کے خلاف وہ اُس کی سپر تھا۔ ایک ہمدرد، مخلص اور غمگسار دوست۔

دیوار گیر گھڑیال نے سات بجنے کی اطلاع دی۔ چارلس گھبرا کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ صرف تھوڑی دیر ستانے کے لئے بیٹھا تھا مگر وہ سوچوں میں ایسا گم ہوا تھا کہ اُسے وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہو سکا تھا۔ وہ تیزی سے ملحقہ غسل خانے میں گھس گیا۔ پندرہ منٹ کے بعد وہ نیا لباس پہن کر نشست گاہ میں داخل ہوا تو بہت مطمئن نظر آ رہا تھا، کیونکہ ایلین ابھی تک نہیں آئی تھی۔ ٹھیک اسی وقت ایمی کمرے میں داخل ہوئی تو اُس نے ایمی کو گود میں اس طرح اُٹھا لیا جیسے وہ دو برس کی بچی ہو۔ پھر ذرا سا اُچھالا، تو ایمی نے مسرت سے بھرا قہقہہ لگایا۔ ایمی کو خوش دیکھ کر چارلس کا سینہ بھی مسرت سے بھر جاتا تھا۔ ایمی اُس کے اس طرح اُچھالنے پر بہت خوش ہو گئی تھی۔ پھر وہ اُسے کندھوں پر بٹھا کر گھوڑے کی طرح قالین پر تیزی سے اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا۔

کچھ دیر کے بعد چارلس نے ایمی کو کندھے سے اُتارا، پھر اُس نے دیوار گیر گھڑیال کی طرف دیکھا۔ پھر اُس نے بلند آواز میں کہا۔ ''اب تو ساڑھے سات بج چکے ہیں۔ مجھے زور کی بھوک لگ رہی ہے۔''

''کھانا بالکل تیار ہے......''

اُس نے روزی کے لہجے سے اُٹھتے ہوئے غبار کی شدت محسوس کر لی۔ ''روزی! تم نے تو کہا تھا کہ کھانا آٹھ بجے تک تیار ہوگا......'' چارلس نے بڑی سادگی سے کہا۔ وہ کسی بھی ممکنہ ناگوار صورتحال کا رُخ موڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''کیا کہا...... آٹھ بجے...... تو کیا ایمی آٹھ بجے تک بھوکی رہے گی؟ تم اس کا معدہ تباہ کرنا چاہتے ہو......؟ فرض کرو کہ ایمی کی دیکھ بھال صرف ماں کے ذمے ہوتی تو اس بچی کا

کیا حال ہوتا؟ اس جیسی ماں شاید ہی دنیا میں کوئی اور ہو..... سنو! میں کہتی ہوں کہ......"

"بس کرو روزی!......" چارلس نے زندگی میں پہلی بار اُسے سخت لہجے میں مخاطب کیا۔ اس کی دانست میں اب یہ ترشی ناگزیر ہوگئی تھی۔ "مجھے ایلن کے خلاف اس قسم کی باتیں بالکل بھی پسند نہیں ہیں۔ بہتر ہوگا کہ آئندہ تم اس بات کا خیال رکھو!"

بوڑھی روزی ایک دم سے سناٹے میں آ گئی۔ اُس کی زبان گنگ ہوگئی۔ وہ چند لمحوں تک چارلس کو خالی خالی نظروں سے دیکھتی رہی، پھر اُس کے قدم لڑکھڑا گئے جیسے ایک دم سے بے جان ہو گئے ہوں۔ قریب رکھی ہوئی کرسی کا سہارا لے کر وہ اُس پر بیٹھ گئی۔ پھر خاموشی سے وہ قالین کے نقش و نگار کو گھورنے لگی۔ روزی کا یہ ردِعمل چارلس کے لئے قطعی غیر متوقع تھا۔ ایک انجانے خوف نے اُسے مضطرب کر دیا۔ لڑائی جھگڑے، چیخ و پکار اور گالم گلوچ کا تصور تک اُس کے لئے انتہائی نازیبا تھا۔ اُس کا تالو خشک ہونے لگا۔ وہ بھی چپ چاپ قریبی کرسی پر بیٹھ گیا۔ ایمی گنگ سی ہوکر باری باری اُن کی شکلیں دیکھنے لگی۔

تھوڑی دیر کے بعد روزی نے اپنا چہرہ اُوپر اُٹھایا اور براہِ راست چارلس کی آنکھوں میں جھانکا۔ وہ بالکل پرسکون نظر آ رہی تھی جیسے کوئی بہت بڑا فیصلہ کر چکی ہو اور اُسے ایک جج کے انداز میں سنانا چاہتی ہو۔

"چارلس!......" روزی نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میں نے مرتے دم تک تمہاری ماں کی خدمت کی۔ پھر تمہاری پرورش سے لے کر اب تک تمہاری نگرانی کر رہی ہوں۔ میں نے کبھی کوئی غفلت، بے پروائی اور امکان بھر کبھی کوئی کوتاہی نہیں کی۔ اس طویل رفاقت کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ مجھے تم سے اور تمہارے خاندان سے ہمیشہ ایک تعلق خاطر ہے۔ محبت ہے...... کیوں چارلس! کیا میں ٹھیک ہوں؟ اس میں کوئی مبالغہ ہے کیا؟"

چارلس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ روزی کے تیور بتا رہے تھے کہ اُس نے جیسے کوئی عزم کر لیا ہو۔ روزی کی سوالیہ نظریں اپنے چہرے پر مرکوز پا کر چارلس نے فوراً ہی اپنا سر ہلایا۔ "تم جو کچھ کہہ رہی ہو وہ سچ ہے۔ بھلا اس میں کیا مبالغہ ہوسکتا ہے؟"

"تم یہ بات بھی بہت اچھی طرح جانتے ہو کہ میں نے اس خاندان کی خدمت کبھی ایک ملازمہ کی حیثیت سے نہیں کی اور کبھی اس خاندان کا برا نہیں چاہا۔ میں نے کبھی پیسوں کے لالچ میں کوئی کام نہیں کیا...... میں نے جو کچھ بھی کیا صرف تمہاری محبت میں کیا۔

صرف اور صرف تمہاری محبت میں کیا۔ میں نے کبھی تمہیں دھوکہ نہیں دیا۔ کبھی تم سے جھوٹ نہیں بولا۔ اور ہاں.. شاید تمہیں کبھی مجھ سے کوئی شکایت بھی نہیں ہوئی..... ان میں سے کوئی بات غلط ہو تو بتاؤ!"

"نہیں..... تم بالکل سچ بیان کر رہی ہو پیاری روزی!......" چارلس نے سر ہلایا۔

"لیکن اب معاملات میری برداشت سے باہر ہو چکے ہیں چارلس!...... میں اب خاموش نہیں رہ سکتی۔ اب تک میں اس لئے چپ تھی کہ یہ سب کچھ بتا کر تمہیں دُکھ دینا نہیں چاہتی تھی۔ کیونکہ تم ایلن سے بہت محبت کرتے ہو اور تم ایک سیدھے سادھے اور بے حد معصوم سے شخص ہو۔ تمہیں کوئی اندازہ نہیں ہے کہ محلے کا ہر فرد اس معاملے سے پوری طرح واقف ہے اور سب پیٹھ پیچھے تمہارا مذاق اُڑاتے ہیں۔ تم نے اس بات پر شاید کبھی سنجیدگی سے غور نہیں کیا۔ لیکن مجھے معلوم ہے کہ ایلن راتوں کو دیر سے کیوں آتی ہے؟ کیا تم اس بات کو سننا پسند کرو گے؟ سنو..... اس لئے کہ وہ تم سے بے وفائی کر رہی ہے۔"

چارلس کے اعصاب پر بجلی سی آ گری۔ وہ چند لمحے تک سکتے کی سی حالت میں روزی کو تکتا رہا، پھر اُس نے ہذیانی لہجے میں کہا۔ "روزی...... اب ایک لفظ بھی اس ضمن میں کچھ نہیں کہنا۔ میں مزید کچھ سننا پسند نہیں کروں گا۔"

"تمہیں پوری بات سننی پڑے گی۔" روزی کے سکون میں کوئی فرق نہیں آیا۔ "میں نے ایک دو بار نہیں، متعدد بار ایلن کو تمہارے عزیز دوست آرتھر کے گلے میں بانہیں ڈالے اُس کے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ ثبت کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ اپنی ان آنکھوں سے اور اسی کمرے میں...... اگر تمہارا یہ پیارا دوست تمہاری طرح دولت مند ہوتا تو یہ بات لکھ کر رکھ لو کہ ایلن تم سے کبھی شادی نہ کرتی۔ ذرا ٹھنڈے دل سے وہ پس منظر یاد کرو...... اگر تم غور کرو کہ ایلن سے تمہاری شادی کس طرح ہوئی تھی تو سب کچھ سمجھ جاؤ گے۔"

چارلس اس طرح اُچھل کر کھڑا ہو گیا جیسے اُسے زہریلا ڈنک لگا ہو۔ اُس کا چہرہ ہلدی کی طرح پیلا پڑ گیا۔ "یہ تم کیا کہہ رہی ہو روزی! تم......" چارلس نے چیخ کر کہا۔ "خاموش ہو جاؤ خدا کے لئے...... ایسی دل آزاری کی باتیں مت کرو۔"

"تمہیں سب کچھ سننا ہوگا چارلس! یہ کڑوی گولیاں تمہیں نگلنا ہوں گی۔ میں یہ سب کچھ اس لئے سنا رہی ہوں کہ یہ میرا فرض ہے۔ میں ہر قیمت پر فرض ادا کر کے رہوں گی۔

میں تمہیں ساری باتیں ایک ایک کر کے بتاتی ہوں۔ ایلن نے تم سے اس لئے شادی کی کہ تمہارے پاس ایک بڑی جائیداد تھی اور آمدن کے مستقل ذرائع تھے۔ اُسے تم سے اور تمہاری ذات سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ اُس نے تم سے شادی محض اپنے عیش و آرام اور آسائشوں کے لئے کی تھی۔ ورنہ وہ شادی سے پہلے ہی کسی کی ہو چکی تھی اور شادی کے پہلے ہی دن سے تمہارے ساتھ بے وفائی کر رہی ہے۔ اُس نے اپنی مرضی کی زندگی گزارنے، تمہاری دولت سے عیش کرنے اور اپنے عاشق کے ساتھ رنگ رلیاں منانے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ اُس بے لگام نے تمہاری زندگی میں تلخیاں بھر کے اسے جہنم بنانے کا کام بھی خوب کیا۔ ایسی ذلیل کتیا کسی نے اپنی زندگی میں کبھی دیکھی نہ ہوگی۔''

چارلس اپنی مٹھیاں بھینچے کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ ''تم پاگل ہو گئی ہو روزی!...... تمہارا دماغ چل گیا ہے۔ خدا کے لئے چپ ہو جاؤ...... کیا تم اپنی ہرزہ سرائی بند نہیں کر سکتی ہو؟ مزید ایک لفظ نہیں کہنا۔''

چارلس مسلسل انہی فقروں سے تصادم کر رہا تھا۔ ایمی کے لئے یہ سب کچھ غیر متوقع اور نئی باتیں تھیں۔ ایسی بات نہ تھی کہ وہ ان باتوں کو نہ سمجھے۔ وہ خوفزدہ ہو کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ایمی کو روتا دیکھ کر وہ جھلا گیا۔ اور پھر سب کچھ اُس کی برداشت سے باہر ہو گیا۔ وہ مجنونانہ انداز میں پیچ و تاب کھاتا ہوا روزی کی طرف بڑھا۔

''کیا تم مجھے مارنا چاہتے ہو......؟ تمہارے دل میں مجھے مارنے کا ارمان ہے تو اسے پورا کر لو! تم نے مجھے ہمیشہ ماں کا درجہ دیا ہے اور میں نے تمہیں بیٹے کا...... لیکن مجھے میری حیثیت کا احساس دلانے سے کیا تمہاری بیوی تم سے بے وفائی کرنا چھوڑ دے گی؟ یا پھر حقیقت بدل جائے گی کہ...... ایمی تمہاری بیٹی نہیں ہے......!''

روزی کے یہ الفاظ اُس کے وجود پر قیامت بن کر ٹوٹے۔ اُس کے جسم میں خون ایک دم سے منجمد ہو گیا۔ روزی پر اُٹھا ہوا ہاتھ نیچے گر گیا۔ وہ مجسمے کی طرح بے حس و حرکت ہو کر کچھ نہ سمجھنے والی نظروں سے روزی کو دیکھنے لگا۔

حیران ہونے کی ضرورت نہیں ہے چارلس! ذرا اپنی بیٹی کو گہری نظروں سے دیکھو...... اس کی آنکھیں اور پیشانی! کیا تمہیں یہ بچی اپنے عزیز از جان دوست کا عکس نہیں لگ رہی ہے؟ یہ حقیقت تو شاید ایک اندھا بھی ٹٹول کر محسوس کر لے۔''

چارلس نے آگے بڑھ کر بوڑھی روزی کے دونوں کندھے پکڑ لئے اور انہیں پاگلوں کی طرح جھنجھوڑنے لگا۔ ''نکل جا یہاں سے...... میری نظروں سے سامنے سے دفع ہو جا...... میں تجھے قتل کر دوں گا۔ چلی جا...... نکل جا یہاں سے......''

اتنا کہہ کر چارلس نے بوڑھی روزی کو زور سے دوسرے کمرے کی طرف دھکیلا۔ روزی اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکی۔ وہ لڑکھڑاتی ہوئی میز سے جا ٹکرائی۔ میز پر رکھے ہوئے کھانے کے برتن اور گلاس وغیرہ لڑھک کر فرش پر گر گئے۔ چند ٹکرا کے میز پر ہی ٹوٹ گئے۔ روزی میز کا کنارہ پکڑ کے سنبھل گئی اور اُلٹے قدموں پیچھے ہٹنے لگی۔ ''چارلس! اگر یہ تماشہ تم خود اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتے ہو تو کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی۔ آتے ہی کھانے کے بعد باہر ٹہلنے کے لئے چلے جانا۔ لیکن کہیں دُور جانے کی بجائے فوراً واپس آ جانا...... پھر خود ہی نظارہ کر لینا کہ روزی تم سے کس قدر جھوٹ بول رہی ہے۔''

وہ بڑبڑاتی ہوئی کمرے سے نکلی اور چارلس کو طیش میں اپنی طرف آتا دیکھ کر جلدی سے باورچی خانے میں گھس گئی۔ اور دروازہ بند کر کے اندر سے مقفل کر لیا۔

''تم ابھی اور اسی وقت...... اسی وقت میرے گھر سے نکل جاؤ!'' چارلس نے ہذیانی لہجے میں چیخ کر کہا۔

''ہاں...... میں جا رہی ہوں۔ میں آدھے گھنٹے میں ہمیشہ کے لئے اس گھر سے چلی جاؤں گی۔'' روزی نے اندر سے جواب دیا۔

چارلس کسی بینا نابینا کی طرح دیوار سے آشنائی کے سہارے آہستہ آہستہ پھر ایک بار نشست گاہ میں آ گیا۔ ایمی قالین پر بیٹھی رو رہی تھی۔ چارلس اس پر توجہ دیئے بغیر دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔ پھر وہ ویران نظروں سے ایمی کو گھورنے لگا۔ ایمی کی سسکیاں اُسے جیسے سنائی نہیں دے رہی تھیں۔ اُس کے حواس معطل تھے اور دماغ نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ اُسے نہ کچھ سنائی دے رہا تھا نہ دکھائی دے رہا تھا۔ اُس کی حالت پاگلوں جیسی ہو رہی تھی۔ چند لمحوں کے لئے اُسے وہ باتیں بھی یاد نہیں رہیں جو روزی نے کہی تھیں۔ تاہم آہستہ آہستہ کچھ دیر بعد اُس کے ہوش و حواس بحال ہونے شروع ہوئے۔

روزی کا لب و لہجہ اور اُس کی زبان سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ یقین و اعتماد سے پُر تھا۔ اُس کے خلوص اور دیانت میں بھی کوئی کلام نہیں تھا۔ اس کے باوجود چارلس اُس کے الزامات

تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں تھا۔ بے شک روزی نے اُسے ایک سگی ماں کی طرح پالا تھا لیکن وہ اُس کی حسین و جمیل بیوی ایلین سے نفرت کرتی تھی۔ اس لئے یہ امکان بھی موجود تھا کہ اس کے الزامات سچائی سے زیادہ تصورات پر مبنی ہوں۔ ہوسکتا ہے روزی کی بوڑھی آنکھوں نے جو کچھ دیکھا ہے اس کے ازکار رفتہ ذہن نے اس سے کوئی اور نتیجہ اخذ کیا ہو......؟

چارلس کے ذہن میں بڑی کشمکش جاری تھی۔ اُسے بے شمار چھوٹی چھوٹی باتیں یاد آنے لگیں۔ پہلے اُس نے سامنے کی چیزوں کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی اور کوئی رمز و کنایہ سمجھنے سے قاصر رہا تھا۔ ایلین کے بے معنی فقرے، اُس کے دوست آرتھر کی پہلو دار نظریں اور دونوں کا بیک وقت غائب رہنا۔ بس اوقات تو ان کے درمیان ایسے مہمل اشاروں کا تبادلہ بھی ہوتا تھا جنہیں وہ کبھی سمجھ نہیں سکا تھا۔ اُس کا ذہن تیزی سے ماضی کریدنے لگا اور راکھ سے اُڑنے والی چنگاریاں اُس کی رُوح کو ڈسنے لگیں۔ گیارہ برس پہلے اُس کی ایلین سے منگنی ہوئی تھی۔ اُس وقت سے اب تک کا لمحہ لمحہ وہ زہر میں بجھے ہوئے فقرے اور موہوم اشارے یہ سب اُس کے ذہن کے تمام گوشوں میں نیولوں کی طرح کلبلانے لگے۔

روزی نجانے کب کی چلی گئی تھی۔ ایمی تھک کر چپ ہوگئی تھی۔ کچھ دیر کے بعد وہ خاموشی سے اُٹھ کر باپ کی کرسی کے برابر والی کرسی پر آ کر بیٹھ گئی۔ چارلس نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر قریب کیا، پھر سینے سے لگا کر پیار کرنے لگا۔ ”میری جان!...... میری ایمی!...... میری بیٹی۔!“ پھر اچانک اُسے روزی کی بات یاد آ گئی۔ اُس نے کہا تھا...... ایمی اس کی بیٹی نہیں ہے۔ یہ اس کے دوست آرتھر کا جرم ہے۔ مگر یہ کیسے ہوسکتا ہے......؟ ممکن ہے روزی کی دوسری باتوں میں سچائی ہو...... لیکن ایمی تو محض میری...... میری بچی ہے۔ میں ہی اس کا باپ ہوں۔ پھر اُس نے ایمی کو زور سے بھینچا۔ زندگی کی حرارت اُسے لباس کے پرتوں سے چھنتی ہوئی اپنے سینے میں اُترتی محسوس ہوئی۔ اُس کا دل محبت اور مسرت سے بھر گیا۔

اطلاعی گھنٹی کی آواز سنتے ہی وہ ایک دم بوکھلا سا گیا۔ اُس نے ایمی کو جلدی سے کرسی پر بٹھا دیا۔ پھر وہ بے یقینی کی سی کیفیت میں مبتلا ہو گیا۔ ایلین آ گئی ہے...... اب اسے کیا کرنا چاہئے؟ اُس نے خود کلامی کی...... دوبارہ گھنٹی بجنے کے بعد اُس کے قدم خود بخود دروازے کی طرف بڑھنے لگے۔ روزی نے غالباً ایلین کی ملازمہ کو اپنے جانے کی اطلاع نہیں دی تھی۔ وہ اُوپر والے کمرے میں رہتی تھی۔ اس لئے اُس نے سوچا کہ اب اُسے خود

ہی دروازہ کھولنا پڑے گا۔ کیا کرنا چاہئے؟ اتنا کچھ علم میں آ جانے کے بعد ضروری ہو گیا تھا کہ وہ حقیقت جاننے کی کوشش کرے۔ اُسے معلوم ہونا چاہئے کہ سچ کیا ہے، جھوٹ کیا ہے؟ یہ اس کا حق ہے۔ آخر وہ ایلین کا شوہر اور ایمی کا باپ ہے...... چارلس نے اپنے غصے کی آگ کو سرد کرتے ہوئے فیصلہ کیا، اُسے سچ جاننے میں کوئی دیر نہیں کرنی چاہئے۔ ورنہ اس کا دماغ پھٹ جائے گا۔

دروازے کی طرف جاتے ہوئے اُس کی ٹانگیں کپکپا رہی تھیں۔ کیا وہ ایلین سے خوفزدہ ہے؟ کیونکہ یہ سب کچھ کردار کشی اور بہتان طرازی ہے۔ اس لئے وہ ایلین کا سامنا کرتے ہوئے ڈر رہا تھا یا پھر اس میں سچ سننے کا حوصلہ نہیں ہے؟ دروازے کے قریب پہنچ کر کچھ سننے کی کوشش کرنے لگا۔ اُسے خود علم نہیں تھا کہ آخر وہ کیا سننے کی توقع رکھتا ہے؟ لیکن اُسے اپنے دل کی تیز دھڑکن کے سوا کچھ سنائی نہیں دیا۔

دروازے کے اُوپر لگی ہوئی گھنٹی زور سے بجنے پر وہ اُچھل پڑا۔ اُس نے چابی گھما کر دروازہ کھولا اور ایلین کو اپنے عزیز دوست آرتھر کے ساتھ کھڑا پایا۔ گویا اُس کی بیوی آرتھر کے ہمراہ آئی تھی۔

شوہر کو سامنے دیکھ کر ایلین بڑی حیران ہوئی۔ پھر اُس نے قدرے جھلا کر بلند آواز سے کہا۔ ”اب دروازہ بھی تمہی کھولو گے......؟ روزی کہاں مرگئی......؟ کیا وہ بہری ہوگئی ہے؟“

ایلین کے درشت تیور سے چارلس کے حلق میں گرہیں پڑ گئیں اور اُس کی سانسوں کی آمدورفت تیز ہوگئی۔ اُس نے جواب دینے کی کوشش کی لیکن اُس کی آواز حلق میں پھنس کر رہ گئی۔

”کیا تم اُونچا سننے لگے ہو......؟ میں پوچھتی ہوں کہ روزی کہاں ہے؟ کہاں ہے وہ بڑھیا کھوسٹ......؟“

”کون، روزی......؟ وہ تو یہاں سے چلی گئی......“ اُس نے بہ دقت تمام کہا۔

”کیا مطلب ہے تمہارا......؟ چلی گئی؟ کہاں چلی گئی؟ کیوں چلی گئی آخر؟“ ایلین نے تیز و تند لہجے میں پوچھا۔

چارلس نے رگوں میں خون کی جگہ برفیلا پانی دوڑنے کی سرسراہٹ سی محسوس کی۔ اس سرد آگ کی آنچ جو ایلین کے چہرے پر پڑتے ہی اُس کے وجود میں بھڑکنے لگی تھی۔ ”وہ

چلی گئی۔ کیونکہ میں نے اُسے ملازمت سے نکال دیا ہے۔''

''کیا کہا تم نے......؟ تم نے اُسے ملازمت سے نکال دیا ہے؟ تمہاری عقل ٹھکانے ہے کہ نہیں؟''

''ہاں...... میں نے اُسے نکال دیا ہے۔ اس لئے کہ وہ پاگل ہوگئی تھی۔ وہ ایسی باتیں کررہی تھی کہ میرے لئے ناقابل برداشت ہوگئیں۔ لہٰذا میں نے اُسے ملازمت سے سبکدوش کردیا۔'' چارلس نے کہا۔

''کیا روزی نے تم سے بدزبانی کی تھی؟'' ایلن کو شدید حیرت ہوئی۔

''ہاں۔'' چارلس نے صرف سر ہلا دیا۔ اُس نے زبان سے مزید کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھا۔''

''وہ کیا کہہ رہی تھی؟'' ایلن نے اُسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ''مجھے تو بتاؤ!''

''اُس نے تمہارے متعلق ہرزہ سرائی کی تھی۔'' چارلس نے گہری سانس لی۔

''میرے بارے میں؟'' ایلن کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اُس نے اپنی پلکیں جھپکائیں۔

''ہاں تمہارے بارے میں... تمہیں واپسی میں دیر ہوگئی تھی اور کھانا ٹھنڈا ہو رہا تھا۔''

''آخر اُس نے کیا کہا......؟ تم مجھے بتا کیوں نہیں رہے ہو؟'' ایلن چڑ سی گئی۔

''اُس نے ایسی باتیں کیں جنہیں دُہرانا کسی بھی لحاظ سے مناسب نہیں ہے۔''

''میں سن لوں گی۔ میری طرف سے تمہیں اجازت ہے۔'' ایلن نے کہا۔ ''جلدی سے کہو!''

''وہ کہہ رہی تھی کہ مجھ جیسے آدمی کے لئے تم جیسی عورت سے شادی کرنا بہت بڑی بدقسمتی ہے۔ کیونکہ تم انتہائی غیر ذمے دار، بے پرواہ، بے سلیقہ اور بے لگام عورت ہو۔ ایک بری ماں اور انتہائی گھٹیا قسم کی بیوی......''

ایلن کی خوبصورت آنکھوں میں خوف کی ایک چمک کوندی۔ وہ خاموش ہوگئی۔ نشست گاہ میں اُس کا عزیز دوست آرتھر موجود تھا مگر وہ اس دوران بالکل چپ رہا تھا۔ ایلن نے کوٹ اور ہیٹ اُتار کر ایک طرف پھینکا اور سیدھی اپنے شوہر کے پاس آئی۔ ''تو کیا...... تو تمہارا خیال ہے کہ میں...... میں......؟'' وہ زہرخند بولی۔

''یہ میرا خیال نہیں ہے۔'' چارلس نے پُرسکون لہجے میں جواب دیا۔ ''میں نے تو

تمہارے اصرار پر وہی کچھ دہرایا ہے جو اُس بوڑھی روزی نے مجھ سے کہا تھا...... اسی بات پر تو میں نے اُسے ملازمت سے نکالا ہے۔''

ایلن اُسے شعلہ بار نظروں سے دیکھنے لگی جیسے اُس کا بس چلے تو اپنے شوہر کا منہ نوچ لے اور اپنے لمبے ناخنوں سے اُس کا چہرہ لہولہان کردے۔ وہ شخص جو اُس کی تیوریوں پر بل دیکھ کر لرزنے لگتا تھا اس وقت کیسے اطمینان سے باتیں کررہا ہے۔ پھر اُس نے اپنا اضطراب چھپانے کی ناکام کوشش کی اور کسی قدر بیزاری سے پوچھا۔ ''تم نے کھانا تو کھالیا ہوگا۔''

''نہیں......'' چارلس نے سر ہلایا۔ ''میں تمہارا انتظار کررہا تھا۔''

ایلن نے آہستہ سے کندھے اُچکائے۔ ''تم کیسے آدمی ہو......؟ ساڑھے سات بجے کے بعد آخر میرا انتظار کرنے کی کیا تک تھی؟ تمہیں سمجھ لینا چاہئے تھا کہ کسی وجہ سے مجھے دیر ہوگئی ہے۔ اور مزید دیر بھی ہوسکتی ہے۔ کوئی بھی مجبوری ہوسکتی ہے مجھے۔ بہت سے کام ہوتے ہیں۔ خریداری ہے، ملنا جلنا ہے اور بھی چھوٹے موٹے کام نکل آتے ہیں۔''

چارلس نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ اُس کی خاموشی سے ایلن نے شاید یہ محسوس کیا کہ اُسے اپنی مصروفیات کی کچھ نہ کچھ وضاحت ضرور کرنی چاہئے۔ اُس نے تلملاتے ہوئے رُک رُک کر اُسے بتایا۔ ''میں شہر کے دوسرے حصے میں بہت دُور ایک خاص دُکان پر کچھ فرنیچر خریدنے گئی تھی۔ بھوک بھی لگ رہی تھی۔ لیکن میں اکیلی کھانا نہیں کھاتی ہوں۔ اس لئے بھوک برداشت کرتی رہی۔ پھر وہاں اچانک آرتھر سے ملاقات ہوگئی۔ میں نے ان کے ساتھ ایک ریستوران میں کھانا کھایا۔ اسے کھانا تو نہیں کہا جاسکتا، بس رسمی کارروائی پوری کرنے کے لئے کھالیا تھا۔ وہ بھی بڑی عجلت میں...... کیونکہ انہیں گھر پہنچنے کی جلدی تھی۔''

''ظاہر ہے مجبوری تھی...... میں تمہیں قصوروار کہاں ٹھہرا رہا ہوں؟'' چارلس نے سادگی سے کہا۔

آرتھر نے آگے بڑھ کر چارلس سے کہا۔ ''تمہاری طبیعت کیسی ہے؟ کیسے ہو تم......؟''

''ہمیشہ کی طرح آج بھی ہے۔'' چارلس نے بڑی نرمی سے کہا۔ ''بس ٹھیک ہوں۔''

چارلس کے آخری فقرے پر ایلن کے تن بدن میں آگ سی لگ گئی تھی۔ ''قصوروار ٹھہرانے سے تمہارا کیا مطلب ہے......؟ آخر تم کہنا کیا چاہتے ہو؟ کھل کر کہو!'' وہ برہمی سے بولی۔ اُس کا چہرہ سرخ ہوگیا۔

''کچھ نہیں...... میرا مطلب ہے کہ مجھے ذرا بھی تشویش نہیں تھی۔ حالانکہ تمہیں آج خاصی دیر ہوگئی تھی۔ بہت زیادہ دیر بلاوجہ نہیں تھی۔ مگر کوئی بھی مجبوری ہوسکتی تھی۔''

ایلن لڑائی کے موقع کی تاک میں تھی۔ اُسے بہانہ مل گیا۔ ''ہاں مجھے دیر ہوگئی تھی۔ بہت زیادہ دیر......'' وہ استہزائیہ لہجے میں بولی۔ ''لگتا ہے کہ رات کے دو بج رہے ہیں اور میں اپنی راتیں ہمیشہ گھر سے باہر گزارتی ہوں۔''

''میرا یہ مطلب نہیں تھا ڈیئر!'' چارلس نے مصالحانہ لہجے میں کہا۔ ''میں نے لفظ دیر اس لئے استعمال کیا کہ اس کے سوا کوئی دوسرا لفظ مناسب نہیں تھا۔ تم کہہ گئی تھیں کہ ساڑھے چھ بجے تک آجاؤ گی اور اب ساڑھے آٹھ بج رہے ہیں۔ ظاہر ہے اسے دیر ہونے کے سوا کیا کہا جاسکتا ہے؟ اور اب تو مجھے دیر کی وجہ بھی معلوم ہوگئی ہے۔''

''تمہارا انداز کچھ ایسا تھا جیسے میں نے ساری رات باہر گزاری ہو۔'' ایلن نے بہت تیز لہجے میں کہا۔

''نہیں...... نہیں...... بالکل نہیں۔'' چارلس نے نفی کے انداز میں سر ہلایا۔

ایلن کو کچھ اندازہ ہوگیا کہ اُس کا شوہر ہمیشہ کی طرح آج بھی سرِتسلیم خم کردے گا اور اس سے اختلاف کی جرأت نہیں کرے گا۔ وہ مطمئن انداز میں خواب گاہ کی طرف جانے لگی۔ درمیان میں نشست گاہ کا دروازہ تھا۔ اُس کی نظر ایمی پر پڑی۔ اُس نے ماں کو دیکھ کر ہاتھ ہلایا۔ اُس نے ایمی کو افسردہ دیکھا تو اُس کے پاس گئی۔ وہ اس سے اس کی افسردگی کے بارے میں پوچھنے لگی۔ اُس کی نظر میز پر پڑی، پھر اُس نے طیش سے اپنے شوہر کی طرف دیکھا۔ ''کیا ہوا ایمی کو...... اور یہ...... یہ......؟'' اُس نے حیرت سے ٹوٹا ہوا گلاس اور اُلٹا ہوا نمک دان دیکھا۔ ''یہ کس نے کیا ہے؟''

''روزی نے۔'' چارلس نے اُسے بتایا۔ ''میں نے تم سے کہا تھا کہ اُس نے......''

''اُس حرافہ نے......؟'' ایلن ہذیانی انداز میں چیخی۔ اُس کا چہرہ تمتمانے لگا۔ ''اُس نے مجھے بری ماں کہا، بے لگام بیوی کہا اور کراکری بھی توڑ دی...... اور شاید اُس نے میری بچی کو بھی کچھ کہا ہے۔ کیا یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے؟''

''اسی لئے تو میں نے اُس بوڑھی کھوسٹ کو ملازمت اور گھر سے نکال باہر کیا۔''

''بڑا کمال کیا...... بڑا تیر مارا جو تم نے اُسے ملازمت سے برخواست کردیا۔ ظلم کا پہاڑ

توڑ دیا۔ تمہیں چاہئے تھا کہ اُس ذلیل، کمینی کو پولیس کے حوالے کردیتے...اُس کا منہ توڑ دیتے۔''

''اُس نے پپا پر ہاتھ اُٹھایا تھا۔'' ایمی جو بہت کم دخل دیتی اور بولتی تھی، وہ بھی بول اُٹھی۔

ایلن نے پلٹ کر اپنے شوہر کی طرف دیکھا۔ شدید حیرت کے باعث اُس کی زبان گنگ ہوگئی۔ پھر اُس نے بے ساختہ ایک زوردار قہقہہ لگایا، پھر وہ ہنسنے لگی۔ ''مارا تھا......؟ ہاہاہا...... سنا تم نے آرتھر! اُس بڑھیا نے میرے شوہر کو مارا......''

''نہیں...... نہیں...... یہ غلط بات ہے۔'' چارلس نے جلدی سے تردید کی۔ ''ایمی کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ وہ ٹھیک سے نہیں دیکھ سکی۔ اس کے برعکس میں نے روزی کو اتنے زور سے دھکا دیا کہ وہ میز سے ٹکرا کر گر گئی۔ گلاس ٹوٹ کر گر گیا۔ ایمی دُور بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ کچھ خوفزدہ، پریشان اور سراسیمہ بھی ہورہی تھی۔

''کیوں میری جان! روزی نے پپا کو مارا تھا یا تمہارے پپا نے روزی کو مارا تھا؟'' ایلن نے ایمی سے پوچھا۔

''اُس نے پپا کو مارا تھا...'' ایمی اپنی بات پر اڑی رہی۔ ''پپا نے اُسے صرف دھکا دیا تھا۔''

ایلن کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن اُس کی نظریں کھانے کی میز پر مرکوز ہوگئیں۔ ''میری جان ایمی! تم نے کھانا کھالیا؟''

''نہیں ممی!'' ایمی روہانسی ہوکر بولی۔ ''مجھے بڑے زور کی بھوک لگ رہی ہے۔''

ایلن نے پلٹ کر چارلس کو شعلہ بار نظروں سے دیکھا۔ ''تم کچھ اُتر گئے ہو۔ تمہارا دماغ خراب ہوگیا ہے۔ ساڑھے آٹھ بج چکے ہیں، میری بیٹی ایمی کو اب تک کھانا نہیں ملا ہے۔ سنا تم نے......؟''

''ہم تمہارا انتظار کررہے تھے ڈیئر!'' چارلس نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔ اپنی بیٹی کا استہزائی قہقہہ سن کر چارلس کو خود سے نفرت ہونے لگی۔ وہ جلد از جلد خواب گاہ کی پناہ گاہ میں جانا چاہتا تھا۔ ''میں تمہارے بغیر کھانا کیسے کھاتا؟ تم روز دیر سے آتی ہو۔ بس اسی لئے میں نے سوچا کہ اب تم آتی ہوگی۔''

''احمقوں کے ساتھ زندگی بسر کرنا دنیا کا مشکل ترین بلکہ بدترین کام ہے۔ اتنی سی بات تمہاری کھوپڑی میں کیوں نہیں آتی کہ ساڑھے سات بجے کے بعد مجھے زیادہ دیر بھی

ہو سکتی ہے۔ اور کوئی غیر معمولی رُکاوٹ بھی ہو گی جو اتنی دیر ہو گئی۔"

چارلس کو خود پر قابو پانا مشکل ہو رہا تھا۔ اُس کی نس نس میں لہو اُبلنے لگا۔ وہ غصے سے کانپ اُٹھا۔ آرتھر نے اس بات کو فوراً ہی محسوس کر لیا تھا۔ اُس نے مُڑ کے ایلن کو دیکھا۔

"میرا خیال ہے کہ تم کچھ زیادتی کر رہی ہو ایلن!...... تم کبھی اتنی دیر سے نہیں آئیں۔ آخر چارلس کو کیسے معلوم ہوتا کہ آج بہت دیر ہو جائے گی۔ اس نے بوڑھی پرانی ملازمہ کو بھی نکال دیا ہے۔ ایمی کو کھانا دینا روزی کی ذمہ داری تھی۔ کیا چارلس کو اس کا تجربہ ہے؟"

لیکن ایلن بہت برافروختہ تھی۔ "اسے یہ سب کچھ کرنا چاہئے۔ اب کرنا پڑے گا۔ نہیں آتا تو سیکھنا پڑے گا۔" ایلن پیر پٹختی ہوئی نشست گاہ سے نکل گئی اور یہ بھی بھول گئی کہ اُس کی بیٹی ایمی بھوکی ہے۔

آرتھر نے میز سے گلاس کے ٹکڑے جمع کر کے کوڑے دان میں ڈال دیئے۔ پھر وہ میز پر رکابیاں رکھنے لگا۔ چارلس، ایلن کی ملازمہ کو بلانے چلا گیا تا کہ وہ کھانا وغیرہ نکالے۔ ملازمہ آ گئی اور باورچی خانے سے کھانا لا کر میز پر چننے لگی۔ چارلس، ایمی کے پاس بیٹھ گیا تا کہ وہ اُس کی دلجوئی کر سکے۔ ایمی بہت خوفزدہ سی تھی۔ اُس کی مثال ایک ننھی سی بچی کی مانند تھی جو صرف دیکھتی رہتی ہے، بول نہیں پاتی ہے۔ بولنا نہیں چاہتی ہے۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں وہ سب کچھ سمجھ رہی تھی۔ اُس کی عمر اتنی تھی کہ اس میں بہت ساری باتوں کا شعور آ چکا تھا۔ اس کے نزدیک خاموشی ہی بہتر تھی۔

چارلس کا عزیز از جان دوست اُس کے مقابل بیٹھا ہوا تھا۔ چارلس، ایمی کو کھانا دے کر کچھ کھانے کی کوشش کرنے لگا۔ اُس کے دل کے کسی کونے میں اپنے دوست آرتھر اور ایمی کے چہروں کا موازنہ کرنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ کیا واقعی ایمی کی شکل آرتھر سے ملتی ہے؟ پہلے تو اُس کی ہمت نہیں پڑی۔ پھر اُس نے غیر محسوس انداز سے آرتھر کے چہرے پر ایک نظر ڈالی۔ آج آرتھر کا چہرہ مختلف نظر آیا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اس نے پہلے کبھی اس کے چہرے کا ایک ایک نقش اتنے غور سے نہیں دیکھا تھا۔ وقفے وقفے سے اُس نے کئی بار آرتھر کے چہرے پر ناقدانہ نظر ڈالی تھی۔ پھر ایمی کو ڈبل روٹی دینے کے بہانے اُس نے اُس کے چہرے پر بھی تنقیدی نظر ڈالی۔ روزی کی ایک ایک بات اُس کے ذہن میں گونج رہی تھی...... آرتھر اس کا باپ ہے...... آرتھر، ایمی کا باپ ہے۔

ہاں شاید...... چارلس نے ڈوبتے دل سے سوچا۔ آرتھر ہی ایمی کا اصل باپ ہو۔ آرتھر اطمینان سے کھانا کھانے میں مصروف تھا۔ چارلس کا ہاتھ رُک گیا۔ اُس سے ویسے بھی کچھ کھایا نہیں جا رہا تھا۔ اُس کے سینے میں رہ رہ کر ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں۔ ایسی جان سوزی جو آدمی کو دیواروں سے سر ٹکرانے پر مجبور کر دیتی ہے۔ اُس کا دل چاہا کہ میز پر رکھی ہوئی چھری اُٹھا کر اپنے سینے میں گھونپ لے۔ کسی طور اس اذیت کا خاتمہ تو ہو...... اس کے بعد سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ اس کے پاس اب زندہ رہنے کے لئے بچا ہی کیا تھا؟ کیا اب بھی وہ اپنی بیٹی ایمی کو اس یقین سے پیار کر سکے گا کہ وہ اس کی بیٹی ہے؟ جب بھی اُس کی نظر ایمی پر پڑے گی یہ سوال اس کا خون جلاتا رہے گا کہ ایمی کا اصل باپ کون ہے؟ کیا وہ اس صورت حال میں ایمی اور اُس کی ماں کے ساتھ ایک لمحے بھی سکون پا سکے گا؟ ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے کیا وہ اس بچے کو پیار کر سکے گا جسے اس نے آج تک اپنا جزو جان سمجھا ہے۔ اب یہ ممکن ہی نہیں ہے۔ آخر کہیں کسی دن وہ اس بچی سے شدید نفرت کرنے پر مجبور نہ ہو جائے۔ ہائے یہ کیسا عذاب روزی اس پر مسلط کر گئی؟ کاش! وہ اپنی زبان بند رکھتی۔ یہ شک تو اسے زندہ درگور ہی کئے رکھے گا۔ اس تلاطم میں وہ خود کو کب تک قائم رکھ سکے گا؟ اب کیونکر وہ ایمی کو پارک کی سیر کے لئے لے جائے گا؟ اور پارک میں اسے غذا جھپٹنے کے لئے بطخوں کا کھیل دکھائے گا؟ ایمی کو یہ تماشا تتلی پکڑنے سے کہیں زیادہ پسند ہے۔ بطخوں کا شور سن کر وہ کیسے دو سال کی بچی کی طرح اُچھلتی کودتی ہے۔ ایمی کی مسرتوں سے اس کا خون بڑھتا تھا۔ مگر اب یہ سب کچھ ایک خواب ہو کر رہ گیا ہے۔ ایمی بہت ذہین بچی ہے۔ وہ اپنے باپ کا جلتا ہوا چہرہ فوراً محسوس کر لے گی۔ کیا یہ بہتر نہیں کہ وہ اسے کسی دوسرے شہر میں چھوڑ آئے یا خود یہ شہر چھوڑ دے؟ کسی دوسرے ملک فرار ہو کر چلا جائے۔ وہاں اس کی زندگی پُرسکون گزرے گی۔ جان لیوا اذیت تو نہیں ہو گی۔

"مجھے بھوک لگ رہی ہے۔" ایلن نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے اعلان کیا اور میز پر بیٹھ گئی۔ اُس نے لباس بدل لیا تھا اور پُرسکون نظر آ رہی تھی۔ وہ کھانے پر ڈٹ پڑی۔ آرتھر بھی بڑی رغبت سے کھانا کھا رہا تھا۔ چارلس کو یکلخت یاد آیا کہ اس کی بیوی نے کچھ دیر پہلے کہا تھا کہ وہ آرتھر کے ساتھ کسی ریستوران میں کھانا کھا کر آئی ہے۔

کھانے کے دوران ایلن سب کچھ بھول گئی اور آرتھر سے چہلیں کرنے لگی۔ چارلس کو

احساس ہوا کہ اس کی بیوی کبھی اس کے ساتھ اس خوش کلامی، شوخی اور شگفتگی سے پیش نہیں آئی۔ ایلین کی یہ چٹک مٹک صرف آرتھر کے لئے مخصوص ہے۔ وہ وہاں اُس کے سامنے برابر بیٹھے تھے۔ ان کے انداز میں کیسی وارفتگی اور شیدائیت تھی، جیسے وہ دونوں ایک دوسرے کے اشارے سمجھتے ہوں۔ چارلس کی نگاہیں دونوں پر بکھری ہوئی تھیں۔ وہ اس سے پہلے یہ سب کچھ کیوں نہیں دیکھ سکا؟ حالانکہ گزشتہ گیارہ برسوں میں اسی طرح کھانا کھاتے دیکھتا تھا۔ یہ اُس کے لئے نیا نہیں تھا۔

اچانک اُس نے ایک فیصلہ کیا۔ ''مائی ڈیئر......!'' اُس نے اپنی بیوی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''روزی کے چلے جانے کے بعد گھر کے بہت سارے کام ادھورے رہ جائیں گے۔ اس لئے میں ابھی دوسری ملازمہ کا بندوبست کرنے جاتا ہوں تاکہ کل صبح سے کام معمول کے مطابق ہو۔ ممکن ہے مجھے دیر ہو جائے۔ خاصی دیر بھی ہو سکتی ہے، کیونکہ کافی دُور جانا ہوگا۔''

''ٹھیک ہے۔'' ایلین نے سر ہلایا۔ ''آرتھر تو یہیں ہیں، میں یہ وقت ان کے ساتھ گزار لوں گی۔ ہم دونوں تمہاری واپسی کا انتظار کریں گے۔''

پھر ایلین نے اپنی ملازمہ سے کہا۔ کھانے کے بعد ایمی اپنے کمرے میں سونے چلی جائے گی۔ پھر تم بھی اپنے کمرے میں چلی جانا۔''

چارلس اس طرح ڈگمگاتے قدموں سے باہر نکلا جیسے کسی ہچکولے کھاتے ہوئے جہاز پر چل رہا ہو۔ تھوڑی دیر کے بعد ایمی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ ملازمہ برتن سنک میں رکھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ کمرے میں آرتھر اور ایلین تنہا رہ گئے۔

''یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے ایلین؟'' آرتھر نے شکایتی لہجے میں کہا۔ ''تم کیوں اُسے ہر وقت، سرزنش کرتی رہتی ہو؟''

''تم کیوں اُسے شہیدوں کا رتبہ دینے پر تلے ہوئے ہو؟'' ایلین نے جواب دیا۔ ''تمہاری یہ عادت اب مجھے بری طرح ستانے لگی ہے۔''

آرتھر میز سے اُٹھ کر ایک بڑے صوفے پر پیر پھیلا کر بیٹھ گیا۔ ''میں اُسے شہید نہیں بنا رہا۔ مگر ذرا سنجیدگی سے سوچو کہ جس صورت حال میں ہم دونوں گھرے ہوئے ہیں اس کے پیش نظر اس شخص کے ساتھ ہر وقت حقارت آمیز سلوک کہاں کی دانش مندی ہے؟''

ایلین نے سگریٹ جلائی اور ناک سے دُھواں نکالتے ہوئے بولی۔ ''میں دانستہ تو ایسا نہیں کرتی۔ اُس کی حماقتیں اور بے وقوفیاں ایسی ہیں کہ مجھے غصہ آ جاتا ہے اور میں اس کے ساتھ وہ سلوک کرنے لگتی ہوں جو ایسے لوگوں کے ساتھ کرنا چاہئے۔''

''تم جو کچھ کر رہی ہو وہ خطرناک ہونے کے علاوہ پرلے درجے کی نادانی بھی ہے۔ میرا خیال ہے تمام عورتیں ایک جیسی ہوتی ہیں۔ ذرا توجہ سے میری بات سنو! تمہارا شوہر چارلس ایک عمدہ آدمی ہے۔ بے حد نرم دل اور بے وقوف ہونے کی حد تک سیدھا...... وہ ہمارے معاملات میں کبھی دخل نہیں دیتا۔ اُسے ان گیارہ برسوں میں کبھی ایک لمحے کے لئے بھی ہم پر شک نہیں ہوا۔ وہ کیسی خوش دلی سے ہمیں تخلئے کے مواقع فراہم کرتا ہے۔ اور تم..... تم ہو کہ اُس غریب کو مشتعل کرنے کی کوشش کرتی رہتی ہو۔ اسے خوار کرنے کے بہانے تلاش کرتی ہو۔ تم کیوں نہیں سمجھتی ہو کہ اس طرح تو اپنی مسرتوں اور تخلیوں میں رخنے پڑ جائیں گے۔''

''تمہاری باتیں مجھے ہراساں اور پریشان کر رہی ہیں آرتھر ڈیئر!.....'' وہ کہنے لگی۔ ''ایسا لگتا ہے جیسے تم بھی دوسرے مردوں کی طرح بزدل بنتے جا رہے ہو۔ تم اس قدر خوفزدہ کیوں ہو اُس بے چارے مسکین اور یتیم سے؟''

آرتھر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ ''میں جاننا چاہتا ہوں کہ آخر اُس بیچارے نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟ تم کیوں اُس سے محاذ آرائی پر کمربستہ رہتی ہو؟ کیا وہ تمہاری ہر فرمائش پوری نہیں کرتا؟ کیا وہ تمہیں ہر ممکن طریقے سے خوش رکھنے کی کوشش نہیں کرتا؟ کیا وہ تمہیں دوسرے مردوں کی طرح مارتا پیٹتا ہے؟ کیا وہ تمہارے ساتھ بے وفائی کرتا ہے اور دوسری عورتوں کے پاس جاتا ہے؟ آخر تم کس لئے اُس سے نفرت کرتی ہو؟ کیا اس لئے کہ وہ انتہائی نفیس اور شریف انسان ہے یا اس لئے کہ اُس سے گیارہ برسوں سے بے وفائی کی مرتکب ہو رہی ہو؟''

ایلین اُٹھ کر اُس کے قریب آ گئی اور اُس کی آنکھوں میں جھانکتی ہوئی بولی۔ ''تم مجھے بے وفائی کا طعنہ دے رہے ہو..... تم!..... تم..... بہت ناکارہ، بیہودہ آدمی ہو تم!'' وہ جھٹکے سے پیچھے ہٹی اور دوسرے صوفے پر ڈھیر ہو گئی۔

آرتھر کے چہرے پر ندامت کی سرخی دوڑ گئی۔ اُس نے اپنا دفاع کرنے کی کوشش کی۔

''میں بے وفائی کا طعنہ نہیں دے رہا...... میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ تم اپنے شوہر کے ساتھ نرمی اور محبت سے پیش آیا کرو۔ کیونکہ ہم دونوں کو اس کے اعتماد کی ضرورت ہے۔ ایسے ایسا کوئی موقع مت دو کہ وہ شک میں مبتلا ہو جائے۔ میرا خیال ہے کہ تم بھی اس تجویز کی معقولیت سے اتفاق کرو گی۔'' وہ اُس کے قریب عاجزی سے کھڑا رہا۔ ایلن چند لمحوں تک غور سے یونانی شہزادے جیسے خوبصورت، وجیہہ اور دراز قد محبوب کو دیکھتی رہی۔ پھر اُس کے چہرے پر نرمی کے آثار پیدا ہونے لگے۔ اُس نے آرتھر کا ہاتھ تھاما اور اُس کے سہارے صوفے سے کھڑی ہوگئی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے آمنے سامنے کھڑے تھے۔

''تم آج تک سمجھ نہیں سکے میرے آرتھر! میری جان!'' ایلن نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''میں اُس گدھے سے اس لئے نفرت کرتی ہوں کہ اُس نے مجھ سے شادی کی۔ اُس نے اپنی دولت سے میرا بدن اور میرا وجود خرید لیا۔ وہ اپنی دولت کے بل بوتے پر میرے جسم کو وحشیانہ طور پر استعمال کرتا ہے۔ اسے گیلے کپڑے کی طرح نچوڑ کر رکھ دیتا ہے۔ میں اسے منع بھی نہیں کرسکتی جانتے ہو جس وقت میں اُس کے ہاتھوں کھلونا بننے پر مجبور ہوتی ہوں تو میں کس اذیت سے گزرتی ہوں؟ میں نے اُسے کبھی روکا نہیں، اُسے منع بھی نہیں کرسکتی ہوں۔ کیونکہ رُوح تو میری ہے، وہ اس دولت سے محروم ہے اور میں نے اپنی خوشی سے تمہارے حوالے کی ہے۔ ہاں، میں اُس سے نفرت کرتی ہوں۔ کیونکہ وہ میرے خوبصورت چہرے، خوبصورت، پُرکشش اور پُر شباب گداز بدن کا بھوکا ہے۔ وہ کتا ہے۔ مجھے کچا گوشت سمجھتا ہے۔ وہ انتہائی چغد اور گاؤدی ہے۔ اُس کی ہر حرکت، اُس کا ہر لفظ، ہر خیال مجھے جھنجھلا دیتا ہے۔ میرے تن بدن میں آگ لگا دیتا ہے۔ تم اُس کی سادہ دِلی اور رحم دلی سے تعبیر کر رہے ہو؟ اُس کا گھامڑ پن اعتماد سے موسوم کر رہے ہو۔ کیا اُس سے بڑا بودم آج تک تمہاری نظروں سے گزرا ہے؟ اُس کی آنکھوں کے سامنے گزشتہ گیارہ برسوں سے سب کچھ ہورہا ہے اور وہ قطعی لاعلم ہے۔ اُسے کبھی ہم پر شک نہیں ہوا۔ وہ تمہیں اپنا بہترین دوست اور مجھے اپنی وفادار بیوی سمجھتا ہے۔ شاید اس لئے راتوں کو اُس کی ہر بات مان اور سہہ لیتی ہوں۔ کبھی کبھی تو اُس اُلو کے پٹھے پر مجھے اس قدر غصہ آتا ہے کہ بس اُس کے پھولے ہوئے گالوں پر طمانچے مار مار کر کہوں۔ ''اُجڈ! گنوار! یہ شخص تیرا جگری دوست میرا محبوب ہے۔ کیا تجھے یہ حقیقت نظر نہیں آرہی؟''

''یہ سب کچھ ٹھیک ہے ڈارلنگ! لیکن پھر بھی احتیاط بہت لازم ہے۔''

''احتیاط......؟'' ایلن تمسخر سے بولی۔ ''اُس اندھے کے سامنے......؟''

''وہ اندھا نہیں ہے بلکہ ہم پر بے پناہ اعتماد کرتا ہے۔ اُس کے اعتماد کا یہ طلسم ایک دفعہ ٹوٹ گیا تو پھر کچھ باقی نہیں رہے گا۔''

''خیر...... خیر...... تم بہت ڈرپوک ہو۔ تم کہتے ہو تو میں آئندہ احتیاط کروں گی اور تمہاری ہدایت کے مطابق اپنا غصہ ضبط کرنے کی کوشش کروں گی۔ لیکن کیسی تعجب کی بات ہے کہ تم اس سے میری نفرت کی وجہ نہیں سمجھ سکے۔ اس کے برعکس تم اُس کی تعریفیں کرتے ہو۔ بڑے خلوص کے ساتھ مصافحہ کرتے ہو۔ یہ مرد کیسے ہوتے ہیں؟''

''اسے مصلحت کوشی یا زمانہ سازی کہتے ہیں ڈارلنگ!'' آرتھر نے کہا۔

سوال ریاکاری کا نہیں، احساسات کا ہے۔ تم مرد چھپ کر ایک دوسرے کو دھوکہ دیتے ہو۔ شاید اس لئے لوگ اپنے مخالف کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ اس کے لئے تمہارے دل میں نرم گوشہ پیدا ہو جاتا ہے۔ لیکن ہم عورتیں اپنے شوہروں سے بے وفائی کرتی ہیں تو تمہارے دلوں میں اُن سے نفرت جاگزیں ہو جاتی ہے۔'' ایلن بولی۔

''تمہارا مطلب یہ ہے کہ میں ایک نہایت عمدہ شخص سے محض اس لئے نفرت کروں کہ اُس کی بیوی مجھے نوازتی ہے؟''

''اوہ...... اوہ...... تمہیں کچھ سمجھانا کارے وارد ہے۔ تم سمجھ ہی نہیں سکتے۔ اور پھر یہ باتیں لفظوں میں بیان نہیں کی جاسکتیں، صرف محسوس کی جاسکتی ہیں۔ مردوں میں شاید لطیف جذبات نہیں ہوتے۔ وہ صرف اور صرف عورت کے جسم کے بھوکے ہوتے ہیں۔ ہم نے اُس ہوسٹل کے کمرے میں تین گھنٹے گزارے لیکن وہ تمہیں تین منٹ لگے۔ اس وقت تمہاری آنکھیں پیاسی دیکھ رہی ہوں۔''

ایلن، آرتھر کے اور قریب آ گئی۔ پنجوں کے بل لپک کر اُس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ آرتھر نے وارفتگی سے اُس کی کمر گرفت میں لے لی......!

○

اُنہیں کوئی آواز نہ آہٹ سنائی دی۔ نہ اپارٹمنٹ کے داخلی قفل میں چابی گھومنے کی آواز آئی، نہ ہی دروازہ کھلنے کی آہٹ ہوئی، نہ کوئی چاپ پیدا ہوئی۔ پہلے ایلن کی نظر

اپنے شوہر پر پڑی۔ وہ چیخ مار کر آرتھر سے علیحدہ ہوگئی۔ پھر دونوں نے پلٹ کر چارلس کا سامنا کیا۔ وہ اُن کے مقابل کھڑا تھا۔ اُس کے چہرے پر آگ جل رہی تھی۔ آنکھیں جیسے اُبل کر باہر آگئی تھیں۔ اُس نے کوئی لفظ نکالے بغیر اپنے عزیز از جان دوست پر جست لگائی۔ آرتھر سنبھل نہ سکا اور قالین پر گر گیا۔ چارلس اُس پر سوار ہوکر پوری قوت سے اُس کا گلا گھونٹنے لگا۔ ایلن کو ایک ہی نظر میں یقین ہوگیا کہ اس کا شوہر آج آرتھر کو جان سے مار دے گا۔ وہ کسی غضب ناک شیرنی کی طرح اُس پر جھپٹی۔ اُن کی اُنگلیوں کے لمبے لمبے ناخن چارلس کی گردن میں پیوست ہوگئے۔ ساتھ ہی اُس نے اپنے دانت چارلس کے بازو میں گاڑ دیئے۔ چارلس نے چند لمحے برداشت کیا، پھر اُس نے تکلیف سے بلبلاتے ہوئے آرتھر کو چھوڑ دیا اور پھر قالین سے اُٹھتے ہوئے ایلن کو اس زور سے دھکا دیا کہ وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکی اور اُچھل کر دوسرے کونے میں جا گری۔

وہ اُن کے درمیان کھڑا تھا۔ اُس کی سانس بری طرح پھولی ہوئی تھی اور کسی نیک دم کمزور آدمی کی طرح اُس کی قوت اور اُس کا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھتا جا رہا تھا۔ وہ لڑنے بھڑنے والا شخص نہیں تھا اور اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ جب سانسیں اُس کے قابو میں آئیں تو اُس نے ہیجانی لہجے میں چیختے ہوئے کہا۔ ''دفع ہو جاؤ...... نکل جاؤ یہاں سے تم دونوں...... ابھی اور اسی وقت......!''

آرتھر فرش پر بے حس و حرکت پڑا تھا۔ اُس کا ذہن اب تک صورت حال کا پورا ادراک نہیں کر سکا تھا۔ وہ حیران اور خوفزدہ تھا۔ ایلن ایک چھوٹی میز پر ہتھیلیاں ٹکا کر آہستہ آہستہ کھڑی ہونے کی کوشش کر رہی تھی۔ اُس کے بال بکھر گئے تھے اور لباس بے ترتیب ہوگیا تھا۔ وہ پھٹی پھٹی نظروں سے اپنے شوہر کو گھور رہی تھی جیسے اُس کا نرخرہ دانتوں میں دبا کر خون پی جائے گی۔

''تم دونوں میرے گھر سے فوراً نکل جاؤ!'' چارلس نے چیخ کر کرخت لہجے میں کہا۔

ایلن نے یہ محسوس کر لیا کہ اس کے شوہر کی دیوانگی ختم ہوگئی ہے۔ اُس کا حوصلہ بڑھ گیا۔ وہ تن کر سیدھی کھڑی ہوگئی اور چند قدم چارلس کی طرف بڑھی۔ ''تم پاگل ہو گئے ہو...... تمہارا دماغ خراب ہوگیا ہے؟ کیا ہوا تمہارے عزیز دوست نے مجھے دوستانہ انداز سے پیار کر لیا؟ اس میں کوئی میل نہیں تھا۔ اس تماشے کا آخر کیا مطلب ہے۔ ایڈیٹ!''

چارلس پر دوبارہ وہی جنون طاری ہوگئی۔ ایک پل کے لئے اُس نے دل میں کہا، کوئی بات نہیں...... وہ اس کے کمینے دوست سے ہم آغوش تھی اور وہ اس کے چہرے اور گردن پر بوسوں کی بارش کر رہا تھا۔ یہ کمینی، ذلیل کہہ رہی ہے کہ ان بوسوں میں کوئی میل نہیں تھا۔ دوست مار آستین نکلا۔ چارلس نے آگے بڑھ کر پوری طاقت سے اپنی بیوی کے چہرے پر ایک تھپڑ رسید کر دیا۔

''فاحشہ! طوائف! نکل جا یہاں سے...... میں نے ایک ایک لفظ سنا ہے تم دونوں کا...... سمجھی تو...... تم دونوں دنیا کے ذلیل ترین انسان ہو...... میں نے اپنے کانوں سے سب کچھ سنا ہے۔ میں کہیں گیا ویا نہیں تھا، گھر ہی میں چھپا ہوا تھا۔ نکل جاؤ تم لوگ ورنہ...... میں تم دونوں کو قتل کر دوں گا۔'' چارلس کی آنکھوں میں خون اُتر آیا تھا۔

ایلن نے اندازہ کر لیا تھا کہ اب اس کا کھیل خراب ہوگیا ہے۔ اب وہ گزرے ہوئے منظر کو کوئی دوسرا رنگ نہیں دے سکتی۔ بچاؤ کا کوئی راستہ ہی نہیں رہا۔ کیونکہ اُس کے شوہر نے سب کچھ دیکھ لیا ہے۔ اب بے گناہی ثابت کرنے کا وقت گزر گیا ہے۔ پھر اُس نے بے خوفی ظاہر کرنے کے لئے بے پروائی سے کہا۔ ''اُٹھو آرتھر ڈیئر! اس شخص نے مجھ پر گھر کے دروازے بند کر دیئے ہیں۔ اب میں تمہارے گھر چلوں گی۔ یہاں ایک منٹ بھی نہیں رہنا ہے۔''

پھر ایلن نے آگے بڑھ کر آرتھر کو جھنجھوڑا، پھر سہارا دے کر اُسے کھڑے ہونے میں مدد دی۔ ''آؤ دوست! یہ تمہارا عزیز دوست پاگل ہوگیا۔ شاید کہیں سے پی کر آ رہا ہے۔ اس کی مت ماری گئی ہے۔''

وہ آہستہ آہستہ دروازے کی طرف بڑھی۔ آرتھر ایک مجرم کی طرح اُس کے عقب میں سر جھکائے اس طرح چل رہا تھا جیسے کسی کو نیند میں چلنے کی بیماری ہوتی ہے۔ شوہر کے خلاف رگ رگ میں بھری ہوئی نفرت ایلن کے چہرے پر سمٹ آئی تھی۔ اُس نے حقارت سے چارلس کی طرف دیکھا، جیسے اُسے اپنی زہریلی زبان سے ڈسنا چاہتی ہو، کوئی ایسا زخم دینا چاہتی ہو جو ساری عمر ناسور بن کر رِستا رہے۔ پھر جو خیال اُس کے ذہن میں آیا وہ اس جیسی عورت کے ذہن ہی میں آ سکتا تھا۔ اُس نے ٹھہرے ہوئے مضبوط لہجے میں شوہر کو مخاطب کیا۔

''میں اپنی بیٹی ایمی کو بھی ساتھ لے کر جاؤں گی.....''

چارلس ششدر رہ گیا۔ اُس کی زبان جیسے گنگ ہوگئی۔ ''تیری بچی؟ ایک فاحشہ کی یہ جرأت...... بے حیا......!''

ایلن کے لبوں پر ایک مطمئن مگر زہر آلود مسکراہٹ اُبھر آئی۔ وہ بڑے اطمینان سے اپنے شوہر کے پاس پہنچی، پھر اُس نے جیسے بڑی رعونت سے کہا۔ ''ہاں...... میری بچی! اس پر تمہارا کوئی حق نہیں ہے چارلس! کیونکہ وہ تمہارا خون نہیں ہے۔ سمجھے تم...... تم اُس کے باپ نہیں ہو...... اُس کا باپ آرتھر ہے۔''

چارلس کے حلق سے کرب میں ڈوبی ہوئی چیخ بلند ہوئی۔ ''یہ جھوٹ ہے...... تو جھوٹ بول رہی ہے۔ تو انتہائی درجے کی کمینی عورت ہے۔ کس ڈھٹائی اور بے غیرتی سے جھوٹ بول رہی ہے۔''

''بے وقوف! ایک تمہارے سوا سب کو معلوم ہے کہ ایمی کا باپ کون ہے؟ تمہاری بچی! ہونہہ......''

چارلس لڑکھڑاتا ہوا اُلٹے قدموں ایک دم سے پیچھے ہٹا۔ اُس کا چہرہ دُھلے ہوئے کپڑے کی طرح سپید ہو رہا تھا۔ پھر وہ وہاں نہیں ٹھہرا اور بھاگتا ہوا اپنی خوابگاہ میں آ کر بستر پر گر گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد اُسے ایمی کی سسکیاں سنائی دیں۔ وہ باپ سے جدا ہونے کے خیال سے رو رہی تھی۔ پھر اپارٹمنٹ کے دروازے کا خودکار قفل بند ہونے کا کھٹکا ہوا، اور پھر پورے اپارٹمنٹ میں ایک وحشت ناک سناٹا چھا گیا......!

آرتھر ایمی اور اُس کی ماں کو اپنے اپارٹمنٹ میں لے آیا تھا۔ ایمی کئی مہینوں تک آرتھر کو ذہنی طور پر باپ تسلیم کرنے کو تیار نہ تھی۔ اُس کے ذہن میں یہ بات نہیں سماتی تھی کہ وہ آرتھر کی بیٹی کیسے ہوگئی؟ اُس نے ماں سے بھی کئی بار پوچھا تھا۔ اُس نے ماں سے کہا بھی تھا اور اُسے کئی مثالیں بھی دی تھیں کہ جس عورت کا شوہر ہوتا ہے، اُس کے جو بچے ہوتے ہیں وہ اُس کے شوہر سے منسوب ہوتے ہیں۔ اس کی سہیلیوں کے باپ وہی ہیں جو اُن کی ماؤں کے شوہر ہیں۔ کوئی دوست یا غیر شخص باپ نہیں ہے۔

ایلن کے لئے یہ سوال بڑا تکلیف دہ اور اذیت ناک ہوتا تھا۔ وہ اپنی بیٹی سے کہنے سے ڈر رہی تھی کہ وہ ایک ناجائز اولاد ہے۔ آرتھر اس کا باپ کیوں اور کیسے ہے۔ پھر آرتھر

کے ذہن میں یہ بات آئی کہ ایمی کو کس طرح سمجھایا جا سکتا ہے۔ پھر اُس نے ایک روز ایمی سے جھوٹ بولا۔ ''بات یہ ہے کہ تمہاری ماں نے پہلے مجھ سے شادی کی تھی۔ پھر کسی بات پر ناراض ہو کر طلاق لے لی۔ تمہاری پیدائش سے پہلے چارلس سے تمہاری ماں کی شادی ہوگئی۔ اس لئے چارلس تمہیں اپنی بیٹی سمجھتا تھا۔ حالانکہ تم اُس کا نہیں، میرا خون ہو۔ اس لئے چارلس نے تم پر کوئی دعویٰ نہیں کیا ہے۔''

اُس کی ماں آرتھر کے ساتھ بغیر شادی کے رہنے لگی تھی۔ آرتھر کی آمدن اتنی نہیں تھی کہ وہ ماں بیٹی کے اخراجات کا متحمل ہو سکتا۔ ایلن، آرتھر کی نہ صرف محبوبہ تھی بلکہ اُس کی مالی مدد بھی کرتی رہتی تھی جس کی وجہ سے وہ اُس سے گیارہ برس تک بندھا رہا۔ ایلن پُرتعیش زندگی کی عادی ہو چکی تھی۔ اب اُسے ایک عام عورت کی طرح زندگی گزارنا مشکل ہو رہا تھا۔ ایک برس تک کسی نہ کسی طرح زندگی بسر ہوگئی تھی۔ ایلن نے شادی کے جو زیورات وہ لے آئی تھی، ایک ایک کر کے فروخت کر دیئے۔ پھر وہ کب تک چلتے؟ پھر اُن کے درمیان غیر محسوس انداز سے تلخیاں پیدا ہونے لگیں۔ آرتھر کے ایک بیوہ مال دار عورت سے تعلقات ہو گئے جو اُس سے عمر میں بیس برس بڑی تھی۔ آرتھر اُس عورت سے شادی کر کے اُس کے ساتھ رہنے لگا۔

ایمی کو چارلس بہت یاد آتا تھا جو اُس کا سگا باپ نہیں تھا۔ آرتھر سگا باپ ہوتے ہوئے بھی اُسے باپ کا سا پیار نہیں دے سکا۔ اُس نے سنا کہ چارلس اپنی تمام جائیداد فروخت کر کے اٹلی چلا گیا ہے۔ اٹلی جانے سے پہلے اُس نے ایک تیس برس کی اطالوی نژاد عورت سے شادی کر لی۔ چارلس نے روم میں ایک جنرل سٹور کھول لیا ہے۔

اُس کی ماں ایک شراب خانے میں ویٹرس کی ملازمت کرنے لگی۔ وہ مہینے میں دو ایک بار کسی مرغے کو پھانس کر لاتی۔ یہ سلسلہ دو برس تک چلتا رہا۔ پھر اُس کی ماں نے ایک نائٹ کلب میں رقاصہ کی ملازمت حاصل کر لی۔ پھر اُس میں اور ایک کال گرل میں کوئی فرق نہیں رہا۔ ایمی کو اپنی ماں اور اُس کی گھناؤنی زندگی سے سخت نفرت ہوگئی۔

پھر اُس کی ماں نے ایک اسّی برس کے بوڑھے تاجر سے شادی رچا لی۔ تین برس تک زندگی بڑی شاہانہ اور عیش و عشرت میں گزری۔ پھر اُس کی ماں نے اپنے شوہر کے سوتیلے بھائی سے تعلقات استوار کر لئے۔ دونوں نے مل کر شوہر کے قتل کا منصوبہ بنایا لیکن اُس کی

ماں اور آشنا قتل کے الزام میں پکڑے گئے۔ اُن دونوں کو بیس، بیس برس کی جیل ہوگئی۔

ایمی کی زندگی میں خلا پیدا ہوگیا۔ وہ تن تنہا رہ گئی۔ پھر اُس نے ایک کپڑے کے کارخانے میں ملازمت کر لی۔ اُس کے بوڑھے مالک نے اُسے شادی کی پیشکش کی تو اُس نے آنکھیں بند کر کے قبول کر لی۔ اُس نے بھی اپنی ماں کی طرح اس شخص سے شادی کی تھی۔ شادی کے بعد اُسے بڑا پچھتاوا ہوا کہ اُس نے اپنی زندگی کی سب سے بڑی کوتاہی کی ہے۔ اُس کا شوہر حسن پرست ہی نہیں، جسم پرست بھی تھا۔ وہ دو برس تک اُس بوڑھے خاوند کے ہاتھوں کھلونا بنی رہی۔ راتیں اُس کے لئے عذابِ جان سے کم نہیں ہوتی تھیں۔ وہ سوچتی تھی کہ کیوں نہ اپنے شوہر کو موت کی نیند سلا دے۔ لیکن ماں کی مثال سامنے تھی۔

ایک روز اُس بوڑھے کا بیٹا جرمنی سے آیا تو وہ اُس کی جھولی میں پکے ہوئے پھل کی طرح جا گری۔ ایک روز بوڑھے خاوند نے اُن دونوں کو رنگے ہاتھوں پکڑ لیا۔ پھر اُسے طلاق مل گئی۔ اُسے اتنی رقم بھی مل گئی کہ وہ دو برس تک مزے سے زندگی گزار سکتی تھی۔ پھر اُس نے ایک ٹریول ایجنسی میں ملازمت کر لی۔ کرٹس بھی اسی ایجنسی میں ملازمت کرتا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو دل دے بیٹھے۔ ایمی نے اُسے اپنی سالگرہ پر اپنے فلیٹ میں مدعو کیا۔ کرٹس صرف ایک مہمان تھا۔ وہ ساری رات اُس کا مہمان رہا۔ وہ بڑی فیاضی سے کرٹس کی میزبانی کرتی رہی۔ اُن دونوں نے رات ایشیاء کی سیر وسیاحت کا پروگرام بنایا۔ کرٹس نے سفر اور ہوٹلوں میں قیام اور طعام کے سارے اخراجات اُٹھانے کی پیشکش کی، اس شرط پر کہ وہ اُس کی ہم سفر بنی رہے۔ وہ وہاں سے جو سوغات لا کر یہاں فروخت کرے گا اس کے منافع میں سے کوئی حصہ نہیں دے گا۔ ایمی نے اُس کی شرط مان لی۔ اُس کے پاس بھی خاصی رقم پس انداز کی ہوئی تھی۔ اُسے دولت کی ایسی کوئی خواہش نہ تھی۔ سیر وسیاحت کی بڑی تمنا تھی اس لئے وہ کرٹس کے ساتھ جانے کے لئے تیار ہوگئی۔ کرٹس ایک تیر سے دو شکار کر رہا تھا۔ ایک تو اُسے بلا کی حسین اور بے پناہ پُرکشش ہم سفر مل گئی تھی اور دوسرا یہ کہ اُس کی راتیں حسین اور رنگین ہوتی تھیں۔ اور پھر ایشیاء سے وہ جو سوغات لے جانے والا تھا، اس سے وہ راتوں رات دولت مند بن سکتا تھا۔

ایمی، کرٹس کی زندگی اور ماضی سے واقف نہیں تھی۔ کرٹس بہت خوبصورت اور ایک شہزادے کی طرح تھا۔ اُس کی زندگی میں آنے والے مردوں میں سب سے وجیہہ اور

دراز قد...... اب وہ اپنی زندگی سے پوری طرح لطف اندوز ہونا چاہتی تھی کیونکہ اُس کی زندگی میں بڑے دُکھ تھے۔ پھر وہ حادثات کی زد میں رہی تھی۔ جب آرتھر نے اُس کی ماں کو چھوڑ دیا تھا تب اُسے چارلس کی قدر وقیمت اور محبت کا احساس ہوا تھا۔ لیکن چارلس تو اُس کی دنیا سے نکل گیا تھا۔ ایمی کو بھی چارلس بہت یاد آتا تھا، نجانے کیوں؟

میں دل میں حیران تھا کہ میرے تصورات میں ایمی کی زندگی فلم کے مناظر کی طرح گھومتی رہی تھی۔ کیا وہ سچ ہے؟ پھر میں سو گیا تھا۔ جب میں بیدار ہوا تو صبح ہو چکی تھی۔ وہ دونوں جاگ رہے تھے۔ بہت مسرور تھے۔ اُن کی آنکھوں میں نیند کا جو خمار تھا اس سے ظاہر تھا کہ وہ خاصی رات تک جاگتے، چہکتے، بہکتے رہے ہیں۔

اس وقت ریل گاڑی ایک سٹیشن پر رُکی ہوئی تھی۔ میں ناشتہ کرنے ڈائننگ ہال میں چلا گیا۔ جب گاڑی دوسرے سٹیشن پر رُکی تو میں اپنے کوپے میں آ گیا۔ اُن دونوں نے اپنا ناشتہ وہیں منگوالیا تھا۔ وہ دونوں کافی پی رہے تھے۔

جب ریل گاڑی چل پڑی تو کرٹس نے مجھ سے پوچھا۔ ''تمہاری مصروفیت کیا ہے؟''

''میں ایک پامسٹ ہوں۔'' میں نے ازراہِ مذاق کہا۔ ''میں ماضی کے بارے میں بتا سکتا ہوں۔ غیب کا حال جانتا ہوں۔''

''واقعی...؟'' ایمی نے حیرت وتجسس سے کہا۔ اُس کی آنکھوں میں چمک سی پیدا ہوئی۔

''ہاں......'' میں نے سر ہلا دیا۔ ''میں ہاتھ دیکھ کر لوگوں کے ماضی اور حال کے بارے میں بتا سکتا ہوں۔''

''لیکن مجھے ان باتوں اور اس علم پر کوئی یقین نہیں ہے۔ پامسٹ لوگ اندھیرے میں تیر چلاتے ہیں۔ اندازے سے بتاتے ہیں، ستاروں کے علم کی مدد سے پیشن گوئیاں کرتے ہیں۔ پورے امریکہ اور یورپ میں لوگ اپنے اپنے برجوں کے بارے میں ذوق وشوق سے پڑھتے ہیں۔ انہیں مستقبل کا حال جاننے کی بڑی جستجو اور خواہش رہتی ہے۔''

''میں اصرار نہیں کرتا ہوں کہ اس علم پر یقین کریں۔ بہرحال ایک علم ہے۔ میں تمہارا ہاتھ دیکھ کر نہ صرف تمہارا نام بلکہ تمہارے والدین، دادا، پردادا، نانی، پرنانی اور بھی بہت سارے خاندان کے افراد کا نام بتا سکتا ہوں۔ مثلاً تمہارے بھائی بہنوں اور دوستوں کے نام۔''

''پھر تو تم بڑے کمال کے پامسٹ ہو۔'' ایمی خوش ہو کر بولی۔ پھر اُس نے کرٹس سے کہا۔ ''تم کیوں نہیں ان کا امتحان لے لیتے.....؟''

''مجھے اس سے دلچسپی نہیں ہے۔ میں کیوں امتحان لوں؟'' کرٹس نے بے پروائی سے کہا۔

''حرج ہی کیا ہے.....اس طرح سفر باتوں میں کٹ جائے گا۔'' ایمی بولی۔ ''تم اپنا ہاتھ دکھاؤ نا.....''

''اگر تمہیں اِتنا ہی شوق ہے تو تم اپنا ہاتھ دکھالو..... جو کچھ پوچھنا ہے، وہ پوچھ لو!'' کرٹس نے بیزاری سے کہا۔

ایمی نے اپنا خوبصورت اور نرم ونازک ہاتھ میری طرف بڑھا دیا۔ ''اچھا تم پہلے میرا نام بتاؤ!''

''ایک پامسٹ تمہارا نام کیسے بتا سکتا ہے؟'' کرٹس نے کہا۔ ''ان سے اپنا نام کیوں پوچھ رہی ہو؟''

''ابھی تو انہوں نے کہا ہے کہ خاندان کے تمام افراد کے نام بتا سکتا ہوں۔'' ایمی نے اُسے جواب دیا۔

جی ہاں۔ میں تم دونوں کا نام بتا سکتا ہوں۔ مجھے کاغذ، قلم دیا جائے۔'' میں نے کہا۔

ایمی نے اپنے دستی بیگ سے ایک رف پیڈ اور بال پین نکال کر میری طرف بڑھایا۔ میں نے اسے لے کر اپنے پاس رکھ لیا۔ پھر میں چند لمحوں تک بغور اُس کے ہاتھ کی لکیروں کو دیکھتا رہا۔ پھر میں نے اُس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ پروف. پیڈ کے ایک کاغذ پر بے مقصد آڑھی ترچھی لکیریں کھینچتا رہا۔ اگرچہ اس کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ لیکن یہ بہت ضروری بھی تھا۔

پھر میں نے ایمی سے کہا۔ ''میں نے تمہارا ہاتھ اور اس کی لکیریں دیکھ لی ہیں۔ تم اب جو پوچھنا چاہو، پوچھو!''

''سب سے پہلے تم میرا نام بتاؤ.....!'' وہ دلکش انداز سے مسکرائی۔

''تمہارا نام ایمی ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''تمہاری ماں کا نام ایلن۔ کیا یہ صحیح ہے؟''

''بالکل صحیح...'' ایمی نے حیرت اور خوشی سے کہا۔ ''تم نے میری ماں کا نام بھی بتا دیا۔''

''تمہارا نام بتا کر انہوں نے کون سا کمال کیا ہے؟'' کرٹس نے کڑوا سا منہ بنایا۔

''رات تمہارا نام سن لیا ہو گا۔''

''میرا خیال ہے کہ ہم دونوں نے انہیں اپنا نام نہیں بتایا اور نہ ہی متعارف ہوئے ہیں۔'' ایمی بولی۔ ''بالفرض ان کے علم میں میرا نام آ بھی گیا ہو گا تو یہ حیرت کی بات نہ ہوئی۔ لیکن میری ماں کا نام کس نے بتایا؟ تم بھی نہیں جانتے ہو میری ماں کا نام.....''

''اچھا تو ایمی کے باپ کا نام کیا ہے؟'' کرٹس نے چیلنج کے انداز میں پوچھا۔

''آرتھر.....'' میں نے جواب دیا۔ ''یہ اس شخص کی ناجائز اولاد ہے۔ ایمی دس برس کی عمر تک چارلس کو اپنا باپ سمجھتی رہی تھی۔ لیکن بعد میں اس پر انکشاف ہوا کہ اس کا باپ چارلس کا دوست آرتھر ہے۔''

ایمی اُچھل پڑی۔ اُس کا چہرہ لمحے بھر کے لئے متغیر ہو گیا۔ ''تم نے چارلس کے بارے میں معلوم کر لیا؟''

''ہاں..... وہ تمہاری ماں کا قانونی شوہر تھا جس کی قدر تمہاری ماں نے کبھی نہیں کی۔ وہ شادی کے پہلے دن سے اُس سے بے وفائی کرتی رہی۔'' میں نے کہا۔ ''چارلس ایک سیدھا سادھا، نیک اور مخلص شخص تھا۔ وہ اپنی بیوی یعنی تمہاری ماں سے بہت ڈرتا تھا۔''

''او مائی گاڈ.....'' ایمی ششدر ہو کر رہ گئی۔ ''تم اتنا کچھ بھی جانتے ہو.....؟ مجھے یقین نہیں آ رہا ہے۔''

''میں نے کوئی غلط بات تو نہیں کہی ہے نا.....!'' میں نے ایمی سے دریافت کیا۔

''نہیں..... بالکل نہیں۔'' ایمی نے سر ہلایا۔ ''تم نے سو فیصد درست کہا ہے۔ تم تو بہت پہنچے ہوئے معلوم ہوتے ہو۔''

''میں کرٹس کے بارے میں بھی بتا سکتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''ان کے ہاتھ کی لکیریں نظر آ رہی ہیں، اُس سے مجھے بہت کچھ معلوم ہو گیا ہے۔''

''میں نہ تو اپنے بارے میں تم سے کچھ معلوم کرنا چاہتا ہوں نہ ہی مجھے اس بات کا کوئی شوق ہے۔'' کرٹس نے تیز لہجے میں کہا۔

''لیکن اس میں حرج ہی کیا ہے ڈیئر!'' ایمی نے اُس کی طرف حیرت سے دیکھا۔ ''تم کس لئے خوفزدہ ہو رہے ہو؟''

''میں کیوں خوفزدہ ہونے لگا۔'' کرٹس نے سابقہ لہجے میں کہا۔ ''یہ سب فضول چیز ہے۔''

''معلوم نہیں کیوں تم اتنی سی بات پر ناراض ہو رہے ہو۔'' ایمی اُس سے بولی۔

''کیا یہ زیادہ بہتر نہیں ہوگا کہ ہم رمی کھیلیں؟'' کرٹس نے موضوع بدلا۔ ''کیا تم رمی کھیلنا پسند کرو گے؟''

''کیوں نہیں......'' میں نے کہا۔ ''رمی کھیل کیا تم پیسوں سے کھیلنا چاہتے ہو؟''

''ہاں......اس کے بغیر کھیل میں لطف نہیں آتا ہے۔'' کرٹس نے کہا۔ ''پیسہ ہی زندگی اور ہر کھیل میں حسن پیدا کرتا ہے۔''

''میرے خیال میں مسافروں کو سفر کے دوران جوا نہیں کھیلنا چاہئے۔ خاص کر دیارِ غیر میں۔'' میں نے کہا۔

''تم ٹھیک کہتے ہو۔'' ایمی نے میری تائید کی۔ ''پیسہ بہت احتیاط سے خرچ کرنا چاہئے۔''

''میرا خیال ہے کہ اگر میں ہزار روپے، تم بھی ہزار روپے ہار جاؤ تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔'' کرٹس نے ایمی سے کہا۔

''مگر میرے پاس رقم کہاں ہے؟ تم نے جو پاکستانی چار سو روپے دیئے، وہی میرے پاس موجود ہیں۔'' ایمی نے کہا۔

''ویسے جوا مجھے بالکل بھی پسند نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''آدمی کو اس سے بچنا چاہئے۔''

''میں تمہیں کھیلنے کے لئے رقم دے سکتا ہوں۔ تم انہیں کھیلنے کے لئے تیار کرلو۔'' کرٹس نے کہا۔

''تم اس کے باوجود رمی کھیلنا چاہتے ہو کہ تاش کا کھیل تمہیں کبھی راس نہیں آیا؟'' میں نے کہا۔

کرٹس بری طرح چونک گیا۔ ''یہ تم سے کس نے کہہ دیا؟'' وہ حیرت سے بولا۔

''تمہارے ہاتھ کی لکیریں بتا رہی ہیں...... جوئے کے کھیل میں تم نے باپ کا ورثہ جو حصے میں ملا تھا، ہار دیا۔''

''مگر لکیریں اتنا کچھ کیسے بتا سکتی ہیں؟'' کرٹس نے تکرار کی۔ ''تم یہ سب کچھ اندازے سے بتا رہے ہو۔''

''کیا میں نے جو کچھ کہا وہ غلط ہے؟ تم اس سے انکار کرتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''غلط تو نہیں ہے۔'' اُس نے بے بسی سے اقرار کیا۔ ''بعض اوقات آدمی کے اندازے درست ثابت ہوتے ہیں۔''

''اگر میں تم سے یہ دریافت کروں کہ تم پاکستان کی سیر و سیاحت کے لئے کس لئے آئے ہو تو بتانا پسند کرو گے؟''

''اس لئے کہ ہم دونوں کو ایشیا دیکھنے کا بہت شوق ہے۔'' ایمی نے کہا۔ ''اس لئے ہم پشاور گئے۔ وہاں سے سوات وغیرہ گئے...... اب سیدھے کراچی جا رہے ہیں۔ کراچی میں کچھ دن رہیں گے۔''

''جب تم دونوں سیر و سیاحت کے لئے آئے ہو تو لاہور کی سیر کیوں نہیں کی؟ تم دونوں کو لاہور اُترنا چاہئے تھا۔''

''اس لئے کہ مجھے جو چھٹی ملی ہے وہ ایک ہفتہ کے بعد ختم ہونے والی ہے۔'' کرٹس نے کہا۔ ''ہم دونوں نے سوات کی سیر و سیاحت اور تفریح میں زیادہ دن گزار دیئے۔ پشاور شہر سے افغانستان کی سرحد بھی چلے گئے تھے۔ افغانستان جانے کا پروگرام ملتوی کر دیا۔ پشاور میں دو تین دن قیام ہو گیا تھا۔''

''اب ہم لوگ کراچی سے لندن چلے جائیں گے۔ وہاں کچھ دن رُکنا چاہتے ہیں۔'' ایمی بولی۔

''لیکن میں بتا سکتا ہوں کہ کرٹس کس لئے پاکستان کی سیر و سیاحت کے لئے تمہیں لے کر آیا ہے؟'' میں نے ایمی سے کہا۔

''اس لئے پاکستان لے کر آیا ہے کہ یہ ایک خوبصورت اور ترقی پذیر ملک ہے۔'' ایمی نے جواب دیا۔

''کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ سیر و سیاحت ایک بہانہ ہے۔ اس کے پیچھے کوئی اور ہی جذبہ کارفرما ہے۔''

''تم کہنا کیا چاہتے ہو؟ کھل کر کہو......'' کرٹس نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''تم بدمزگی پیدا کیوں کر رہے ہو؟''

''تم اس لئے آئے ہو کہ یہاں سے ہیروئن اسمگل کر کے لندن لے جاؤ۔'' میں نے کہا۔ ''اور اُسے وہاں بیچ کر امریکہ چلے جاؤ۔''

''نہیں...... یہ بات نہیں ہے۔'' ایمی ہنس کر بولی۔ ''تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ تم غلط انداز سے سوچ رہے ہو۔''

''یہی بات ہے ایمی!'' میں نے تکرار کی۔ ''کرٹس پاکستان اسی لئے آیا ہے۔ سیر و سیاحت تو ایک بہانہ ہے۔''

''مجھے منشیات سے سخت نفرت ہے۔ میں منشیات فروشوں کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتی ہوں۔''

''بات یہ ہے کہ کرٹس نے تمہیں اس لئے اعتماد میں نہیں لیا ہے کہ تمہیں منشیات کی سمگلنگ اور منشیات فروشی سے سخت نفرت ہے۔ اس نے ایک ایسا منصوبہ بنایا ہے کہ ہیروئن کی سمگلنگ کی تمہارے فرشتوں کو بھی خبر نہ ہو۔''

''تم...... ایمی کو میرے خلاف بہکا رہے ہو۔ مجھ سے بدظن کر رہے ہو۔'' کرٹس بگڑ گیا۔

''مجھے اس سے کیا حاصل ہوگا؟'' میں نے کہا۔ ''تم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہو۔ اور پھر سیاح ہو، مسافر ہو۔''

''میں کرٹس کو بہت قریب سے جانتی ہوں۔ میرا دوست میرا محبوب ایسا ہرگز نہیں ہے۔'' وہ اعتماد سے بولی۔

''اگر ایسی بات ہے تو کرٹس سے پوچھو کہ وہ پشاور میں اتنے دن کس لئے ٹھہرا رہا؟''

''اسے کچھ زمرد خریدنے تھے جو سوات میں ملتے ہیں۔ اس لئے ہم وہاں ٹھہر گئے تھے۔''

''کیا زمرد ملے......؟'' میں نے کہا۔ ''کتنے زمرد کی خریداری کی؟''

''ایسا کوئی شخص نہیں ملا جو ہمیں زمرد ارزاں قیمت پر لا کر دے۔ لہٰذا ہم وہاں سے مایوس اور نامراد چلے۔''

''وہاں زمرد جیولری شاپس میں ارزاں قیمت پر مل جاتے ہیں۔ ان کا حصول مشکل نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اصل بات یہ ہے کہ کرٹس کو افضل خان نامی شخص کی تلاش تھی۔ اس کے ایک دوست نے اس کا نام پتہ دیا ہوا تھا۔ کرٹس کا دوست جانسن گزشتہ سال اُس سے پشاور میں مل چکا تھا۔ تین کلو ہیروئن خرید لی تھی۔ اُسے لندن میں فروخت کیا تھا۔ افضل خان چونکہ کابل گیا ہوا تھا اس لئے وہ اس کے انتظار میں پشاور ٹھہر گیا۔ پھر افضل خان سے ملاقات ہوئی۔ کرٹس نے اُس سے پانچ کلو ہیروئن کا سودا طے کیا۔ پانچ سو

ڈالر پیشگی رقم دی ہے۔ افضل خان دو دن کے بعد پانچ کلو ہیروئن نیومہران ہوٹل حیدر آباد میں پہنچائے گا۔ کرٹس نے روانگی سے قبل نیومہران ہوٹل میں کمرہ بک کرایا ہے۔ کمرہ نمبر دو سو دس ہے۔''

''تم پامسٹ ہو یا سراغ رساں؟'' کرٹس اُچھل پڑا۔ اُس کا چہرہ متغیر ہوگا۔ لیکن اُس نے فوراً ہی اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ پھر اُس نے مرتعش لہجے میں کہا۔ ''جھوٹ کا یہ پلندہ تم اپنے پاس رکھو! اپنی بکواس بند کرو۔''

''لیکن یہ جھوٹ نہیں ہے۔ تم نے کیسے کہہ دیا کہ یہ جھوٹ کا پلندہ ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''میں کہہ رہا ہوں۔'' وہ بڑی ڈھٹائی سے بولا۔ ''تم پاکستانیوں کی یہ بہت بری عادت ہے کہ ہر غیر ملکی سیاح کو شک کی نظروں سے دیکھتے ہو۔ تم لوگوں کے خیال میں ہر غیر ملکی سیاح پاکستان صرف ہیروئن کی خریداری کے لئے آتا ہے۔''

''یہ ایک حقیقت ہے کہ دس میں سے چھ سیاح اسی غرض سے اس ملک میں آتے ہیں۔ ہم تو مفت میں بدنام ہیں۔''

''یہ شخص صحیح تو کہہ رہا ہے کرٹس!'' ایمی حیرت آمیز لہجے میں کہنے لگی۔ ''اس کی کچھ باتیں صحیح تو ہیں؟''

''کیا خاک صحیح ہیں؟'' کرٹس جھلا گیا۔ ''تم بھی کس کی باتوں میں آ رہی ہو۔ جانے یہ کیا اول فول بک رہا ہے۔''

''ہوٹل میں افضل خان نامی شخص کا ٹیلی فون آیا تھا تو اُس سے میں نے بات کی تھی۔ اور پھر وہ تم سے ملنے کے لئے ہوٹل بھی آیا تھا۔ تم نے اُس سے لاؤنج میں جا کر بات کی تھی۔ تم نے مجھ سے یہ کہا تھا کہ اسے پانچ سو ڈالر ایڈوانس دے کر آیا ہوں۔ یہ بات بھی سچ ہے کہ تم نے حیدر آباد میں ہوٹل نیومہران میں کمرہ بک کرایا۔ اُس کا نمبر دو سو دس ہے۔''

''میں نے اُس سے زمرد کی خریداری کی ہے۔ اس کی مد میں اُسے پانچ سو ڈالر ایڈوانس دیئے۔'' کرٹس نے صفائی پیش کی۔ ''یہ شخص اس سودے کو غلط رنگ دے رہا ہے۔ ہم جو بھی کریں، اسے کیا؟''

''لیکن اسے یہ ساری باتیں کیونکر اور کیسے معلوم ہوئیں......؟'' ایمی نے حیرت سے پلکیں جھپکائیں۔

''میرے خیال میں یہ شخص پولیس کا مخبر ہے۔ ہمیں بلیک میل کر کے ہم سے رقم اینٹھنا چاہتا ہے۔'' کرٹس نے کہا۔

''کرٹس غلط بیانی سے کام لے رہا ہے ایمی!'' میں نے صاف گوئی سے کام لیا۔ ''زمرد کا سودا طے ہوا ہے تو حیدر آباد شہر اُترنے اور یہاں رُکنے کی کیا تک ہے؟ یہ کراچی کے ہوٹل میں اس لئے ٹھہرنا نہیں چاہتا کہ کہیں تم دونوں خفیہ پولیس والوں کی نظروں میں نہ آجاؤ۔ میں پولیس کا مخبر نہیں ہوں، ایک پامسٹ ہوں اور کچھ کچھ غیب کا حال بھی جانتا ہوں۔ تم لوگ بے فکر رہو! میں بلیک میل نہیں کروں گا اور نہ تم لوگوں سے رقم اینٹھوں گا۔ بلکہ میں تم لوگوں کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔''

''تم کوئی مدد نہیں کر رہے ہو بلکہ ہراساں کر رہے ہو جھوٹ بول کر۔'' کرٹس مجھے گھورنے لگا۔

''یہ کیا کوئی مدد کا طریقہ ہے کہ تم غلط بیانی کر رہے ہو؟'' ایمی نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''میں تمہیں کرٹس کا اصل چہرہ دکھاتا ہوں جو اب تک تمہارے سامنے نہیں آیا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ کرٹس تمہیں اپنے اخراجات پر ایشیا کی سیر و سیاحت کے لئے لے کر آیا ہے؟ اتنا خرچ یہ کس لئے کر رہا ہے، تم نے سوچا ہے؟''

''یہ اس لئے لے کر آیا ہے کہ میں اس کی دوست اور محبوبہ ہوں۔ میں دفتر میں اس کی ماتحت ہوں۔ لمبے سفر میں کوئی ساتھی ہو تو سفر میں بڑا لطف آتا ہے۔ اسے ایک ساتھی کی ضرورت تھی اس لئے مجھے سیر و سیاحت کرانے لے آیا ہے۔''

''نہیں...... اصل بات یہ نہیں ہے۔ کرٹس سے دریافت کرو کہ اصل بات کیا ہے۔'' میں نے کہا۔

''اصل بات وہی ہے جو ایمی کہہ رہی ہے...... آخر تم چاہتے کیا ہو؟ بکواس کیوں کئے جا رہے ہو؟'' کرٹس کا چہرہ تمتمانے لگا۔

''اصل بات یہ نہیں ہے۔'' میں نے تکرار کی۔ ''ایمی! میری بات غور سے سنو...... یہ تمہیں اپنے اخراجات پر اس لئے سیر و سیاحت کے لئے لایا ہے کہ تمہارے سامان میں تمہارے علم میں لائے بغیر ہیروئن سمگل کی جائے۔''

''یہ جھوٹ ہے...... سراسر بہتان ہے۔'' کرٹس ہذیانی لہجے میں چیخا۔ ''مسٹر! تم حد سے تجاوز کر رہے ہو۔''

''جھوٹ کیا ہے، سچ کیا ہے میں ابھی ثابت کئے دیتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''تمہارے پاس جو سوٹ کیس ہے وہ تمہارا اپنا ہے یا کرٹس کا دیا ہوا ہے......؟'' میں نے ایمی سے پوچھا۔

''کرٹس کا دیا ہوا ہے۔'' ایمی نے جواب دیا۔ ''لیکن اس کا جھوٹ سچ سے کیا تعلق ہے؟''

''بہت گہرا تعلق ہے۔'' میں کہنے لگا۔ ''کرٹس نے دو سوٹ کیس آرڈر دے کر مخصوص قسم کے بنوائے ہیں۔ ایک سوٹ کیس اس نے تمہیں دیا، دوسرا سوٹ کیس اس نے خود رکھا۔ ان دونوں سوٹ کیسوں کی تہ میں ہیروئن چھپانے کے لئے جگہ بنائی گئی ہے جو ہر کسی کی نظر میں نہیں آسکتی ہے۔ ایک سوٹ کیس میں ڈھائی سے پانچ کلو ہیروئن با آسانی چھپائی جا سکتی ہے۔ یہ سوٹ کیس اس کے دوست جانسن نے بنوا کر دیئے ہیں۔ گزشتہ سال جانسن پاکستان آیا تو اس کے پاس ایسا ہی سوٹ کیس تھا۔ وہ پانچ کلو ہیروئن اپنے سوٹ کیس کی تہ میں چھپا کر لایا۔ اگر تمہیں میری بات کا یقین نہیں آیا ہے تو اپنا سوٹ کیس کھول کر دکھاؤ۔ میں تمہیں وہ جگہ بتا سکتا ہوں۔ تم اس مہارت کو دیکھ کر عش عش کر اُٹھو گی۔''

کرٹس کا چہرہ دُھلی ہوئی چادر کی طرح سپید پڑ گیا۔ وہ بھونچکا سا ہو گیا۔ وہ میرے اس انکشاف پر دل ہی دل میں ششدر رہ گیا تھا کہ میں یہ سب کچھ کیسے جانتا ہوں۔ اور پھر میں نے اُسے ایک طرح سے دھوکے باز، فراڈی اور چال باز ثابت کیا تھا کیونکہ اس نے ایمی کو اپنے منصوبے سے بے خبر رکھا تھا، اُسے اپنے اعتماد میں نہیں لیا تھا۔ اور پھر اب وہ ایمی کی نظروں میں ہی نہیں اپنی نظروں میں بھی گر گیا تھا۔ اُس نے تو یہ سوچ رکھا تھا کہ ایمی کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں ہوگی، وہ اس کے سوٹ کیس میں ہیروئن چھپا کر لے جائے گا۔ پھر وہ لندن میں ہی یہ ہیروئن فروخت کر کے راتوں رات لکھ پتی بن جائے گا۔

ایمی نے میری باتیں بڑے غور اور کسی قدر حیرت سے سنی تھیں۔ وہ اس انکشاف پر حیران تھی۔ اُسے اس بات پر کرٹس پر غصہ آرہا تھا کہ کرٹس نے اسے اعتماد میں کیوں نہیں لیا؟ اُسے اپنے مفاد اور اپنی غرض کے لئے آلہ کار بنایا۔ جبکہ وہ کرٹس سے بے انتہا محبت

کرتی تھی۔ کرٹس نے اُس کے ساتھ جو کچھ کیا وہ اچھا نہیں تھا۔ اُسے فریب دیا اور سفر اور سیر و سیاحت کے دوران اُسے کھلونا بنائے رکھا۔ اس کے اعتماد اور جذبات کو بری طرح مجروح کیا۔

چند لمحوں تک اس طرح سے سکوت چھایا رہا جیسے کوئی طوفان آ کر گزر گیا ہو۔ دونوں اس طرح خاموش تھے جیسے اُن پر کوئی بجلی سی آ گری ہو۔ بے حس و حرکت بیٹھے سوچوں میں گم تھے۔ وہ مختلف سمتوں میں سوچ رہے تھے۔

اس گہرے سکوت کو امی نے توڑا۔ وہ کرٹس سے مخاطب ہوئی۔ ''ڈیئر! کیا یہ سچ ہے؟''

''مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ یہ شخص تمہارے حسن و شباب کا اسیر ہو گیا ہے۔ یہ ہم دونوں کو ایک دوسرے کے خلاف بدظن کر رہا ہے تاکہ تم اس کی جھولی میں جا گرو۔ اس نے بے پر کی اُڑائی ہے۔ تم اس کی باتوں پر کان نہ دھرو۔''

''اس نے سوٹ کیس کے بارے میں جو کچھ کہا ہے کیا وہ درست ہے؟'' امی کی آواز بکھری ہوئی تھی۔

''میری جان! ہر سوٹ کیس کی تہہ میں ایسی جگہیں ہوتی ہیں کہ رقمیں وغیرہ چھپائی جا سکیں۔ اس نے کوئی نئی بات نہیں کہی ہے۔''

''تم مجھے سچ سچ بتاؤ کہ کیا تم واقعی یہاں سے ہیروئن سمگل کر کے لے جانے آئے ہو؟'' امی نے ٹوٹے لہجے میں کہا۔

''تم جیسی ہیروئن ساتھ ہو تو کسی اور ہیروئن کو لے جانے سے کیا فائدہ؟'' کرٹس نے کہا۔ لیکن اُس کی آواز کھوکھلی تھی۔

''مجھے تمہاری ہیروئن اور محبوبہ سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''امی تمہاری دوست، محبوبہ اور ہمسفر ہے۔ چونکہ بات سے بات نکلی تھی اس لئے میں نے اصل حقیقت بیان کر دی۔ میرا مخلصانہ مشورہ تو یہ ہے کہ ہیروئن لے جانے کا خیال دل سے نکال دیں۔ کیونکہ نہ صرف کراچی ایئر پورٹ بلکہ لندن ایئر پورٹ پر بھی آج کل ایسے سیاحوں کے سامان کی سختی سے جانچ پڑتال کی جاتی ہے جو پاکستان سے ہو کر جاتے ہیں اور کراچی یا اسلام آباد سے ہوائی جہاز پر سوار ہوتے ہیں۔''

''تم اپنا اخلاص اپنے ساتھ رکھو!'' کرٹس نے ہذیانی لہجے میں کہا۔ ''تمہارے کسی

مشورے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''تم چاہو تو اپنے سوٹ کیس میں ہیروئن چھپا کر لے جاؤ۔'' امی افسردگی سے بولی۔ ''مگر میں تمہیں اپنے سوٹ کیس میں ہیروئن رکھنے نہیں دوں گی۔ میں جیل کی ہوا کھانا نہیں چاہتی۔ مجھے اس بات کا علم ہے کہ ہیروئن لاتے ہوئے جن مرد اور عورتوں کو پکڑ لیا جاتا ہے اُنہیں لمبی سزا ہو جاتی ہے۔ دس دس سال کی سزا...... مجھے دولت نہیں چاہئے۔ آزادی سے بڑھ کر کوئی دولت نہیں ہے۔ میں ایک پُرسکون اور سادہ سی زندگی گزارنا چاہتی ہوں۔ میرے سامنے میری ماں کی زندگی موجود ہے۔ اُسے دولت کی ہوس نے کہاں پہنچا دیا۔ وہ جیل میں سڑ رہی ہے۔ اُس نے ایک خط میں لکھا تھا کہ وہ اپنے کئے کی سزا پا رہی ہے۔ کتنا اچھا ہوتا وہ آرتھر کے جال میں نہیں پھنستی...... چارلس کو دھوکہ نہ دیتی۔ میں ناجائز اولاد نہ ہوتی۔''

''آخر تم اس قدر پریشان، ہراساں اور جذباتی کس لئے ہو رہی ہو؟'' کرٹس نے تیزی سے کہا۔ ''میں حیدر آباد میں تمہارا سامنا افضل خان سے کرا دوں گا۔ پھر تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ سچ کیا ہے، جھوٹ کیا ہے۔ میں نے اُس سے وہاں زمرد منگوائے ہیں۔''

''لیکن زمرد تم پشاور میں بھی خرید سکتے تھے۔ حیدر آباد میں کس لئے اُس سے وصول کر رہے ہو؟''

''اصل بات یہ ہے کہ یہ چوری کا مال ہوتا ہے۔ کچھ لوگ سوات سے زمرد چوری کر کے فروخت کرتے ہیں۔ وہاں خریدنے میں خطرہ بھی ہوتا ہے۔ اس لئے میں نے اُس سے کہا ہے کہ وہ زمرد حیدر آباد لا کر دے دے۔ زمرد وہاں لے جا کر فروخت کرنے میں بہت زیادہ مالی فائدہ ہو گا۔ نہ صرف سفر اور سیر و سیاحت کے اخراجات نکل آئیں گے بلکہ دو ایک لاکھ ڈالر تک مل جائیں گے۔''

''سچ ڈارلنگ!'' امی یکلخت خوش ہو کر بولی۔ اُس کا چہرہ دمک اُٹھا۔ ''پھر تو زمرد لے جانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔''

کرٹس اپنی نشست سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ پھر اُس نے اپنی دستی گھڑی میں وقت دیکھتے ہوئے کہا۔ ''گاڑی حیدر آباد پہنچنے میں پورے چالیس منٹ ہیں۔ میں نہا کر آتا ہوں، پھر تم نہا لینا۔'' یہ کہہ کر وہ ٹوائلٹ میں گھس گیا اور دروازہ بند کر لیا۔

"کیا تم نے جو کچھ بتایا وہ بالکل سچ ہے؟" امی نے میرا چہرہ اپنی نظروں کی گرفت میں لیتے ہوئے پوچھا۔

"سو فیصد سچ ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "کرٹس نے تم سے جھوٹ بولا ہے کہ اس نے افضل خان سے زمرد کا سودا کیا ہے۔"

"میں کرٹس کے ساتھ آئی ہوں۔ اور تمام اخراجات وہ برداشت کر رہا ہے۔ میں اس سے کسی وجہ سے الگ ہو جاتی ہوں تو میرے لئے مسئلہ یہ ہے کہ میں واپسی کے لئے رقم کہاں سے لاؤں؟ میں اُس کے رحم وکرم پر ہوں۔ میں نے اس کے کسی کام میں رخنہ اندازی کی تو وہ مجھے بیچ منجدھار میں چھوڑ کر جا سکتا ہے۔ میں اس کے ہمراہ خالی ہاتھ آئی ہوں۔" امی نے اُداسی سے کہا۔

"لیکن تم اُسے سمجھانے کی کوشش کرو۔" میں نے مشورہ دیا۔ "تم نے اس سے جو یہ کہا ہے کہ میں ہیروئن نہیں لے جاؤں گی تم چاہے لے جاؤ...... اس بات پر ڈٹے رہنا۔ کرٹس دولت کے حصول کے لئے اندھے جنون میں مبتلا ہو گیا ہے۔ اس پر کوئی مشورہ اور نصیحت کارگر ثابت نہ ہوگی۔ اس کا جنون اسی وقت ختم ہوگا جب وہ پکڑا جائے گا۔"

"لیکن میں نہیں چاہتی کہ کرٹس کسی مصیبت میں گرفتار ہو جائے۔ وہ پکڑ لیا جائے۔ اُس کے جنون کا کیا علاج ہے؟"

"میں نے کہا نا کہ اس کے جنون کا علاج اس کے ٹھوکر لگنے پر...... تاہم اسے تم پیار و محبت سے سمجھانے کی کوشش کرو۔"

"میں پوری کوشش کروں گی کہ اسے ہیروئن لے جانے سے باز رکھوں۔" امی نے ایک سرد آہ بھری۔

"خدا کرے تمہاری محبت جیت جائے۔" میں نے کہا۔ "حوصلہ نہیں ہارنا۔ اُمید پر دنیا قائم ہے۔"

"اچھا یہ بتاؤ کہ کیا واقعی ہاتھ کی لکیروں سے ماضی، خاندان اور نجی زندگی کے بارے میں سب کچھ معلوم ہو جاتا ہے؟"

"ہاں......" میں نے سر ہلایا۔ "دراصل یہ ایک وسیع علم ہے۔ صرف ہاتھ کی لکیروں سے ہی نہیں بلکہ ستاروں کی مدد سے بھی...... برجوں سے میرا براہِ راست رابطہ رہتا ہے۔

برج ایک طرح سے سیٹلائٹ ہیں۔ جو ایک انسان کے ماضی، حال اور مستقبل کے بارے میں بتاتے رہتے ہیں۔ اس لئے میں نے غیب دانی کا دعویٰ کیا ہے اور ہے بھی۔" میں اس کے علاوہ اُس سے کیا کہتا...... میں اُسے اصل حقیقت بتانے سے رہا تھا۔

"تم نے میری ماں، میرے باپ آرتھر اور چارلس کے بارے میں بتا کر مجھے بھونچکا کر دیا۔ تم نے یہ نام کیسے معلوم کر لئے؟ کیا غیب دانی سے نام بھی معلوم ہو جاتے ہیں؟" اُس نے بچگانہ انداز میں پوچھا۔

"میرا مشورہ تو یہ ہے کہ تم ان باتوں کے بارے میں یہ سب کچھ مت سوچو۔ کرٹس کو راہِ راست پر لانے کی تدبیر سوچو۔"

"کیا تم مجھے کرٹس کے بارے میں بتا سکتے ہو کہ وہ شادی کے بعد کیسا شوہر ثابت ہوگا؟"

"مجھے اس بات کا دُور دُور تک کوئی امکان نظر نہیں آتا ہے کہ وہ تم سے شادی کرے گا۔" میں نے بتایا۔

"وہ مجھ سے شادی کیوں نہیں کرے گا؟" امی چونک پڑی۔ "اُس نے مجھ سے کہا تھا کہ سیر وسیاحت سے واپسی کے فوراً بعد وہ مجھ سے شادی کر لے گا۔ اُس نے مجھ سے ایک بار نہیں، متعدد بار شادی کا وعدہ کیا ہے۔"

"تم نے اُس کی بات اور دعوے کا یقین کر لیا؟......" میں نے اُس کے چہرے پر نظریں مرکوز کر کے کہا۔

"کیوں نہیں کرتی...... وہ میری چاہت میں پاگل ہو چکا ہے۔ مجھ سے ایک دن بھی جدا نہیں رہ سکتا۔"

"تم مرد ذات کی فطرت سے واقف نہیں ہو۔" میں نے کہا۔ "یہ ایک انسانی فطرت ہے کہ جب وہ کسی چیز کو چاہے وہ کتنی ہی انمول اور قیمتی کیوں نہ ہو، جب وہ اسے پا لیتا ہے تو پھر اس کے نزدیک اس کی وہ وقعت اور قدر و قیمت نہیں رہتی جو پانے سے پہلے ہوتی ہے۔ اس طرح عورت بھی مرد کے لئے ایک انمول اور قیمتی شے کی مانند ہے۔ جب عورت اسے مل جاتی ہے، وہ اسے بستر کی زینت اور کھلونا بنا لیتا ہے تو پھر رفتہ رفتہ عورت اپنی کشش کھوتی جاتی ہے۔ ایسی عورت سے مرد کا دل جلد بھر جاتا ہے جو اس کی جھولی میں جا گرتی ہے۔ تمہاری بھی ایسی ہی مثال ہے۔ وہ تم سے جی بھر کے کھیل چکا ہے۔ اُس کے

دل میں کوئی حسرت اور خواہش نہیں رہی۔ ہاں، تم اُس سے شادی کر لیتیں تو پھر شاید تم اتنی بے وقعت نہیں ہوتیں۔''

اگر کرٹس ہیروئن لے جانے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو وہ تم سے شادی نہیں کرے گا۔ کیونکہ بے پناہ دولت ہاتھ آتے ہی تمہیں دودھ میں مکھی کی طرح نکال پھینکے گا۔ وہ جین سے شادی کر لے گا جو تمہارے دفتر میں باس کی سیکرٹری ہے۔ کامیابی نہ ہونے اور دولت نہ ملنے کے باعث شاید تم سے شادی کر لے۔ اچھا شوہر بھی ثابت ہو۔ اس لئے اس بات کی کوشش کرو کہ وہ ہیروئن لے جانے سے باز رہے۔ اس کے پاس بے پناہ دولت نہ آئے۔ دولت آدمی کا دماغ خراب کر دیتی ہے۔''

''تمہارا بہت بہت شکریہ۔'' وہ ممنونیت سے بولی۔ ''میں اپنی طرف سے حتیٰ الامکان کوشش کروں گی کہ وہ ہیروئن اسمگل نہ کر سکے۔'' پھر ایمی نے میرے پاس آ کر میرے رخسار پر صاف وشفاف بوسہ ثبت کر دیا جس میں کوئی میل نہیں تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد کرٹس نہا کر نکلا۔ اُس نے ہم دونوں کی طرف باری باری دیکھا۔ میں باہر جھانک رہا تھا اور ایمی آج کا انگریزی کا اخبار پڑھ رہی تھی جو کرٹس نے کسی سٹیشن سے خریدا تھا۔ کرٹس یہ دیکھ کر دل میں بہت خوش ہو گیا تھا۔

ایمی بھی نہانے کے لئے چلی گئی۔ اب میں اور کرٹس تنہا رہ گئے تھے۔ کرٹس نے میری طرف نفرت اور حقارت سے دیکھا اور اُس نے غصے سے کہا۔ ''تم نے ایمی کو میرے خلاف بھڑکا کر اچھا نہیں کیا...... میں تمہیں بخشوں گا نہیں۔''

''سنو کرٹس!'' میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ''میں تمہارے بارے میں اتنا کچھ جانتا ہوں کہ تم سوچ بھی نہیں سکتے ہو۔ تم کیوں اس کی زندگی خراب کر رہے ہو؟ کیوں اسے پھنسا رہے ہو؟ میں نے ایمی کو تمہارے بارے میں بہت ساری باتیں نہیں بتائی ہیں۔ اگر میں اسے بتا دوں تو وہ تمہارے منہ پر حقارت سے تھوک کر اور ذلیل کر کے چلی جائے گی۔ تمہیں چھوڑ دے گی۔''

''تم نے میرے بارے میں کون کون سی باتیں نہیں بتائی ہیں؟'' وہ بری طرح چونک گیا۔

''تم اس سے پہلے تین مرتبہ گزشتہ تین برسوں میں پاکستان ہیروئن لے جانے کے لئے تین لڑکیوں کے ساتھ آ چکے ہو۔'' میں نے کہا۔ ''تم نے انہیں بھی محبت کے نام پر زہر

دیا۔ انہیں سبز باغ دکھائے، دولت کا لالچ دیا، اُس کے سوٹ کیسوں میں ہیروئن چھپا دی...... اُن میں ایک کراچی ایئر پورٹ پر پکڑی گئی اور باقی لندن کے ایئر پورٹ پر...... وہ تینوں ابھی تک اپنی سزا بھگت رہی ہیں۔ تم اس لئے بچ گئے کہ تم نے اپنے سوٹ کیس میں ہیروئن نہیں رکھی تھی۔ اور تم نے ان تینوں لڑکیوں کو پہچاننے سے صاف انکار کر دیا تھا۔''

''تم...... تم جھوٹ بول رہے ہو۔'' وہ بولا تو اُس کی آواز ویران اور کھوکھلی ہو رہی تھی۔

''تم کہو تو میں ان تینوں لڑکیوں کے نام بتا سکتا ہوں۔ یہ بھی بتا سکتا ہوں کہ وہ کون تھیں؟ تم نے اُنہیں کیسے پھانسا تھا؟''

''اچھا......'' کرٹس نے چیلنج کے انداز میں کہا اور مجھے خشمگیں نظروں سے گھورنے لگا۔

''کراچی ایئر پرٹ پر پکڑی جانے والی لڑکی کا نام وکٹوریہ تھا۔'' میں بتانے لگا۔ ''وہ بیس برس کی لڑکی تھی۔ ایک شراب خانے میں ویٹرس تھی۔ وہ اپنے سوتیلے باپ اور ماں سے الگ رہتی تھی کیونکہ اُس کے سوتیلے باپ نے ایک روز اُس کی بے حرمتی کر دی تھی۔ اُس نے اس واقعے کا ذکر اپنی ماں سے نہیں کیا۔ کیونکہ اُس کی ماں ایک سیدھی سادھی اور دُکھی عورت تھی۔ امریکی معاشرے میں ایسی باتیں بہت عام ہیں۔ وہ بڑی تنگ دستی سے گزر بسر کر رہی تھی۔ جس شراب خانے میں وہ ویٹرس تھی وہاں بہت کم گاہک آتے تھے۔ تنخواہ اور ٹپ سے اُس کا گزارہ نہیں ہوتا تھا۔ ایک روز تم وہاں شراب پینے گئے تو وکٹوریہ کا حسن اور اُس کی جوانی تمہارے دل کو بھا گئی۔ تم نے اُس کے ساتھ مراسم بڑھائے جو محبت میں تبدیل ہو گئے۔ پھر وہ تمہارے ساتھ رہنے لگی۔ تم اُس کے ساتھ محبت اور فریب کا کھیل کھیلنے لگے۔ دراصل تم نے ایک منصوبے کے ساتھ اُس سے تعلقات اُستوار کئے تھے۔ پھر ایک روز تم نے اُس سے کہا کہ ہم کیوں نہ پاکستان چل کر ہیروئن لے آئیں۔ پانچ کلو ہیروئن سے کروڑ پتی بن جائیں گے۔ ففٹی ففٹی کر لیں گے۔ وکٹوریہ تیار ہو گئی۔ تم نے پانچ کلو اُس کے سوٹ کیس میں چھپا دی۔ اپنے پاس ایک اونس ہیروئن بھی نہیں رکھی۔ وہ غریب کراچی ایئر پورٹ پر دھر لی گئی۔

دوسری لڑکی کا نام جوزفین تھا۔ وہ بہت حسین تھی اور اپنی زندگی بھی حسین اور خواب ناک گزارنا چاہتی تھی۔ وہ تمہارے دفتر ایشیا ٹور کے بارے میں معلومات حاصل کرنے آئی تھی۔ اُس نے اپنے باس کے بوڑھے دوست کو سیر وسیاحت کرانے کے لئے پھانسا تھا

لیکن عین وقت اُس بوڑھے نے اپنا پروگرام ملتوی کر دیا۔ پھر تم نے جوزفین کے سامنے سیر و سیاحت کی تجویز رکھی تو وہ فوراً تیار ہو گئی۔ تم نے اُس کے ساتھ جی بھر کے وقت گزارا۔ اُس کے علم میں لائے بغیر اُس کے سوٹ کیس میں ہیروئن چھپا دی۔ وہ لندن ایئر پورٹ پر دھر لی گئی۔

تیسری عورت کا نام اینا تھا۔ یہ روسی نژاد تھی۔ اُس نے دو شادیاں کی تھیں جو ناکام ہو چکی تھیں۔ اُس کا تیسرا شوہر تمہارا ایک دوست جیمز تھا۔ جیمز شرابی اور کبابی تھا۔ طوائفوں کا رسیا تھا۔ تم نے اُن کی تلخ ازدواجی زندگی سے فائدہ اُٹھا کر اینا سے تعلقات اُستوار کیے، شادی کا فریب دیا۔ اینا نے اپنے تیسرے شوہر سے طلاق لے لی۔ تم نے اینا سے کہا کہ کیوں نہ ہم شادی کے بغیر ہی ہنی مون ایشیا میں منائیں۔ اینا تیار ہو گئی۔ تم نے اُس کے ساتھ بھی وہی کیا جو وکٹوریہ اور جوزفین کے ساتھ کر چکے تھے۔ تم نے اُس کے سوٹ کیس میں ہیروئن چھپا دی تھی۔ تمہارا خیال تھا کہ شاید بچ جائیں۔ لیکن اینا پکڑی گئی اور تم نے اپنا دامن بچا لیا۔''

کرٹس کی حالت ایک مُردے سے بھی بدتر ہو رہی تھی۔ اُس کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔ لہو کی ایک بوند بھی نہیں رہی تھی۔ وہ بھونچکا ہو کر رہ گیا تھا اور دل میں سخت حیران ہو رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ...... یہ شخص تو شیطان ہے۔ اس کے بارے میں ایک ایک بات جانتا ہے۔ بے حد خطرناک ہے۔ اس نے اتنا کچھ کیسے اور کس سے معلوم کر لیا؟

''سنو کرٹس!'' میں نے اُسے تنبیہ کے انداز میں مخاطب کیا۔ ''تم نے جو کچھ کیا وہ اچھا نہیں کیا...... لیکن میں تمہیں ایمی کے ساتھ ایسا کرنے نہیں دُوں گا۔ میں تمہارے بارے میں اور ایمی کے بارے میں لندن ایئر پورٹ کے کسٹم اور امیگریشن والوں کو اطلاع دے دُوں گا۔ تمہارے ماضی کے بارے میں بتا دُوں گا۔ وہ تینوں عورتیں تمہارے خلاف گواہی دیں گے۔ پھر تم قانون کے ہاتھوں سے بچ نہیں سکو گے۔ لہٰذا جب تم حیدر آباد میں افضل خان سے ملو تو اُس سے معذرت کر لینا اور کوئی مجبوری ظاہر کر دینا۔ افضل خان ایڈوانس رقم نہیں دے گا۔ اس رقم پر لعنت بھیجو اور بغیر ہیروئن کے تم ایمی کے ساتھ واپس چلے جاؤ۔ اُس سے شادی کر کے باعزت زندگی گزارو۔ اپنے گناہوں کی تلافی کرو۔ ایمی ایک اچھی بیوی ثابت ہو گی کیونکہ وہ ایک دُکھی عورت ہے۔ دُکھی عورت ایک اچھی ہمسفر ثابت ہوتی

ہے۔ وہ شوہر پرست ثابت ہوتی ہے۔''

کرٹس نے برتھ کے نیچے سے اپنا سوٹ کیس نکالا۔ اُس نے میری بات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا لیکن وہ اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ اُس کی رگوں میں لہو اُبلنے لگا تھا۔ اُس کی آنکھیں انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔ میں نے اُس کے چہرے اور دماغ سے بہت کچھ بھانپ لیا۔ جب وہ اپنے سوٹ کیس کا تالا کھولنے لگا تو میں نے اُس سے کہا۔

''کرٹس! کیا تم مجھے قتل کرنے کے لئے پستول نکال رہے ہو؟''

وہ میری بات سن کر بڑے زور سے اُچھلا جیسے اُسے برقی جھٹکا لگا ہو۔ اُس نے چشم زدن میں پستول نکال لیا اور مجھے نشانے کی زد میں لے کر غرایا۔ ''ہاں...... میں تمہیں قتل کر دُوں گا۔ تم سانپ ہو جو مجھے ڈس لینا چاہتے ہو۔ میں تمہارا سر کچل دُوں گا۔''

''کیا تم مجھے قتل کر کے قانون کے ہاتھوں سے بچ جاؤ گے؟'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''میں تمہیں شوٹ کر کے تمہاری لاش چلتی گاڑی سے پھینک دُوں گا۔ کسی کو پتہ بھی نہیں چلے گا۔'' اُس نے کہا۔

''یہ تمہاری بھول ہے۔ نفرت اور غصے کی کیفیت میں تمہیں کچھ سجھائی نہیں دے رہا ہے۔ تم نے بہت سارے پہلوؤں کے بارے میں کچھ نہیں سوچا۔ میرے قتل اور میری موت کی عینی گواہ پہلے ایمی ہو گی۔'' میں نے کہا۔

''ایمی کو میں سمجھا لوں گا...... اُسے اپنے اعتماد میں لے لوں گا۔ کیونکہ وہ میرے رحم و کرم پر ہے۔'' کرٹس غرایا۔

''لیکن اِن سینکڑوں عینی گواہوں کو کیسے سمجھاؤ گے...... اُن کی آنکھوں میں کیسے دُھول جھونکو گے؟'' میں نے کہا۔

''کون سے سینکڑوں عینی گواہ......؟'' کرٹس نے اُلجھتے ہوئے پوچھا۔ ''تم مجھے بے وقوف بنا رہے ہو؟''

''جب تم مجھے قتل کر کے میری لاش چلتی گاڑی سے پھینکو گے تو کیا تب دوسرے ڈبوں میں بیٹھے ہوئے لوگ میری لاش کو گرتے ہوئے نہیں دیکھیں گے......؟'' میں نے اُس کے چہرے پر نظریں مرکوز کر کے جواب دیا۔

''اوہ...... میں نے تو اس کے بارے میں سوچا نہیں تھا۔ اچھا کیا تم نے مجھے بتا دیا۔'' کرٹس نے استہزائی لہجے میں کہا۔ ''میں اور طریقہ اختیار کروں گا جس سے کسی کو معلوم بھی نہیں ہوگا کہ میں نے تمہیں قتل کر دیا ہے۔''

''تم کچھ بھی کہہ لو، کوئی بھی منصوبہ کیوں نہ بنا لو، تم قانون کے ہاتھوں سے بچ نہ سکو گے۔''

''میں تمہیں قتل کر کے تمہاری لاش ٹوائلٹ میں ڈال دوں گا۔ پھر پولیس کو کبھی میرا سراغ نہ مل سکے گا'' وہ طنزیہ انداز میں ہنسا۔

''تم بالکل بچوں جیسی باتیں کر رہے ہو......'' میں نے کہا۔ ''اس ڈبے کے باہر ایک پرچہ چپکا ہوا ہے جس میں مسافروں کا نام لکھا ہوا ہے۔ تم نے پشاور سے ٹکٹ بک کرائے ہیں۔ ریلوے بکنگ آفس میں تمہارا اور ایمی کا نام، شہریت اور پاسپورٹ کے نمبر بھی درج ہیں۔ تمہیں حیدر آباد میں نہیں تو ایئر پورٹ پر ہی دھر لیا جائے گا۔ اور پھر تم پر غیر قانونی اسلحہ رکھنے پر مقدمہ چلایا جائے گا۔ تم نے یہ پستول افضل خان سے خریدا ہے۔ اس وقت تم غیر قانونی اور بلا لائسنس پستول رکھنے کے مجرم ہو۔''

کرٹس کی پیشانی عرق آلود ہوگئی۔ وہ نروس نظر آنے لگا۔ اُسی وقت ایمی غسل خانے سے باہر آئی۔ نہانے سے اُس کا حسن اور نکھر گیا تھا۔ وہ کرٹس کے ہاتھ میں پستول دیکھ کر بڑے زور سے چونکی۔

''کرٹس!......'' ایمی نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔ ''یہ سب کیا ہے؟ تمہارے پاس پستول کہاں سے آیا؟''

''کرٹس مجھے قتل کرنا چاہتا ہے۔ کیونکہ میں نے اس کا اصلی چہرہ جو بے نقاب کیا ہے۔'' میں نے کہا۔

''یو فول......!'' ایمی یکلخت بگڑ کر برہمی سے بولی۔ ''کیا تم سٹھیا گئے ہو؟ یہ کیا حماقت کر رہے ہو؟''

کرٹس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اُس نے پستول سوٹ کیس میں رکھ لیا۔ میں نے باہر جھانکتے ہوئے کہا۔ ''حیدر آباد کا اسٹیشن آ رہا ہے۔''

ان دونوں نے فوراً اپنا سامان سمیٹنا شروع کیا۔ تھوڑی دیر کے بعد گاڑی اسٹیشن پر رُکی

تو کرٹس نے ایک قلی بلا کر سامان اُس کے حوالے کیا، پھر وہ قلی کے ساتھ تیزی سے اُتر گیا۔ اُس نے میری طرف دیکھنا اور الوداع کہنا تک گوارہ نہیں کیا۔ ایمی نے رخصت ہونے سے قبل مجھ سے گرمجوشی سے ہاتھ ملایا، ممنون نظروں سے دیکھا۔ میرا ایک طویل اور ہزوش بوسہ لے کر گڈ بائی کہتی ہوئی اُتر گئی۔ میں دروازے پر کھڑا اُن دونوں کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ ایمی جب تک نظروں سے اوجھل نہیں ہوئی، وہ مُڑ مُڑ کے مجھے دیکھتی اور ہاتھ ہلاتی رہی۔ جب وہ دونوں نظروں سے اوجھل ہو گئے، میں دروازہ بند کر کے اپنی برتھ پر آ کر لیٹ گیا۔ گاڑی کی روانگی میں تھوڑی دیر باقی تھی۔ میری آنکھ فوراً ہی لگ گئی اور میں گہری نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

میں نے نیند میں محسوس کیا کہ کوئی میرے بالوں کو پکڑ کر کھینچ رہا ہے اور مجھے لاتیں مار رہا ہے۔ جب میں نے بیدار ہو کر دیکھا تو بڑا حیران ہوا...... میں فرش پر پڑا ہوا تھا۔ مجھ پر پولیس کا ایک سپاہی جھکا ہوا تھا۔ وہی میرے سر کے بال پکڑ کر کھینچ رہا اور لاتیں مار رہا تھا۔ گالیاں بک رہا تھا۔ ''اُٹھ بے حرام زادے.... ایسے سو رہا ہے جیسے یہ تیرے باپ کا کمپارٹمنٹ ہے۔''

میں فوراً ہی اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُس نے جس انداز سے مخاطب کیا اور گالیاں بکیں اس نے میرا خون کھولا دیا تھا۔ یہ پولیس کا سپاہی تھا۔ اُسے اُس کے ماں باپ نے اور پولیس کے محکمے نے شاید یہی زبان سکھائی تھی۔ انہیں تو شائستگی اور تہذیب چھو کر بھی نہیں گئی تھی۔ ان کے نزدیک آدمی، گھوڑا، گدھا اور حیوان ایک ہی تھے۔ میں شاید اُس کی خبر لیتا، لیکن چھ سات اور پولیس والے موجود تھے۔ اُن کا افسر سب انسپکٹر بھی تھا۔ کچھ اور لوگ بھی موجود تھے۔ غسل خانے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ پولیس کے دو افسر اندر کھڑے ہوئے تھے۔

پھر میں نے اُن کے ذہنوں سے معلوم کر لیا کہ بات کیا ہے۔ غسل خانے میں ایک بیس برس کی خوبرو لڑکی کی برہنہ لاش پڑی تھی جس کی اجتماعی بے حرمتی کے بعد گلا گھونٹ کر قتل کر دیا گیا تھا۔ ایک قلی سامان لینے اندر گیا تو اُس نے مجھے فرش پر پڑا اور غسل خانے کا دروازہ کھلا دیکھا۔ اُس نے غسل خانے میں جھانکا تو اُسے لڑکی کی برہنہ لاش نظر آئی۔ پھر اُس نے فوراً ہی پولیس کو خبر کی۔ وہ قلی بھی ایک طرف خاموش کھڑا ہوا تھا۔ پولیس نے اُس کا بیان لینے کے لئے اُسے روک رکھا تھا۔

میں نے اپنی برتھ کی طرف دیکھا۔ نہ صرف میرا بستر بلکہ بریف کیس اور سوٹ کیس بھی غائب تھا۔ میرے تن پر جو کپڑے اور رقم تھی، وہی میرا سب کچھ تھا۔ ایک لحاظ سے یہ میرا اثاثہ تھا۔ میری دستی گھڑی بھی کلائی پر نہ تھی۔ وہ ننگی پڑی تھی۔ کچھ بدمعاش تھے شاید جو میرے کوپے میں گھس آئے اور ایک لڑکی کو اغواء کر لائے، اُسے درندگی کا نشانہ بنانے کے بعد اُسے موت کا نشانہ بنا کر اُس کی لاش غسل خانے میں ڈال گئے۔ اُن بدمعاشوں نے شاید لڑکی کو اس لئے قتل کر دیا ہوگا کہ وہ انہیں جانتی ہوگی۔ پھر وہ بدمعاش میرا سارا سامان چرا کر لے گئے۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ اُنہوں نے میری جیب سے رقم نہیں نکالی۔ مجھے سر میں دھمک سی محسوس ہو رہی تھی۔ شاید وہ کلوروفارم کا اثر تھا۔ اُن بدمعاشوں نے مجھے نیند کی حالت میں کلوروفارم سونگھا کر بڑے سکون واطمینان سے اپنی کارروائی کی تھی۔

سب انسپکٹر نے مجھے اپنے پاس بلا کر پوچھا۔ ''یہ لڑکی کون ہے؟ کیا نام ہے اس کا؟''

''کون سی لڑکی جناب؟'' میں نے جواب دیا۔ ''میں کسی لڑکی کو نہیں جانتا۔''

''یہ لڑکی......'' سب انسپکٹر نے میرا بازو پکڑ کے کھینچا اور غسل خانے کی دہلیز پر لے جا کر کھڑا کر دیا۔

میں نے جو کچھ معلوم کیا تھا وہ پولیس والوں کے ذہن سے...... اب میں نے مقتولہ کو دیکھا جو فرش پر برہنہ حالت میں پڑی تھی۔ اُس کا لباس نہ تو کوپے میں تھا اور نہ ہی غسل خانے میں...... بدمعاش اُس کا لباس اور چپل بھی لے گئے تھے۔ اُس کی عمر بیس برس ہوگی۔ نکلتے ہوئے قد کی تھی۔ اُس کے بال گردن تک نفاست سے ترشے ہوئے تھے۔ اُس کے ہاتھ اور پیر کی اُنگلیوں کے ناخنوں میں نیل پالش لگی ہوئی تھی۔ وہ گوری رنگت کی تھی۔ بہت حسین تھی۔ اُس کے چہرے کے خدوخال بھی بڑے تیکھے تھے۔ اُس کا جسم چھریرا، متناسب تھا جس سے اُس کا جسم بہت ہی پُرکشش لگ رہا تھا۔

''تم اسے اس طرح دیکھ رہے ہو جیسے پہلی بار دیکھ رہے ہو۔'' سب انسپکٹر نے ہاتھ بڑھا کر میرا بازو پکڑا اور مجھے ہٹا دیا۔

''جی ہاں...... میں اسے پہلی بار ہی دیکھ رہا ہوں۔ میں اسے بالکل بھی نہیں جانتا۔'' میں نے کہا۔

''تم جھوٹ بول رہے ہو۔'' سب انسپکٹر برہم ہو گیا۔ ''مجھے بیوقوف بنانے کی کوشش

مت کرو۔''

''مجھے جھوٹ بولنے اور آپ کو بیوقوف بنانے کی کیا ضرورت ہے؟'' میں نے کہا۔ ''میں واقعی اسے نہیں جانتا ہوں۔''

''اچھا یہ بتاؤ کہ تم لوگ کل کتنے آدمی تھے؟'' اُس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

''کون سے آدمی، کیسے آدمی......؟'' میں نے جواب دیا۔ ''میں اکیلا ہی ہوں۔ حیدر آباد سے اکیلا آ رہا ہوں۔ پشاور سے حیدر آباد تک دو غیر ملکی سیاح جن میں ایک عورت اور ایک مرد تھا وہ میرے ہم سفر تھے۔ اس کے بعد میں اکیلا سفر کر رہا تھا۔''

''تو گویا یہ لڑکی حیدر آباد سے سوار ہوئی تھی۔ پھر تم اور تمہارے ساتھیوں نے مل کر اسے بے حرمتی کا نشانہ بنایا۔''

''مجھے کچھ پتہ نہیں۔ کیونکہ اُن غیر ملکی سیاحوں کے حیدر آباد اسٹیشن پر اُتر جانے کے بعد میں اپنی برتھ پر جا کر لیٹ گیا تھا۔ پھر میری آنکھ لگ گئی۔''

''اصل بات یہ نہیں ہے۔'' سب انسپکٹر کہنے لگا۔ ''اصل بات کیا ہے میں بتاتا ہوں۔ تم یا تمہارے ساتھیوں نے مل کر مقتولہ کو اغوا کیا یا اسے بہلا پھسلا کر اس خالی کوپے میں لے آئے، اسے اجتماعی طور پر زیادتی کا نشانہ بنایا۔ جب گاڑی کسی اسٹیشن پر رُکنے لگی تو تمہارے ساتھی اُتر گئے لیکن تم عجلت کے باعث فرش پر گر کر بے ہوش ہو گئے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ تمہارے پاس کوئی سامان نہیں ہے۔''

سب انسپکٹر نے بڑی خوبصورت کہانی گھڑ لی تھی یا اُس نے قیاس کر لیا تھا۔ پولیس کا کام ہی کیا ہے، بے گناہوں کو کسی نہ کسی بہانے قانون کے شکنجے میں اس طرح سے کسنا کہ وہ نکل نہ سکے، جیسے اُس نے مجھے کس لیا تھا۔

''سر! آپ کی بات میں کوئی صداقت نہیں ہے۔'' میں نے جرأت کر کے کہا۔ ''میرا سارا سامان چوری ہو گیا ہے۔ نامعلوم درندوں نے نہ صرف اس کی عزت تباہ کر دی بلکہ میرا سامان بھی چوری کر کے لے گئے۔ لڑکی کا لباس تک بھی نظر نہیں آ رہا ہے۔''

''میری بات میں صداقت ہے یا نہیں، یہ تو تمہیں تھانے پہنچ کر پتہ چلے گا۔'' سب انسپکٹر نے استہزائی لہجے میں کہا۔ ''تم پشاور سے آ رہے ہو تو اپنا ٹکٹ اور شناختی کارڈ دکھاؤ!''

''ٹکٹ میں نے اپنے بریف کیس میں رکھا ہوا تھا۔ بریف کیس بدمعاش اپنے ساتھ لے گئے۔'' میں نے کہا۔ ''شناختی کارڈ بھی اُسی میں تھا۔''

''تم جھوٹ بول کر ہماری آنکھوں میں دُھول جھونکنا چاہتے ہو؟'' سب انسپکٹر کے ماتحت نے مجھے لتاڑا۔ ''سر کی بات بالکل صحیح ہے۔ بلکہ میرا خیال تو یہ ہے کہ تم نے سب سے آخر میں اس لڑکی کو بے عزت کیا ہوگا۔ پھر تم نے اس کا گلہ گھونٹا ہوگا تا کہ یہ بے ہوش ہو جائے اور جب تم گاڑی سے اُترنے لگو تو شور نہ مچا دے، زنجیر نہ کھینچ دے۔ اس کے کپڑے بھی اسی لئے باہر پھینک دیئے گئے کہ وہ تعاقب میں شور مچاتی ہوئی نہ آ جائے۔ جب تم نے دیکھا کہ لڑکی مرگئی ہے تو تم خوف و دہشت سے بے ہوش ہو گئے۔ اس لڑکی کو بے عزت کرنے میں تم بھی شریک ہو اور اس کی موت کے ذمہ دار بھی تم ہو۔''

یہ اور سب انسپکٹر دُور کی کوڑی لائے تھے، میں کیا کہہ سکتا تھا؟ سب انسپکٹر نے اُس کی بات سن کر کہا۔ ''مجھے تمہارے خیال سے بھی اتفاق ہے۔ قتل کا اصل مجرم یہی شخص ہے، اس کے ساتھی نہیں جو فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔''

''سر! آپ میری بات غور سے سنیں اور اسے سمجھنے کی کوشش کریں۔ مجھے بھی صفائی کا موقع دیں۔'' میں نے سب انسپکٹر سے مؤدبانہ لہجے میں کہا۔ ''آپ جو قیاس آرائیاں چاہیں کرلیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں نے نہ تو اس لڑکی کو بے عزت کیا اور نہ ہی اس کا گلا گھونٹ کر ہلاک کیا ہے، نہ میں اسے ورغلا کر لایا ہوں اور نہ ہی اسے جانتا ہوں، نہ میرے کوئی ساتھی تھے۔ آپ کے ماتحت کی قیاس آرائی بھی بے بنیاد ہے۔ میرا قیمتی سامان چوری ہو گیا، آپ اس کا نوٹس نہیں لے رہے ہیں۔''

''سر! یہ بکواس کئے جا رہا ہے اور ہماری باتوں کو فضول اور بکواس قرار دے رہا ہے۔'' ماتحت نے کہا۔

''کریم بخش!'' سب انسپکٹر نے اُس سپاہی کو مخاطب کیا جو غسل خانے کے پاس کھڑا لڑکی کی لاش کو دیکھنے میں محو تھا۔ ''تم اکمل چوہدری، اعوان اور نذیر آرائیں ملزم کو تھانے لے کر چلو۔ میں کارروائی مکمل کروا کر آ رہا ہوں۔ دیکھو اسے فرار ہونے کا موقع نہیں دینا۔ یہ بہت تیز اور چالاک چیز لگ رہا ہے۔ اس نے فرار ہونے کی کوشش کی تو اسے بلا تامل گولی مار دینا۔ اگر یہ فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا تو ایس ایچ او صاحب تم لوگوں کی

کھال ادھیڑ دیں گے۔ تم سب کی شامت آ جائے گی۔''

مجھے چاروں مسلح سپاہیوں نے اس طرح پکڑ لیا جیسے میں کوئی قربانی کا بیل ہوں۔ کہیں رسّی تڑوا کر نہ بھاگ جاؤں۔ پھر وہ مجھے ڈبے سے باہر لے آئے۔ ڈبے کے سامنے پلیٹ فارم پر بہت سارے سپاہی کھڑے ہوئے تھے اور ایک بھیڑ سی لگی ہوئی تھی۔ ہر شخص ایک دوسرے سے پوچھ رہا تھا کہ کیا ہوا......؟ مجھے یہ لوگ بڑی بے رحمی سے کھینچتے ہوئے، میری قمیض کا کالر اور بال پکڑ کر بھیڑ کو چیرتے ہوئے ریلوے سٹیشن کی عمارت سے باہر لائے۔ باہر ایک پولیس کی موبائل کھڑی تھی، مجھے اُس میں سوار کرا دیا گیا۔

میں ایک بہت بڑی مصیبت میں پھنس گیا تھا۔ میں یہ بات بہت اچھی طرح جانتا تھا کہ پولیس مجھے درندہ اور قاتل ثابت کرنے میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھے گی۔ بے گناہوں کو مجرم اور قاتل قرار دینا اور ثابت کرنا اس کے لئے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ ان سے انصاف، رحم اور انسانیت کی توقع رکھنا فضول تھا۔ کالی بھیڑوں نے اس محکمے کو بدنام اور لوگوں کی نظروں میں گرا کر رکھ دیا تھا۔ میں خاموش بیٹھا اپنے بچاؤ کی تدبیریں سوچنے لگا۔ موبائل تیزی سے جا رہی تھی لیکن راستے میں اس قدر ٹریفک تھا کہ اسے کہیں کہیں رُکنا پڑ رہا تھا۔

میں موبائل میں مسلح سپاہیوں کے درمیان بیٹھا ہوا تھا۔ یہ خوشی کی بات تھی کہ اُنہوں نے میرے ہاتھوں میں ہتھکڑی نہیں ڈالی تھی۔ لیکن مجھے اس بات کی ذرہ برابر بھی توقع نہیں تھی کہ میں فرار ہونے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ لیکن میں نے حوصلہ نہیں ہارا تھا۔ میں نے دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ کچھ بھی ہو، مجھے فرار ہونے کی ہر قیمت پر کوشش کرنی ہے ورنہ یہ مجھے پھانسی پر لٹکا دیں گے۔

''تم ایسے سنگ دل اور درندہ صفت دکھائی نہیں دیتے ہو۔'' ایک سپاہی نے کہا۔ ''آخر تمہیں کیا ضرورت تھی اُسے قتل کرنے کی؟''

''لڑکی بھی کیا چیز تھی......!'' دوسرے سپاہی نے کہا۔ ''اُسے دیکھ کر میری رال ٹپک پڑی تھی۔ میں ہوتا تو اُسے قتل نہیں کرتا۔''

''تم نے بہت اُونچا ہاتھ مارا......'' تیسرے سپاہی نے کہا۔ ''ایسی حسین لڑکیاں تو قسمت والوں کو ملتی ہیں۔ تمہارے مزے ہو گئے۔ کاش! مجھے ایسی لڑکی مل جاتی...... سالی کو دو مہینے تک رکھتا۔ اُسے قتل نہیں کرتا۔''

مجھے اُن کی بیہودہ گفتگو پر کوئی دُکھ اور حیرت نہیں ہوئی۔ اُن کی سطحی ذہنیت کا صرف ماتم کیا جا سکتا تھا۔ مجھ سے رہا نہیں گیا۔ میں نے کہا۔ ''تم لوگ یقین کرو! میں نے اُسے قتل نہیں کیا، نہ میں نے اُس کی شکل دیکھی اور نہ میں نے اُسے بے عزت کیا...... مجھے بلا وجہ پھانسا گیا ہے۔ میں بالکل بے قصور ہوں۔ میری کوئی بات سن رہا ہے اور نہ سمجھ رہا ہے۔''

''ہر مجرم یہی کہتا ہے کہ اس نے یہ جرم نہیں کیا۔ قتل نہیں کیا ہے۔ وہ بے قصور ہے۔'' کریم بخش نے تمسخر سے کہا۔

''میں کس طرح سے آپ لوگوں کو یقین دلاؤں اور ثابت کروں کہ میں بے قصور ہوں؟'' میں نے کہا۔

''تھانے چل کر جب تمہاری مزاج پرسی کی جائے گی تب تم خود اپنی زبان سے اپنے جرم کا اقرار کر لوگے......'' پہلے سپاہی نے کہا۔

''تمہارے خلاف سارے شواہد موجود ہیں۔ تم اب پھانسی چڑھنے سے بچ نہیں سکتے ہو۔'' دوسرے نے کہا۔

''میرے خلاف ایک بھی ٹھوس ثبوت نہیں ہے۔ وہ شواہد نہیں، صرف قیاس آرائیاں ہیں۔ میں نے کہا۔

''یہاں تمہارے کہنے سے کیا ہوتا ہے؟'' دوسرے سپاہی نے کہا۔ ''عدالت میں تم اپنے آپ کو بے گناہ ثابت کر دو گے تو تمہیں رہائی نصیب ہو جائے گی...... ہمارا جو کام ہے، وہ ہم کریں گے۔ تمہیں پھانسی کے پھندے تک پہنچانے کی کوشش کریں گے۔''

''یہ لونڈیا کون تھی......؟'' تیسرے سپاہی نے کہا۔ ''تمہاری رشتہ دار؟ ہم جماعت؟ یا دفتر میں کام کرتی تھی؟ اس کی لاش دیکھ کر تمہاری خوش نصیبی پر بڑا رشک آیا۔ میں سوچ رہا ہوں کہ اب مجھے شادی کر لینی چاہئے۔''

اسی اثنا میں گاڑی تھانے کے وسیع وعریض احاطے میں داخل ہوئی۔ جب گاڑی وہاں رُکی تو میں بھی اُتر آیا، بلکہ مجھے قربانی کے جانور کی طرح گاڑی سے اُتارا گیا۔ ایک مسجد بھی جو اس احاطے کے کونے میں تھی۔ استنجا خانہ بھی ایک طرف تھا جس کا راستہ اندر اور باہر سے تھا۔ لمبا چوڑا برآمدہ بھی تھا۔ وہاں پولیس کی گاڑیوں کے علاوہ دو تین پرائیویٹ گاڑیاں بھی کھڑی تھیں۔

مجھے انسپکٹر کے کمرے میں لے جایا گیا۔ صرف کریم بخش مجھے اندر لے گیا، دوسرے سپاہی برآمدے میں کھڑے رہ گئے یا کسی اور سمت چلے گئے۔ انسپکٹر صاحب کرسی میں دھنسے ہوئے سینڈوچز کھا رہے تھے۔ اُن کی میز پر سامنے گرم گرم چائے رکھی تھی۔ کریم بخش نے اُنہیں سلام کیا، پھر اُس نے انسپکٹر صاحب کو تفصیلی رپورٹ پیش کی۔

''مجھے موبائل پر رشید اعوان نے اطلاع کیوں نہیں دی؟'' انسپکٹر صاحب چونک کر بولے۔

''سر! انہوں نے آپ سے رابطہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ آپ کا موبائل شاید بند تھا۔'' کریم بخش نے کہا۔

''کیا اُس لڑکی کی لاش غسل خانے میں پڑی ہے یا وہاں سے اُٹھا دی گئی ہے؟'' انسپکٹر صاحب نے دریافت کیا۔

''جب میں ملزم کو لے کر وہاں سے نکلا تو لاش غسل خانے میں موجود تھی۔'' کریم بخش نے جواب دیا۔

''تم ٹیلی فون پر رشید اعوان سے رابطہ کرو۔ اُس کا موبائل نمبر یاد ہے نا......؟'' انسپکٹر صاحب نے کہا۔ ''اگر اُس لڑکی کی لاش پوسٹ مارٹم کے لئے نہیں بھیجی گئی ہے تو اُس سے کہو کہ میرے آنے تک لاش وہاں سے ہٹائی نہ جائے۔ میں آ کر معائنہ کرنا چاہتا ہوں۔''

اچانک میرے ذہن میں ایک خیال آیا تو میں نے کہا۔ ''سر! آپ سے ایک گزارش ہے۔ آپ نے ساری رپورٹ سن لی۔ سب انسپکٹر صاحب میری اس بات کا یقین نہیں کر رہے ہیں کہ میں پشاور سے سفر کرتا ہوا آ رہا ہوں۔ انہیں اس لئے یقین نہیں آ رہا ہے کہ میرا سارا سامان چوری ہو گیا ہے۔ ان سے کہیں کہ گارڈ سے مل کر میرے نام کی تصدیق کر لیں۔ انہیں ثبوت مل جائے گا۔''

''اچھا......'' انسپکٹر صاحب نے چائے سپ کرتے ہوئے کہا۔ ''چلو اس کی بھی تصدیق کر لیتے ہیں۔ تمہارا نام کیا ہے؟''

''میرا نام......؟'' میں نے ذہن پر بہت زور دیا، مجھے اپنا نام یاد نہیں آیا۔ میں اپنا نام بھول گیا تھا......!

○○○

چونکہ اُس وقت ٹیلی فون کی گھنٹی بجی تو انسپکٹر صاحب نے ریسیور اُٹھالیا اور بات کرنے لگے تھے اس لئے اُنہوں نے اپنا سوال نہیں دہرایا۔ وہ ٹیلی فون پر بات کرنے لگے۔ اُدھر میں دل میں حیران تھا کہ مجھے اپنا نام یاد کیوں نہیں آ رہا ہے؟ میں اپنا نام کیوں اور کیسے بھول گیا؟ اور میں کون ہوں؟ کہاں سے آ رہا ہوں؟ میرا گھر کہاں ہے؟ میں کہاں سے، کس اسٹیشن سے سوار ہوا تھا؟ میرا اس دنیا میں اور کون کون ہے؟

میرے ذہن میں ان سوالوں میں سے ایک سوال کا بھی جواب نہیں تھا۔ میرے ذہن کے تمام گوشوں میں اندھیرا تھا۔ اس کے دریچے بند تھے۔ میرا دل و دماغ چکرا رہا تھا...... یہ سب کچھ میرے لئے ناقابل یقین، تحیر انگیز تھا۔ میں اپنے بارے میں سب کچھ بھول چکا تھا۔ میری یادداشت باقی نہیں رہی تھی۔ میں نے اپنے ذہن کے ایک ایک گوشے میں جھانک لیا تھا، وہاں بھی گھپ اندھیرا تھا۔

یہ بڑی عجیب و غریب اور حیرت انگیز بات تھی کہ میں انسپکٹر صاحب اور کریم بخش کا ذہن پڑھ سکتا تھا۔ میں نے صرف ایک لمحے میں اُن دونوں کا ذہن پڑھ لیا تھا۔ میں اُن کے بچپن سے لے کر آج تک کے بارے میں سب کچھ بتا سکتا تھا۔ اُن کا ماضی میرے سامنے آئینے کی طرح تھا۔ میں اس میں اس طرح سے دیکھ رہا تھا جیسے فلم دیکھ رہا ہوں۔ ان کا سارا ذہن میرے ذہن میں جیسے منتقل ہو گیا۔ میں اُن کی بیوی، بچوں، دوستوں، رشتہ داروں اور والدین تک کے بارے میں بتا سکتا تھا۔ ان سب کے نام بھی بتا سکتا تھا۔ وہ اپنے بارے میں بہت ساری باتیں دنیا سے چھپا سکتے تھے لیکن مجھ سے نہیں...... میں انہیں برہنہ بھی کر سکتا تھا، آئینہ دکھا سکتا تھا۔ مجھ سے کچھ بھی پوشیدہ نہیں رہا۔

لیکن میں اپنے بارے میں ہر بات سے محروم تھا۔ اپنا نام تک یاد نہیں آ رہا تھا۔ میں سوچنے لگا کہ انسپکٹر صاحب کو اپنا کیا نام بتاؤں؟ ادھر انسپکٹر صاحب ٹیلی فون پر جس سے

بات کر رہے تھے وہ اُن کا دوست وقار تھا۔ انسپکٹر صاحب نے دو آدمیوں کو ایک جھوٹے کیس میں گرفتار کر کے ایک مکان میں قید کر کے ایک سپاہی کو سادہ لباس میں پہرے پر مامور کر دیا تھا۔ ان دو آدمیوں کے لواحقین سے وہ ان دونوں کی رہائی کے عوض ایک ایک لاکھ روپے رشوت طلب کر رہے تھے۔ ان کے دوست وقار نے اُن دونوں آدمیوں کے لواحقین سے بات کی تھی۔ وہ پچیس ہزار روپے سے زیادہ نہیں دے سکتے تھے۔ انسپکٹر صاحب اُس سے کہہ رہے تھے کہ پچاس ہزار روپے میں معاملہ طے کر دو۔ وہ اُسے دس فیصد کمیشن دے دیں گے۔ وہ کہہ رہا تھا کہ زیر حراست آدمی بہت غریب لوگ ہیں۔ اُن میں سے ایک سبزی فروش ہے، دوسرا ملازم پیشہ ہے۔ اُس کی تنخواہ صرف تین ہزار روپے ہے۔ اُن کی بیوی اور تین بچے ہیں۔ انسپکٹر صاحب کے دل کے کسی کونے میں اُن سے کوئی ہمدردی نہیں تھی۔ رحم کی رمق بھی نہیں تھی۔ اُنہیں اس سے کوئی سروکار نہیں تھا کہ وہ کون ہیں؟ کیا ہیں؟ اُنہیں صرف رقم سے غرض تھی۔ یہ ساری گفتگو اشاروں اور کنایوں میں ہو رہی تھی۔ وہ پچاس ہزار کے محاذ پر ڈٹ گئے تھے۔

ایک اور شخص نذر خان جونیجو کو بھی حوالات میں بند کیا ہوا تھا۔ تھانے کے رجسٹر میں نہ تو اُس کے نام کا اندراج تھا اور نہ اُس کے خلاف کوئی ایف آئی آر کٹی ہوئی تھی۔ وہ غیر قانونی طور پر حراست میں تھا۔ اُس شخص کے خلاف بھی جھوٹا کیس بنایا گیا تھا۔ اُس کا قصور یہ تھا کہ اُس نے انسپکٹر صاحب کے سالے کے حق میں عدالت میں جھوٹی گواہی نہیں دی تھی۔ ان کے سالے نے اپنے دوستوں کی مدد سے ایک پندرہ برس کی مہترانی لڑکی کو اغوا کر کے بیس دن تک یرغمال بنا کر رکھا تھا۔ وہ اور اُس کے دوست اُس غریب لڑکی کی بے حرمتی کرتے رہے تھے۔ وہ ایک روز موقع پا کر اس گھر سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ اُس کے ماں باپ اور برادری کے لوگوں نے ایف آئی آر کٹوا دی۔ اُس تھانے کے اہلکاروں کو اس بات کا علم نہیں تھا کہ ملزم انسپکٹر صاحب کا سالا ہے، ورنہ ایف آئی آر نہیں کٹتی۔ اُسے گرفتار کر لیا گیا۔ اُسے کسی نہ کسی طرح ضمانت پر رہا کروا لیا گیا۔ عدالت میں مقدمہ درج ہو گیا تھا۔ مسیحی برادری نے محاذ بنا لیا تھا۔ نذر خان جونیجو کی گواہی پر ان کا سالا اور اس کے دوست باعزت طور پر رہا ہو سکتے تھے۔ نذر خان جونیجو ایک شریف اور با اصول قسم کا شخص تھا۔ وہ جھوٹی گواہی دے کر اپنا ایمان اور اپنی عاقبت خراب کرنا نہیں چاہتا

تھا۔ اُس پر تشدد کر کے اُسے اس بات پر آمادہ کیا جا رہا تھا کہ وہ عدالت میں جھوٹی گواہی
دے لیکن وہ ایذا رسانی کے باوجود جھوٹی گواہی دینے کے لئے تیار نہ تھا۔ لڑکی کے ماں
باپ نے دس لاکھ روپے کے ہرجانہ کا دعویٰ بھی کر رکھا تھا۔ اس کے علاوہ اس بدنصیب شخص
کے گھر والوں کو انسپکٹر صاحب کے سالے دھمکیاں بھی دے رہے تھے کہ اُس کی نوجوان
بیٹی اور بہو کو اغوا کر لیں گے۔ پھر بھی وہ شخص کسی قیمت پر جھوٹی گواہی کے لئے تیار نہیں تھا۔

یہ کوئی انہونی بات یا نیا واقعہ نہیں تھا۔ نہ پہلی بار ایسا واقعہ پیش آیا تھا۔ اخبارات ایسے
واقعات سے بھرے پڑے تھے۔ ان کالی بھیڑوں کے نزدیک قانون صرف کاغذ کا پرزہ
تھا۔ وہ اس کی دھجیاں بکھیرتے رہتے تھے۔ اعلیٰ افسران نہ صرف چشم پوشی کرتے تھے بلکہ
اُنہیں فرشتہ اور قانون کے محافظ ثابت کرتے تھے۔ قانون کس بے رحمی سے پامال ہو رہا
تھا، اس کا ذمہ دار افراد کو کوئی احساس تھا اور نہ ہی کوئی فکر تھی۔ کیونکہ سب اپنے اپنے
حلوے مانڈے میں لگے ہوئے تھے۔

میں اس لئے بھی جذباتی ہو کر سوچنے لگا تھا کہ مجھے بلاوجہ اور بغیر کسی جواز اور ثبوت
کے قتل کے الزام میں دھر لیا گیا تھا، تھانے لایا گیا تھا۔ ادھر انسپکٹر صاحب ٹیلی فون پر اپنا
اُلو سیدھا کرنے میں لگے ہوئے تھے، ادھر میں اپنا نام اور اپنے بارے میں سوچنے میں لگا
ہوا تھا۔ اپنی یادداشت کے پٹ کھولنے کی کوشش کر رہا تھا جو کھلنے کا نام نہیں لے رہے
تھے۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں۔

انسپکٹر صاحب نے گفتگو کا سلسلہ منقطع کر کے ریسیور رکھا ہی تھا کہ پھر اُنہوں نے
ریسیور اُٹھا لیا۔ کیونکہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی تھی۔ دوسری طرف سب انسپکٹر رشید اعوان تھا۔ اس
اُنہیں بتا رہا تھا کہ لڑکی کی لاش پوسٹ مارٹم کے لئے بھیج دی گئی ہے۔ یہ سنتے ہی انسپکٹر
صاحب کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ وہ غصے سے بولے۔ ''کیا میرے آنے تک ہم
نہیں کیا جا سکتا تھا؟ میں بھی اس لاش کو دیکھنا اور معائنہ کرنا چاہتا تھا...... میری اجازت اور
معائنہ کے بغیر لاش کیوں، پوسٹ مارٹم کے لئے بھیجی گئی......؟''

اتنا کہہ کر انسپکٹر صاحب نے غصے سے ریسیور کریڈل پر پٹخ دیا۔ اُن کا چہرہ سرخ ہو گیا
تھا۔ اُنہیں اس بات کا سخت افسوس اور بڑا دُکھ ہو رہا تھا کہ وہ لڑکی کی برہنہ لاش نہیں دیکھ
سکے۔ اُن کی یہ حسرت دل میں ہی رہ گئی۔ اُن کا موڈ سخت آف ہو گیا تھا حالانکہ وہ اس

بیشتر زندہ سلامت لڑکیوں اور عورتوں کو فطری حالت میں دیکھتے اور پھولوں کی طرح مسلتے
بھی تھے۔

انسپکٹر صاحب نے اپنا غصہ سرد اور اپنے آپ کو قابو میں کرنے کے لئے کریم بخش سے
ایک گلاس ٹھنڈا پانی منگوا کر پیا۔ اسی لمحے ایک مرد اور عورت کمرے میں داخل ہوئے۔
عورت بہت حسین اور پُرکشش تھی۔ دراز قد تھا، اُس کا جسم سڈول اور گداز تھا۔ بھڑکیلے
لباس میں اُس کا جسم اور بھڑک اُٹھا تھا۔ وہ سرخ و سفید رنگت کی تھی۔ اُس کے بال
بکھرے ہوئے تھے۔ چہرے پر سرخ نشانات تھے۔ لباس نہ صرف بے ترتیب تھا بلکہ
شکنوں کے جال سے بھرا ہوا تھا۔ مرد اُسے سہارا دے کر اندر لایا تھا۔ اُس عورت کی چال
سے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ بے حد نڈھال اور تھکن سے چور ہے۔ اس میں چلنے کی بالکل بھی
سکت نہیں رہی ہے۔ اُسے اپنے پیر من من بھاری محسوس ہو رہے ہیں۔

اُس کا حسین چہرہ پھول کی طرح مرجھایا ہوا تھا۔ اُس کی غلافی آنکھوں سے وحشت
جھانک رہی تھی۔ وہ رنج والم کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ اُس عورت کی عمر اٹھائیس برس کی ہو
گی۔ اُس کے ساتھ جو مرد تھا اُس کی عمر چالیس برس کے لگ بھگ تھی۔ وہ صحت مند اور
دراز قد تھا۔ اُس کا جسم فربہ تھا۔ چہرے مہرے اور وضع قطع سے آسودہ حال گھرانے کا
دکھائی دیتا تھا۔

مرد نے میز کے گرد جو چار کرسیاں رکھی ہوئی تھیں، اُن میں سے ایک کرسی پر انسپکٹر
صاحب کو سلام کرنے کے بعد عورت کو بٹھا دیا۔ عورت نے بھی سلام کر کے اپنا سر میز پر
رکھ دیا۔ پھر وہ جیسے سسکنے لگی۔ انسپکٹر صاحب اُس عورت کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھنے
لگے جیسے مفت کا مال ہو۔

''آپ لوگ کون ہیں؟ کیا بات ہے؟'' مرد کے کہنے سے پہلے انسپکٹر صاحب بول اُٹھے۔

''جنابِ عالی! ہم آپ کے پاس ایک فریاد لے کر آئے ہیں۔'' مرد نے چاپلوسی کے
انداز میں قدرے افسردگی سے کہا۔

''کیا فریاد ہے......؟'' انسپکٹر صاحب نے مرد سے نظریں ہٹا کر عورت کی طرف دیکھا
جو میز سے سر اُٹھا کر اُن کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''ہم ایف آئی آر کٹوانے آئے ہیں۔'' مرد نے ایک گہری سانس لی۔ ''ہم بہت

چھوٹے آدمی ہیں، لیکن آپ سے انصاف کی توقع ہے۔''

''کس بات کی ایف آئی آر؟ کس کے خلاف......؟'' انسپکٹر صاحب عورت کا سراپا اپنی نظروں میں جذب کرنے لگے۔

''سر! یہ میری بیوی ہے۔'' مرد نے کہا۔ ''اردشیرازی نے میری بیوی کو کل شام اپنے دوستوں کی مدد سے اغوا کرلیا۔ میری بیوی تھوڑی دیر پہلے اُن کے چنگل سے آزاد ہوئی ہے۔ وہ اُسے گھر لا کر چھوڑ گئے۔ ساری رات دن کے دس بجے تک اردشیرازی اور اُس کے تین دوستوں نے میری بیوی کو کھلونا بنائے رکھا۔ اس کے ساتھ بڑی بربریت اور درندگی سے پیش آئے...... ان حرام زادوں نے اتنا بھی خیال نہیں کیا کہ یہ عورت ہے، کوئی حیوان نہیں ہے۔ اسے چند لمحے چین لینے بھی نہیں دیا۔ اس کا حشر نشر کر دیا۔''

''آپ شروع سے لے کر آخر تک کے واقعات تفصیل سے بیان کریں۔'' انسپکٹر صاحب نے کہا۔

''میں نے جو کچھ آپ کی خدمت میں عرض کیا ہے کیا وہ کافی نہیں ہے؟'' مرد نے بڑی عاجزی سے کہا۔

''جی نہیں......'' انسپکٹر صاحب نے ترش روئی سے کہا۔ وہ اُس عورت کے سراپا میں کھو کر چشم تصور میں بہت دُور چلے گئے تھے۔ ''جب تک اس اغوا اور زیادتی کے واقعات علم میں نہیں آ جاتے اُس وقت تک ایف آئی آر کٹ نہیں سکتی۔ آپ تشریف رکھیں۔''

عورت نے بے بسی سے مرد کی طرف دیکھا تو مرد نے اُس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ''انسپکٹر صاحب ٹھیک ہی کہہ رہے ہیں۔ تم شروع سے لے کر آخر تک کے واقعات تفصیل سے سنا دو تا کہ یہ نہ صرف ایف آئی آر کاٹیں بلکہ ملزمان کے خلاف کارروائی بھی کر سکیں۔''

''میرا نام نگہت ہے جی۔'' عورت انسپکٹر صاحب کی طرف دیکھتی ہوئی بولی۔ ''یہ میرے شوہر طفیل بغدادی ہیں۔ اردشیرازی ہمارا پڑوسی ہے۔ آپ بھی اُس سے واقف ہوں گے۔ طارق روڈ پر اُس کی کپڑے کی ایک، ایک مردانہ ریڈی میڈ گارمنٹس کی اور ایک حنا نام کی بوتیک ہے۔ اس کے علاوہ اس کا ایک اعلیٰ درجے کا ریسٹورنٹ ڈیفنس سوسائٹی میں ہے۔ اس کی بیوی کا نام حنا ہے۔ آوارہ، بدچلن اور بدذات قسم کی عورت

ہے۔ مردوں کے ساتھ آزادانہ میل جول رکھتی ہے۔ اٹھارہ سے بیس برس کے صحت مند، توانا اور دراز قد لڑکوں کو پھانستی رہتی ہے۔ اُس کی عمر تیس برس ہے۔ چونکہ ایرانی ہے، اُس کی سفید چمڑی ہے، وہ بیس برس کی دکھائی دیتی ہے۔ اس لئے لڑکے اور مرد اُس کے حسن و شباب اور سفید چمڑی کے جال میں پھنس جاتے ہیں۔ وہ اُن کی جیبیں خالی کرتی ہے اور اس کے بدلے اپنے آپ کو فیاضی سے پیش کر دیتی ہے۔ اس کے شوہر اردشیرازی کی کمزوری بھی عورت ہے۔ دوسری طرف اس کے بھی بہت ساری نوجوان لڑکیوں اور شادی شدہ جواں سال عورتوں سے تعلقات ہیں۔ ان کی دُکانوں پر جو عورتیں خریداری کے لئے آتی ہیں وہ اُنہیں پھانستا ہے۔ یہ وہ عورتیں اور لڑکیاں ہوتی ہیں جن کی کمزوری ملبوسات اور کپڑے ہوتے ہیں اور جو اسکے اُدھار کے جال میں پھنس جاتی ہیں۔ اُس نے طارق روڈ کے عقب میں ایک لگژری فلیٹ خرید رکھا ہے جس میں اُس نے اپنی دُکان کا مال اسٹاک کیا ہوا ہے۔ یہ پانچ کمروں کا فلیٹ ہے۔ اس میں اس کا جو نہایت آراستہ و پیراستہ اور خوبصورت سا بیڈ رُوم ہے وہ اُس کا عشرت کدہ ہے۔ جو لڑکیاں، عورتیں قرض کے بار میں جکڑی ہوئی ہوتی ہیں اور اُن کے لئے قرضوں کی ادائیگی جو ہزاروں روپے کی ہوتی ہے، مشکل ہوتی ہے وہ اقساط کی شکل میں ادا کرتی ہیں۔ یعنی وہ جب بھی اُس کے ہاں آ کر اُس کی بات مان کر خوش کر کے جاتی ہیں، ایک قسط ادا ہو جاتی ہے۔ لیکن وہ صرف ایسی حسین، نوجوان اور پُر شباب لڑکیوں اور شادی شدہ عورتوں کو شکار کرتا ہے جو ہزاروں اور لاکھوں میں ایک ہو۔ عام قسم کی معمولی لڑکیوں اور عورتوں کو نہ تو قرض دیتا ہے اور نہ ہی اُن کی طرف دیکھنا بھی گوارا کرتا ہے۔

مجھے ان میاں بیوی کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا کہ وہ کیسے ہیں۔ جب میری اُن کے ہاں آمد و رفت ہونے لگی، رفتہ رفتہ ان کے اصل چہرے دکھائی دینے لگے۔ اردشیرازی مجھ پر ریشہ خطمی ہو گیا۔ وہ بیوی کی غیر موجودگی میں مجھے کسی نہ کسی بہانے تحائف دینے لگا۔ جب کبھی میں اُس کی بیوی کی غیر موجودگی میں اُس کے فلیٹ پر جاتی تھی، وہ مجھ سے فری ہونے کی کوشش کرتا۔ اُس کی بے تکلفی مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی۔ اُس نے دو ایک مرتبہ غیر محسوس انداز میں مجھ سے من مانی کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن میری طرف سے کبھی حوصلہ افزائی نہیں ہوئی، نہ میں اُس سے فری ہوئی اور نہ ہی بے تکلف......

میں نے ایک فاصلہ قائم رکھا تھا، کیونکہ مجھے اپنے شوہر سے بے پناہ محبت ہے۔ ہم دونوں ہی ایک دوسرے کو اس قدر چاہتے ہیں کہ ایک دن بھی ایک دوسرے کے بغیر رہ نہیں سکتے۔ ادھر اُس کی بدچلن بیوی نے میرے شوہر پر ڈورے ڈالنے شروع کئے۔ ایک روز اُس نے چاہا کہ میرے شوہر کا پیر پھسل جائے۔ اُس نے میرے شوہر کو اپنے جال میں پھانسنے اور غلاظت کی دلدل میں گرانے کی بہت کوشش کی۔ اگر میرا شوہر مجھ سے بے پناہ محبت نہ کرتا ہوتا اور مضبوط کردار کا مالک، نیک اور شریف نہ ہوتا تو وہ اس غلاظت کی دلدل میں گر پڑتا۔ ایک طرف اُس کے شوہر نے مجھے شکار سمجھ کر اپنا جال پھیلایا ہوا تھا، دوسری طرف اُس کی بدچلن اور فاحشہ بیوی میرے شوہر کو اپنا اسیر بنانا چاہتی تھی۔ دونوں میاں بیوی کے درمیان شاید ایک سمجھوتہ ہوگیا تھا کہ وہ دونوں اپنی اپنی راہ پر چلیں گے۔ ان میں سے کوئی ایک دوسرے کے معاملات میں دخل اندازی نہیں کرے گا۔

ملبوسات ہر عورت کی کمزوری ہوتے ہیں چاہے وہ گھر کی چار دیواری میں رہتی ہو یا امیر کبیر ہو، ماڈل گرل یا اداکارہ ہو، بدچلن اور فاحشہ ہو، غریب یا بال بچے دار ہو یا ساٹھ برس کی ہی کیوں نہ ہو۔ اسی طرح نت نئے فیشن کے ملبوسات میری بھی کمزوری تھے۔ اور میں تھان کپڑا خرید کر درزی کو دے کر سلواتی تھی۔ اُس نے ایک روز مجھ سے کہا کہ میرے پاس اسمگلنگ کا مال آیا ہوا ہے۔ اس میں ایسا ریشمی اور غیر ملکی کپڑا ہے کہ تم دیکھو گی تو دیکھتی رہ جاؤ گی۔ میں تمہیں خریدی قیمت پر وہ کپڑا دے سکتا ہوں۔ تم میرے اس فلیٹ پر آ جاؤ۔ جب میں اُس فلیٹ پر مقررہ وقت پر پہنچی تو اُس نے مجھے صرف ایک تھان دکھایا اور کہا کہ پولیس کے چھاپے کے ڈر سے مال ڈیفنس کے ایک بنگلے پر رکھا ہوا ہے۔ کسی دن چل کر دیکھ لینا۔ پھر اُس نے اُس تھان میں سے ایک سوٹ پیس نکال کر دیا۔ میں نے اس کی قیمت ادا کرنا چاہتی تو اُس نے یہ کہہ کر پیسے لینے سے انکار کر دیا کہ یہ اس کی طرف سے تحفہ ہے۔ میں اور کپڑے خریدوں گی تو وہ اس کی قیمت لے لے گا۔ جب میں نے وہ سوٹ پیس لینے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو اُس نے مجھے دبوچ لیا۔ من مانی کرنے لگا۔ میں نے سوٹ پیس اُس کے منہ پر دے مارا اور اُس کی گرفت سے نکل کر آ گئی۔ میں نے اُس کی شکایت شوہر سے نہیں کی کہ کہیں وہ غیرت میں آ کر اُسے قتل نہ کر دے۔

وہ دوسرے دن میرے شوہر کی غیر موجودگی میں آیا، مجھ سے معافی مانگی۔ میرے

پیروں میں گر پڑا۔ اُس نے کہا کہ میں آئندہ ایسی کوئی حرکت نہیں کروں گا، ایک دوست اور بھابھی کی طرح سمجھوں گا، میں اسے معاف کر دوں۔ میں نے اُسے معاف کر دیا تو اُس نے مجھ سے کہا کہ اس کے گناہ کا کفارہ اس طرح سے ہوسکتا ہے کہ میں اُس کے ساتھ چل کر ان تھانوں میں سے کچھ کپڑا بطور تحفہ اور جرمانہ لے لوں۔ میں بادل نخواستہ اُس کے ساتھ چلی گئی۔ وہاں پہنچی تو اُس کے تین دوست پہلے سے موجود تھے۔ وہ مجھے ایک طرح سے اغوا کر کے لے گیا تھا۔

وہ تینوں مسلح تھے۔ اردشیرازی نے ایک قہقہہ مار کر مجھے دبوچ لیا۔ اُن سب کے سامنے ناشائستہ حرکتیں کرنے لگا۔ پہلے اردشیرازی نے...... پھر اُس کے تینوں دوستوں نے سہ پہر سے لے کر کوئی ایک گھنٹے پہلے تک مجھے کھلونا بنائے رکھا۔ میں نے ان درندوں کے آگے ہاتھ جوڑے، بڑی منتیں کیں، جانے کس کس کے واسطے دیئے لیکن اُن حرام زادوں کو مجھ پر رحم نہیں آیا۔ وہ نہ صرف حیوان بن گئے تھے بلکہ مجھے بھی حیوان سمجھ لیا تھا۔ پھر میری ایسی تصویریں کھینچی گئیں کہ مجھے بلیک میل کیا جا سکے۔ مجھے دھمکی دی گئی کہ میں پولیس کے پاس گئی تو اچھا نہیں ہوگا۔ پولیس ایک تو اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتی تھی۔ پولیس نے بالفرض محال ان کے خلاف کوئی قدم اُٹھایا تو وہ اس کا منہ پیسے سے بند کر دیں گے اور پولیس ان کا بال تک بیکا نہیں کر سکے گی۔ اُن حرام زادوں نے میرے مزاحمت کرنے پر مجھ پر جسمانی تشدد کیا۔ ایذائیں بھی دیں۔''

اتنا کہہ کر وہ خاموش ہوگئی اور اپنے چہرے کو دوپٹے سے ڈھانپ کر رونے اور سسکنے لگی۔ پھر انسپکٹر صاحب نے اُسے دلاسا دیتے ہوئے کہا۔ ''بی بی! آپ فکر نہ کریں۔ میں اُس حرام زادے اور اُس کے ساتھیوں کو حدود آرڈیننس کیس کے تحت گرفتار کر کے عدالت سے کوڑوں کی سزا دلواؤں گا...... اُن سے ایک ایک بات کا پورا پورا بدلہ لوں گا۔''

''وہ کہہ رہا تھا...... کہہ رہا تھا کہ ہمارا پولیس میں اور اُوپر تک بڑا اثر و رسوخ ہے۔'' نکہت نے دوپٹہ ہٹائے بغیر کہا۔ ''پولیس ہمارا بال تک بیکا نہیں کر سکتی۔ بالفرض پولیس نے ہمارے خلاف کوئی کارروائی کی تو اس کا منہ دو تین لاکھ روپے دے کر بند کر دیں گے۔''

''اچھا...... اُس مردود نے یہ بات کہی تھی؟'' انسپکٹر صاحب دل میں خوش ہوگئے۔ دو تین لاکھ روپے کا سن کر اُن کی رال ٹپک پڑی۔ وہ ایک لحظہ کے لئے کسی سہانے خواب

میں کھو گئے، پھر اُنہوں نے پوچھا۔ ''اُس کے ساتھی کون تھے؟ اُن کی عمریں کیا تھیں؟''

''اُس کے ساتھی بڑے گھر کے لڑکے معلوم ہوتے تھے۔'' نگہت نے جواب دیا۔ ''وہ تینوں اپنی اپنی گاڑیوں میں چلے گئے تھے۔ اُن کے پاس ہنڈا سوک اور ٹویوٹا گاڑیاں تھیں۔ اُن کی عمریں بیس بائیس برس سے زیادہ نہیں تھیں۔''

''کیا تمہیں اُن لڑکوں کے نام وغیرہ معلوم ہیں؟'' انسپکٹر صاحب نے مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے کہا۔

''جی ہاں...... میں اُن کے نام بتا سکتی ہوں۔ اتفاق سے اُن کے پتے بھی میں نے معلوم کر لئے ہیں۔'' نگہت نے بتایا۔

''بہت خوب...... بی بی! تم نے بڑا کمال دکھایا...... میں اُن چاروں کے خلاف ایف آئی آر کاٹوں گا۔''

''اردشیرازی ایک کروڑ پتی شخص ہے جناب!'' نگہت کے شوہر نے کہا۔ ''اُس کی یومیہ آمدنی تقریباً ایک لاکھ روپے ہے۔ اس لئے وہ بھونرا بنا ہوا ہے۔ کلیوں اور پھولوں کے رس چوستا رہتا ہے۔ اس کا جرم ناقابل معافی ہے۔''

''وہ ارب پتی شخص ہو تو بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' انسپکٹر صاحب نے مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے کہا۔ پھر وہ کرسی چھوڑ کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ پھر اُس نے نگہت کو اشارہ کیا اور پہلو والے کمرے میں اُسے ساتھ لے جانے لگا۔ اُس کا شوہر بھی ساتھ اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ ساتھ چلنے لگا تو انسپکٹر صاحب نے ناگواری سے اُس کی طرف دیکھا۔ ''آپ اپنی جگہ جا کر بیٹھیں۔ مجھے آپ کی بیگم سے کچھ سوالات کرنے ہیں۔ میں وہ سوالات ہر ایک کے سامنے اور آپ کے سامنے بھی نہیں کر سکتا...... یہ اس کا جواب بھی سب کے سامنے دے نہیں سکیں گے۔''

اُس کمرے میں داخل ہونے کے بعد انسپکٹر صاحب نے دروازہ بھیڑ دیا۔ میرا ذہن اُن دونوں کے ذہنوں سے رابطہ کئے ہوئے تھا۔ انسپکٹر صاحب نے کمرے میں لائٹ آن کی، پھر وہ نگہت سے بولے۔ ''آپ اپنا لباس اُتار کر کرسی پر ڈال دیں۔''

''وہ کس لئے......؟'' نگہت کے چہرے پر حیرت چھا گئی۔ وہ ساکت نظروں سے اُسے دیکھنے لگی۔ ''آپ کیا چاہتے ہیں؟''

''آپ نے اپنے بیان میں بتایا کہ ملزموں نے مزاحمت کرنے پر جسمانی تشدد کیا اور ایذائیں دی ہیں۔ میں اُن کے نشانات دیکھنا چاہتا ہوں۔''

''جی......؟'' وہ ایک دم چونک پڑی۔ اُس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ''میں نے جو بیان دیا کیا وہ کافی نہیں ہے؟''

''صرف بیان سے کیا ہوتا ہے......'' انسپکٹر صاحب کہنے لگے۔ ''میں چونکہ جھوٹی اور بغیر ثبوت کے ایف آئی آر کاٹنے کا قائل نہیں ہوں اس لئے آپ کے جسم کے نشانات دیکھنا چاہتا ہوں۔ پھر میں ان کے خلاف سخت اقدامات اور اندر کر سکتا ہوں۔''

''شاید وہ نشانات ہلکے پڑ گئے ہوں۔ شاید مٹ بھی گئے ہوں گے۔ کیونکہ یہ رات کی بات ہے۔'' نگہت نے کہا۔ ''آپ کارروائی پوری کرنا چاہتے ہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن میں آپ سے ایک درخواست کرنا چاہتی ہوں۔''

''آپ درخواست کی بات کر رہی ہیں...... محترمہ! حکم دیجئے۔ ہم پولیس والے مددگار اور خدمت گار ہوتے ہیں۔ آپ نے تھانے کی دیواروں پر لکھا نہیں دیکھا کہ...... ہم عوام کے خادم ہیں۔ ان کی خدمت کرنا ہمارا فرض ہے......''

''جب آپ اُن درندوں کو گرفتار کریں گے، تب کیا میرا طبّی معائنہ بھی کیا جائے گا؟'' نگہت نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''جی ہاں...... یہ ایک رسمی کارروائی ہوتی ہے۔ آپ کس لئے دریافت کر رہی ہیں؟'' انسپکٹر صاحب نے پوچھا۔

''اس لئے کہ یہ ایک تکلیف دہ عمل ہوتا ہے۔ میں نے کسی سے سنا ہے۔ کیا اسے ملتوی نہیں کیا جا سکتا......؟''

''یہ آپ سے کس نے کہہ دیا کہ یہ تکلیف دہ عمل ہوتا ہے؟ میں آپ کی بات سمجھا نہیں۔'' انسپکٹر صاحب بولے۔

''میں نے سنا ہے کہ جو ڈاکٹر طبّی معائنہ کرتے ہیں، وہ اس بہانے عورت کی عزت سے کھیلتے ہیں۔'' نگہت نے کہا۔

''جی نہیں...... یہ غلط بات ہے۔ آپ کا طبّی معائنہ کوئی لیڈی ڈاکٹر سرجن کرے گی۔ اس سے یہ ثابت ہو جائے گا کہ آپ کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔ اس طرح ان ملزموں کو

کیفر کردار تک پہنچایا جائے گا۔'' انسپکٹر صاحب نے کہا۔

''کیا یہ ضروری ہے کہ آپ میرا جسمانی معائنہ کریں......؟'' نگہت نے ساکت سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''جی ہاں...... میں جب تک تصدیق نہ کر دُوں، آپ کی بات سچ نہیں مانی جائے گی۔ ایف آئی آر نہیں کٹے گی۔''

تھوڑی دیر کے بعد انسپکٹر صاحب نے بہت غور سے اور بہت قریب سے بہت ہی اچھی طرح نگہت کا جسمانی معائنہ کیا۔ کوئی بیس منٹ لگ گئے۔ اس معائنے سے فارغ ہو کر اُنہوں نے نگہت سے کہا کہ وہ کپڑے پہن لے۔ جب وہ کپڑے پہن چکی تو انسپکٹر صاحب بولے۔ ''تشدد اور ایذا کے نشانات واضح نہیں ہیں۔ طبّی معائنہ میں یہ بات نوٹ کی جائے گی۔ اس کی رپورٹ میں یہ بات درج ہوگی کہ آپ کے ساتھ تشدد روا نہیں رکھا گیا۔ آپ نے جھوٹا الزام عائد کیا ہے۔''

''اس طرح تو کیس بہت کمزور ہو جائے گا...... ملزموں کو فائدہ پہنچے گا۔'' نگہت تشویش سے بولی۔

''جی ہاں......'' انسپکٹر صاحب نے سر ہلایا۔ ''میں ایف آئی آر میں یہ غلط بات لکھنے سے رہا۔ اس کیس کی بنیاد اور سارا زور ایف آئی آر سے ثابت ہوگا۔ آپ کو میں یہاں سے طبّی معائنے کے لئے لیڈی سرجن کے پاس بھیجوں گا۔''

''پلیز! ایسی کوئی صورت نکالیں تا کہ یہ کیس میرے حق میں مضبوط ہو جائے۔ میں یہ چاہتی ہوں کہ اردشیرازی اور اُس کے ساتھیوں پر بیس لاکھ روپے ہرجانے کا دعویٰ کر دُوں۔ یہ رقم میری عزت کا بدل تو نہیں ہے لیکن میرے آنسو تو......''

''آپ ایک صورت کی بات کر رہی ہیں؟'' انسپکٹر صاحب نے اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے اُس کی طرف فاتحانہ نظروں سے دیکھا۔ ''ہم پولیس والے ہیں۔ ہمارے پاس دس صورتیں ہوتی ہیں۔ ایسی صورتیں کہ آپ عش عش کر اُٹھیں گی۔ ان صورتوں کے باعث کوئی بھی پولیس سے جیت نہیں سکتا۔ میرے پاس ایک صورت ہے۔ آپ میرے ساتھ چلیں...... پھر آ کر ایف آئی آر کٹوائیں۔''

''کیا صورت ہے وہ؟'' نگہت نے تجسس اور اشتیاق سے پوچھا۔ ''ہمیں کہاں چلنا ہو

گا؟''

''صرف آپ میرے ساتھ چلیں گی۔ آپ کے شوہر کو گھر جا کر تین گھنٹے کے بعد دفتر آنا ہوگا۔ صرف آپ میرے ساتھ میرے ایک فلیٹ پر چلیں گی۔ تین گھنٹے میرے ساتھ گزار کر آئیں گی تو پھر طبّی رپورٹ آپ کے حق میں اور ملزمان کے خلاف ہوگی۔''

نگہت انسپکٹر صاحب کی بات کی تہہ میں پہنچ کر بری طرح چونک پڑی۔ اُس پر ایک لمحے تک سکتے کی سی کیفیت طاری رہی۔ وہ حیرت سے بولی۔ ''انسپکٹر صاحب! یہ...... یہ کیسے ممکن ہے؟ کیا یہ اچھی بات ہوگی؟ اس طرح میں تو......'' اُس نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''دنیا میں کیا بات ممکن نہیں ہے...... اس وقت اچھی اور بری بات کا سوال نہیں ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ تشدد اور ایذا کو ثابت کرنا ہے۔ صرف آپ کے کہنے پر سرجن رپورٹ نہیں لکھ دے گی۔ وہ طبّی معائنہ ٹھونک بجا کر کرے گی...... آپ کے سارے جسم پر ایک نشان بھی ایسا نہیں ہے جسے ایذا کا نام دیا جا سکے۔''

''کیا میں اس کے لئے آپ کے ہاتھوں بے آبرو ہو جاؤں......؟ نہیں انسپکٹر صاحب! نہیں۔ آپ کوئی اور صورت سوچیں۔''

''اس کے سوا چارہ بھی نہیں ہے...... آخر آپ چار بدمعاشوں کے ہاتھوں پورے بیس گھنٹے نشانہ بنی رہیں۔ آبرو ایک بار لٹ جائے تو پھر ملتی نہیں ہے۔ میں تو آپ کے فائدے کے لئے کہہ رہا ہوں۔ آپ کے سارے جسم پر ایسے تشدد کے نشانات ہوں گے کہ سرجن کو بھی بہت دُکھ ہوگا۔ ایک ایسی حقیقت ہوگی کہ اسے کوئی جھٹلا نہیں سکے گا۔ لیکن آپ کو کوئی درد اور تکلیف محسوس نہیں ہوگی۔ صرف نشانات ہی نشانات ہوں گے۔ یوں آپ کا کیس بہت ہی مضبوط ہو جائے گا۔''

''میرے شوہر کو شاید یہ بات پسند نہیں آئے گی۔ وہ کس طرح پسند کریں گے کہ میں ایک بار پھر بے آبرو ہو جاؤں؟''

''پسند کریں گے اور اس کے لئے راضی بھی ہو جائیں گے۔ بیس لاکھ کے ہرجانے کی رقم کے حصول کے لئے پکا کام ہونا چاہئے۔ ویسے اُنہیں اعتماد میں لینے اور یہ سب کچھ بتانے کی ضرورت بھی کیا ہے؟ میں آپ کو کسی بہانے سے ساتھ لے جاؤں گا۔ اُس سے کہوں گا کہ وہ گھر جا کر آرام کرے۔ اب یہ کیس اعلیٰ افسران کی مدد سے حق میں چلا جائے گا۔''

"ہاں یہ تدبیر بہت زیادہ مناسب اور معقول ہے۔" نگہت نے کہا۔ "میں آپ کے ساتھ چلنے کے لئے تیار ہوں۔"

جب وہ دونوں پہلو والے کمرے سے نکل کر آئے تو نگہت اور انسپکٹر صاحب نے اپنی اپنی کرسی سنبھال لی۔

"انسپکٹر صاحب!...... مجھے کچھ عرض کرنے کی اجازت ہے؟" میں نے انسپکٹر صاحب سے کہا جو ابھی سے انجانے کیف وسرور میں ڈوبے جا رہے تھے۔ اُن پر ایک عجیب سرشاری طاری تھی۔ تھوڑی دیر پہلے جو اُنہیں اس بات کا غصہ اور ملال تھا کہ وہ ریل گاڑی میں مقتولہ کی برہنہ لاش کا معائنہ نہیں کر سکے وہ نگہت کے معائنہ کے بعد نہ صرف فرو ہو گیا بلکہ مر بھی گیا۔ وہ مُردہ لڑکی کی لاش تھی، نگہت ایک زندہ عورت تھی۔ بہت حسین اور پُرکشش تھی۔

"تمہیں کیا کہنا ہے......؟ اس...... تم یہاں موجود ہو؟ تمہیں اب تک حوالات میں بند نہیں کیا گیا؟" انسپکٹر صاحب نے چونکتے ہوئے کہا۔

"انسپکٹر صاحب! میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس عورت نے آپ سے جو کچھ کہا، وہ جھوٹ کا پلندہ تھا......!"

میری بات سن کر میاں بیوی جیسے اُچھل پڑے۔ اُن کے چہرے زرد پڑ گئے۔ انسپکٹر صاحب نے حیرت سے میری شکل دیکھی، پھر وہ تیکھے لہجے میں بولے۔ "کیا تم ان دونوں میاں بیوی کو جانتے ہو......؟"

"جی ہاں...... میں انہیں بہت اچھی طرح سے جانتا ہوں۔ لیکن یہ مجھے بالکل بھی نہیں جانتے۔ یہ بات کچھ عجیب سی معلوم ہو رہی ہو گی۔ اس عورت نے جو کہانی سنائی ہے اس میں ذرہ برابر بھی صداقت نہیں ہے۔"

"تم جھوٹ بول رہے ہو...... بکواس کر رہے ہو۔" نگہت ہذیانی لہجے میں بولی۔ "انسپکٹر صاحب! یہ کون شخص ہے؟"

"یہ ایک ملزم ہے۔ اس نے ریل گاڑی میں ایک نوجوان لڑکی کی عزت تباہ کر کے اُس کا گلا گھونٹ کر ہلاک کر دیا۔" انسپکٹر صاحب نے کہا۔

"یہ جھوٹ ہے...... غلط ہے۔ مجھ پر سراسر بہتان ہے۔" میں نے تکرار کی۔ "مجھے شک کی بنیاد پر گرفتار کیا گیا ہے۔ آپ بعد میں میرے بارے میں کوئی سا بھی ایکشن

لیں، پہلے آپ ان دونوں کے بارے میں سن لیں۔ میں آپ کو اردشیرازی اور اُس کی بیوی حنا کے بارے میں بتاؤں۔ دونوں میاں بیوی بڑے نیک، شریف، با اخلاق اور ملنسار ہیں۔ اردشیرازی نے اپنی بیوی کے سوا کبھی کسی لڑکی کی طرف نظر اُٹھا کر نہیں دیکھا۔ اس کا کبھی کسی عورت سے نہ تو معاشقہ رہا اور نہ ہی تعلقات اُستوار رہے ہیں۔ وہ اپنی بیوی سے بے پناہ محبت کرتا ہے۔ اس کی بیوی ایک بانجھ عورت ہے۔ اُس سے اولاد نہیں ہو سکتی۔ اُس نے اپنی بیوی کے کہنے کے باوجود اولاد کے کے لئے دوسری شادی نہیں کی۔ اُسے اولاد کی تمنا ہے لیکن اُسے اپنی بیوی حنا، بچوں سے زیادہ عزیز ہے۔

اسی طرح اُس کی بیوی حنا بھی ایک نیک اور خوب سیرت عورت ہے جس نے دولت امارت کے باوجود اپنے آپ کو گھر کی چار دیواری میں رکھا ہوا ہے۔ وہ سخت پردہ کرتی ہے اور اپنے شوہر کے مردوں کے سامنے بھی نہیں آتی ہے اور نہ ہی اُسے غیر مردوں کے ساتھ اُٹھنا بیٹھنا اور باتیں کرنا پسند ہے۔ وہ ایک روایتی اور لگی بندھی ڈگر پر چلنے والی عورت ہے۔ جس عمارت میں اُن کا فلیٹ ہے اُس عمارت کے مکین مرد کیا، بہت ساری عورتوں نے حنا کو کبھی بے پردہ نہیں دیکھا۔ اُس کے فلیٹ میں دن رات ایک بوڑھی ملازمہ رہتی ہے۔ میری ان باتوں کی تصدیق اُس عمارت کے مکین کریں گے، چوکیدار بھی گواہی دے گا۔ اور......"

"یہ سراسر جھوٹ بول رہا ہے۔" نگہت درمیان میں تیزی سے بولی۔ "وہ ایک شاطر، چالاک اور ذہین قسم کی عورت ہے۔ وہ پردے کی آڑ میں اور اس ملازمہ کو اعتماد میں لے کر سارے کھیل، کھیل رہی ہے، اس احتیاط کے ساتھ کہ وہاں کے کسی آدمی کو کچھ خبر نہیں۔ اُن کے فرشتوں تک کو خبر نہیں ہے۔ یہ شخص مجھے اُس عورت کا یار معلوم ہوتا ہے۔ شاید اس کے اُس عورت سے تعلقات ہیں۔ وہ ایسے ہی نوجوان مردوں کو پھانس کر رنگ رلیاں مناتی ہے۔ آپ اس کی باتوں پر کان نہ دھریں۔"

"کیا تمہارے تعلقات اردشیرازی کی بیوی حنا سے ہیں؟" انسپکٹر صاحب نے سوال کیا۔ "کیا یہ محترمہ سچ کہہ رہی ہیں؟"

"میں نے تو اُس عورت کی شکل تک نہیں دیکھی ہے، لہٰذا اُس سے میرے تعلقات کیسے اور کیونکر ہو سکتے ہیں؟" میں نے کہا۔ "سچ کیا ہے، جھوٹ کیا ہے یہ ابھی آپ کو معلوم ہو جاتا ہے۔ دراصل یہ عورت ایک بدکار ہے، فاحشہ ہے، یہ طوائف ہے۔"

"انسپکٹر صاحب......!" نگہت ہیجانی لہجے میں چیخ کر بولی۔ "اس حرام زادے، سؤر سے کہیں کہ یہ اپنی زبان کو لگام دے۔"

"تم ایک شریف اور باعزت گھرانے کی عورت پر تہمت لگا رہے ہو؟" انسپکٹر صاحب مجھ پر بگڑ گئے۔

"انسپکٹر صاحب! آپ پہلے میری بات سن لیں، پھر فیصلہ کریں۔ پھر آپ جو سزا چاہیں مجھے دے دیں۔ مجھے منظور ہوگی۔" میں کہنے لگا۔ "اس عورت کا اصل نام نیلم ہے۔ یہ ہیرا منڈی کی طوائف ہے۔ یہ دو برس سے کراچی میں ہے۔ یہ شخص جو اپنے آپ کو طفیل بغدادی اور اس عورت کا شوہر کہہ رہا ہے اس کا اصل نام اکمل ہے۔ یہ اس عورت کا شوہر نہیں بلکہ دلال ہے۔ نیلم کے لئے گاہک پھانس کر لاتا ہے۔ یہ شخص انتہائی کمینہ خصلت اور ذلیل قسم کا ہے۔ اس کے چہرے کی خباثت سے ہی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کس قسم کا شخص ہے۔"

نگہت اور اُس کے فرضی شوہر کے چہرے فق ہو گئے۔ ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ لیکن اُن دونوں نے جلد ہی خود پر قابو پا لیا اور نگہت نے کہا۔ "انسپکٹر صاحب! آپ کس خبیث کی باتیں سن رہے ہیں جو من گھڑت اور بے سروپا ہیں۔ اسے کیا حق ہے کہ ہمارے خلاف بکواس کرے؟ جھوٹے الزامات لگائے؟ آپ اس کی مداخلت کیوں اور کس لئے برداشت کر رہے ہیں؟ اسے حوالات میں بند کر دیں نا......"

"تم ایک شریف عورت کو طوائف کہہ رہے ہو...... تمہیں شرم نہیں آتی ہے؟" انسپکٹر صاحب نے برہمی سے کہا۔ "تمہارے پاس اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ یہ عورت ہیرا منڈی کی طوائف ہے، اس کا اصل نام نیلم ہے؟"

"میرے پاس میرا شناختی کارڈ ہے۔ اس پر آپ میرا نام اور میرے شوہر کا نام بھی دیکھ سکتے ہیں۔" نگہت نے کہا۔

"کیا ایک شریف عورت ایک غیر مرد کے آگے بے لباس ہو کر اپنا جسمانی معائنہ کرا سکتی ہے؟" میں نے کہا۔

انسپکٹر صاحب اس طرح اُچھل پڑے جیسے اُن کی کرسی میں کرنٹ دوڑ گیا ہو۔ "تمہیں کیسے پتہ چلا......؟" وہ بھونچکے ہو گئے۔

"آپ نے اس کمرے کا دروازہ بھیڑا تو ایک جھری سی بن گئی تھی۔ اس میں سارا

منظر دکھائی دے رہا تھا۔" میں نے فوراً بات بنائی۔

"تو بڑی حرامی چیز ہے۔" انسپکٹر صاحب نے قہر آلود نظروں سے مجھے گھورا۔ "میں تو بعد میں تیری خبر لوں گا۔ پہلے تو مجھے ان کے بارے میں بتا...... یہ عورت کہہ رہی ہے کہ اس کے پاس شناختی کارڈ ہے۔ اس پر اس کا اور اس کے شوہر کا نام لکھا ہوا ہے۔"

"یہ جعلی کارڈ اس نے کراچی میں بروکر سے بنوایا ہے۔ اس کے دلال اکمل نے بھی اپنا جعلی شناختی کارڈ بنوایا ہوا ہے۔ آپ ان کے فلیٹ کی تلاشی لیں گے تو آپ کو الماری کی دراز میں اصل شناختی کارڈ مل جائیں گے...... میں اس عورت نیلم کے بارے میں بتاؤں کہ وہ کیوں اور کس لئے اس شخص کے ساتھ کراچی آ گئی...... نیلم نے تین برس قبل ہیرا منڈی کی ایک سولہ برس کی طوائف شاداں کو اکمل کے ساتھ مل کر اس لئے قتل کر دیا تھا کہ وہ ایک زمیندار کی داشتہ بن گئی تھی۔ شاداں نے اس کی جگہ لے لی تھی جو نیلم کو بہت برا لگا، کیونکہ زمیندار کے پاس بڑا مال تھا، اُس کے باپ کو مرے زیادہ دن نہیں ہوئے تھے۔ وہ ایک مرغا تھا۔ یہ دونوں شاداں کو قتل کر کے، اُس کے زیورات اور رقم لے کر افغانستان چلے گئے۔ پھر وہاں دو مہینے رہ کر سیدھے کراچی آ گئے۔ پولیس کو ان پر نہیں بلکہ ایک اور طوائف پر شک تھا۔ وہ اندر ہو گئی۔ اُس پر مقدمہ چل رہا ہے۔ یہ دونوں اس لئے بھی وہاں سے فرار ہو گئے کہ ان کے دلوں میں چور تھا۔ تین ماہ پیشتر ان کی نظروں سے ایک خبر گزری تھی کہ لاہور پولیس ان دونوں کو سرگرمی سے تلاش کر رہی ہے۔ پولیس نے جس عورت کو گرفتار کیا تھا اُسے عدم ثبوت کی بناء پر رہا کر دیا۔ ان دونوں نے ایک منصوبہ بنایا کہ شیرازی سے بیس لاکھ کی رقم وصول کر کے یہ ملک چھوڑ دیں۔"

وہ دونوں بھونچکے ہو گئے اور اُن کے چہرے سفید پڑتے چلے گئے۔ وہ دل میں ششدر تھے اور اُن کے دماغ چکرا رہے تھے کہ ان ساری باتوں کا مجھے علم کیونکر اور کیسے ہوا ہے؟ اُن کی سٹی گم ہو گئی تھی۔ وہ اس طرح ساکت و جامد تھے جیسے ان پر کوئی بجلی آ گری ہو۔

پھر میں نے اپنی بات جاری رکھی۔ "آپ کو میری بات کا یقین نہیں آ رہا ہے تو آپ لاہور کی پولیس سے رابطہ کر کے دیکھیں...... میں کچھ باتیں اور گوش گزار کر دوں۔ اس عورت نے شیرازی پر ڈورے ڈالے اور اسے اپنے جال میں پھانسنے کی بہت کوشش کی۔ وہ شریف آدمی اس کے جال میں نہیں آیا۔ پھر یہ دونوں ایک منصوبہ بنا کر آپ کے پاس آئے

کہ آپ کو اعتماد میں لے کر شیرازی کو پھانس کر اُس سے پچاس لاکھ کی رقم وصول کر کے ففٹی ففٹی کر لیں۔ اب میں نے ان کا بھانڈا پھوڑ دیا ہے اس لئے یہ حیران اور خاموش ہیں۔''

یہ تمام باتیں میں نے اُن دونوں کے ذہن سے معلوم کی تھیں۔ ادھر انسپکٹر صاحب پچاس لاکھ روپے کی بات سن کر کسی اور انداز میں سوچنے لگے۔ پچاس لاکھ روپے کا خواب دیکھنے لگے۔ کیونکہ نگہت اور اُس کے فرضی شوہر کی کمزوری اور اصلیت کا پتہ چل گیا تھا۔ وہ خوابِ شیریں دیکھ رہے تھے کہ ایک سپاہی سراسیمگی سے اندر داخل ہوا اور اُس نے ایک سلیوٹ مار کر کہا۔ ''سر! غضب ہو گیا۔''

''کیا ہو گیا؟'' انسپکٹر صاحب نے اُسے خشمگیں نظروں سے گھورا۔ اُنہیں اُس کا آنا سخت ناگوار لگا تھا۔

''ہائی کورٹ سے بیلف آیا ہوا ہے۔ اُس کے ساتھ دو فوجی بھی ہیں۔ سب انسپکٹر نے انہیں اپنے کمرے میں روکا ہوا ہے۔''

''وہ کس لئے؟'' انسپکٹر صاحب اُچھل کر کھڑے ہو گئے۔ اُن کا چہرہ بے رنگ ہو گیا۔

''وہ حوالات کی تلاشی لینے اور ریکارڈ چیک کرنے آئے ہیں۔ نذر خان جونیجو کو غیر قانونی طور پر زیرِ حراست رکھا ہے نا......''

''اچھا تم چلو، میں آتا ہوں۔'' انسپکٹر صاحب بولے۔ پھر اُنہوں نے بدحواسی سے کہا۔ ''کریم بخش! چلو...... ہم نذر خاں جونیجو کو وہاں سے......''

وہ اتنا کہہ کر کریم بخش کو ساتھ لے کر کمرے سے نکل گئے۔ بدحواسی اور سراسیمگی میں اُنہیں میرا خیال ہی نہیں رہا۔ میرے لئے یہ سنہری موقع تھا کہ میں اس سے فائدہ اُٹھاؤں۔ نگہت اور اُس کا آدمی سر جوڑ کر سرگوشیاں کرنے لگے۔ وہ بھی یہاں سے بھاگنے کا سوچ رہے تھے۔ کیونکہ میں نے اُن کا بھانڈا پھوڑ دیا تھا۔ میں نے ایک پل کی بھی تاخیر نہیں کی۔ میں کمرے سے نکلا۔ راہداری خالی پڑی تھی کیونکہ تمام پولیس والے اُس کمرے کے سامنے کھڑے اندر جھانک رہے تھے جس میں ہائی کورٹ کا بیلف، فوجی افسران اور نذر خان جونیجو کے دو رشتہ دار موجود تھے۔ میں گیٹ سے نکلنے کی بجائے مسجد کی طرف بڑھا۔ مسجد میں داخل ہو کر اُس راستے سے نکل آیا جو باہر کو جاتا تھا۔

پولیس سٹیشن کے سامنے ایک رکشہ آ کر رُکا۔ اُس میں سے دو آدمی اُترے۔ ایک شخص

کے سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ دوسرے آدمی نے رکشہ والے کو بیس روپے دیئے تو رکشہ والے نے کہا۔ ''صدر سے یہاں کا کرایہ تیس روپے بنتا ہے۔ یہ تم کیا دے رہے ہو؟''

اُس شخص نے اپنی جیب سے دس روپے کا نوٹ نکال کر رکشہ والے کو دیا تو میں رکشہ میں بیٹھ گیا۔ رکشہ والے نے رکشہ اسٹارٹ کرتے ہوئے پوچھا۔ ''آپ کو کہاں جانا ہے؟ میں صرف صدر جاؤں گا۔ کیونکہ مجھے رکشہ ٹھیک کروانا ہے۔ تیس روپے لوں گا۔''

''مجھے بھی صدر ہی جانا ہے۔'' میں نے فوراً کہا۔ ''تیس روپے ہی دُوں گا تم فکر نہ کرو۔''

ایک ایک ساعت میرے لئے خوفناک اور عذاب ناک تھی۔ میں تھانے کے گیٹ کی طرف دیکھ رہا تھا تو ایسا لگ رہا تھا جیسے اندر کریم بخش یا وہ سپاہی جو مجھے ریلوے سٹیشن سے گرفتار کر کے لائے تھے، مجھے پکڑنے کے لئے بھاگے چلے آ رہے ہیں۔ لیکن وہاں کس کو ہوش تھا؟ اس پولیس سٹیشن پر چھاپہ پڑا تھا۔ ایک طوفان آیا ہوا تھا۔ انسپکٹر صاحب کا خواب چکنا چور ہو گیا تھا۔ اُنہیں لاکھ روپے کی آس بندھی ہوئی تھی۔ لیکن اب تو ذلت اور رُسوائی کے سوا کچھ نہیں رہا تھا۔ شریف اور بے گناہ آدمیوں کو تھانے میں رکھنا کوئی نئی بات نہیں تھی۔ یوں بھی انسپکٹر صاحب ایک کالی بھیڑ تھے۔ بہت ہی بدنام اور راشی افسر تھے۔ آج اُن کی شامت آ گئی تھی۔

رکشہ چل پڑا۔ میں نے اُن دونوں کو برق رفتاری سے پولیس سٹیشن سے باہر آتے ہوئے دیکھا۔ اُن پر سراسیمگی اور بدحواسی طاری تھی۔ چند لمحوں کے بعد وہ میری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ جب رکشہ خاصی دُور نکل آیا تب میں نے سکون و اطمینان کا گہرا سانس لیا۔ لیکن یہ میرے لئے عارضی تھا۔ میرے سینے میں ایک عجیب سی وحشت بھری ہوئی تھی۔ دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔

رکشہ والے نے مجھے جوہری بازار اُتار دیا۔ یہاں بڑی چہل پہل، رونق اور گہما گہمی تھی۔ مجھے اس وقت بڑے زور کی بھوک لگی تھی۔ چائے کی بھی طلب ہو رہی تھی۔ میں نہ صرف کھانا کھانا چاہتا تھا بلکہ بہت کچھ سوچنا بھی...... جب میں ہوٹل کی طرف بڑھا، فٹ پاتھ پر کھڑے ہو کر چشمہ بیچنے والے شخص نے مجھے روک لیا۔ ''یہ چشمہ خرید لیں۔ جرمنی کا بنا ہوا ہے۔''

فوراً ہی میرے ذہن میں ایک خیال آیا۔ پولیس سے بچنے کے لئے مجھے بہروپ بدلنا

اشد ضروری تھا۔ میں نے رنگین شیشوں کا ایک چشمہ پسند کیا۔ اُس نے اس کی قیمت ڈیڑھ سو روپے بتائی۔ میں نے اُس کے ذہن سے معلوم کرلیا کہ وہ پچاس روپے تک میں دے سکتا ہے۔ پھر میں نے اُس سے مول تول کر کے پچاس روپے میں ایک خوبصورت چشمہ خرید لیا، پھر ایک قریبی ہوٹل میں گھس گیا۔

ایک ہی درمیانے درجے کا مگر خاصا بڑا ہوٹل تھا۔ کچھ میزیں خالی پڑی ہوئی تھیں۔ میں ایک کونے والی میز پر جا بیٹھا۔ ویٹر کو میں نے کھانے کا آرڈر دیا۔ کھانے کے دوران میں نے اپنے ذہن پر بہت زور دیا۔ پہلے تو اپنے نام کے بارے میں سوچا، ذہن پر بہت زور دیا، پھر بھی مجھے اپنا نام یاد نہیں آیا۔ میں نے اپنے گھر والوں کے بارے میں سوچا، وہ بھی یاد نہیں آئے۔ میں فکر مند اور پریشان ہوگیا کہ یہ میری یادداشت کو کیا ہوگیا ہے؟ میں اپنی یادداشت کھو چکا ہوں۔ مجھے کچھ بھی تو یاد نہیں آ رہا ہے کہ میں کہاں سے آ رہا ہوں؟ میرے سوٹ کیس میں غیر ملکی کرنسی، پاسپورٹ اور کپڑے بھی تھے۔ میرا سوٹ کیس چوری نہ ہوا ہوتا تو مجھے میرا پتہ چل گیا ہوتا۔

اس سے بھی حیرت انگیز بات یہ تھی کہ میں دوسرے کا ذہن پڑھ سکتا تھا۔ جبکہ تھانے میں، میں نے نہ صرف پولیس انسپکٹر بلکہ اُن دونوں کا ذہن بھی پڑھ لیا تھا۔ میں اُن کی رگ رگ سے واقف ہو چکا تھا۔ اُن کی ساری سوچ، زندگی اور ذہن مجھ سے چھپا نہیں رہا تھا۔ لیکن میرا ذہن میرے لئے ایک کورا کاغذ بن چکا تھا اور اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔

میں نے چائے پیتے ہوئے سوچا کہ اب مجھے اپنے آپ کو تلاش کرنا ہوگا۔ لیکن سوال یہ تھا کہ میں کیسے، کس طرح اور کیونکر تلاش کرسکتا ہوں، کہاں تلاش کروں؟ صرف ایک ہی ایسی صورت تھی جس کی مدد سے میں اپنے آپ کو تلاش کرسکتا تھا۔ میرا کوئی رشتہ دار یا جاننے والا مل جائے۔ میں اُس کے ذہن سے اپنے بارے میں معلوم کرسکتا تھا۔ لیکن وہ ہے کہاں

مجھے کئی مسئلے درپیش تھے۔ ایک تو میری رہائش سب سے اہم مسئلہ تھا۔ میں کراچی کس لئے اور کیوں آیا تھا؟ شاید اسی شہر میں میرا گھر، میرے رشتے دار اور جاننے والے تھے۔ یہ شہر بہت بڑا تھا اور اس کی آبادی کروڑ سے تجاوز کئے ہوئے تھی۔ بہت کالونیاں، آبادیاں اور علاقے چار سمتوں میں دُور دراز فاصلے پر تھے۔ وہاں جا کر اپنے گھر یا رشتہ داروں کی تلاش کرنے میں کئی دن بھی لگ سکتے تھے۔ اب میرے

بس ایک راستہ اور صورت رہ گئی تھی کہ میں روزانہ ایک ایک علاقے، کالونی اور آبادی میں جا کر اپنے گھر اور جاننے والوں کو تلاش کروں...... اس کے سوا چارہ بھی نہیں رہا تھا۔

میں اپنے اخراجات کے بارے میں سوچنے لگا کہ میں کہاں سے اور کیسے پورا کروں گا؟ پھر مجھے خیال آیا کہ میرے بٹوے میں شاید بڑی رقم موجود ہے۔ پھر میں نے بٹوا جیب سے نکال کر رقم گنی۔ اُس میں سولہ ہزار نو سو روپے موجود تھے۔ اگر میں نے یہ رقم جیب میں نہ رکھی ہوتی تو اس وقت قلاش اور مفلس ہوتا۔ ایک فقیر سے بھی بدتر ہوتا۔ ایک وقت کا کھانا تو درکنار ایک کپ چائے پینا بھی نصیب نہیں ہوتا۔ یہ رقم اس وقت میرے لئے بہت بڑی دولت اور سہارا تھی۔ میں اس رقم کی بدولت کئی مہینوں تک قدرے قناعت کی زندگی گزار سکتا تھا۔ میں ایک بہت بڑی مصیبت اور محتاجی سے بچ گیا تھا ورنہ بھیک مانگنے کی نوبت آ جاتی۔

میں نے رہائش کے بارے میں سوچنا شروع کیا۔ کسی کالونی یا آبادی میں مجھے فوری طور پر کوئی کمرہ کرایہ پر نہیں مل سکتا تھا۔ میرے لئے اب یہ صورت تھی کہ میں کسی عام قسم کے ہوٹل میں ایک کمرہ کرایہ پر لے لوں جو بہت ہی سستا مل جائے گا۔ پھر ایک دستی بیگ، دو تین ریڈی میڈ جوڑے اور شیونگ کٹ بھی خرید لوں۔ میں یہ سب کچھ سوچتے ہوئے چائے پینے لگا۔ یہ میں نے چائے کا دوسرا کپ منگوایا تھا۔ اس ہوٹل کا کھانا بھی بہت اچھا اور مزیدار تھا۔ چائے بھی بہت اچھی تھی۔

میں آخری گھونٹ لے رہا تھا کہ میرے ہاتھ سے چائے کی پیالی چھوٹتے بچی۔ اُس وقت دو پولیس والے جن میں ایک سب انسپکٹر اور دوسرا حوالدار تھا، ایک دراز قد شخص کے ساتھ اندر داخل ہو رہے تھے۔ وہ اندر داخل ہو کر چاروں طرف نظریں دوڑانے لگے تو میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا اور میری پیشانی عرق آلود ہوگئی۔ میں نے دہشت زدہ ہو کر سوچا کہیں انہیں میری تلاش تو نہیں ہے؟ وہ پہچاننے کی کوشش تو نہیں کر رہے ہیں؟ میں نے اس وقت چشمہ پہن رکھا تھا۔ ان تینوں میں سے ایک کی نگاہ میری طرف اٹھی ہوئی تھی۔ اب میرے لئے فرار کی راہ بھی نہیں رہی تھی۔ کوئی دوسرا راستہ بھی نہیں تھا جس سے میں نکل جاؤں۔ پھر وہ تینوں میری میز کی طرف بڑھے۔ میری رگوں میں لہو سرد ہونے لگا۔ میں بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ تھوڑی دیر کی بات تھی میرے ہاتھوں

میں ہتھکڑی لگنے والی تھی۔ لیکن جب وہ میز کے پاس سے گزر کر پیچھے والی میز پر جا کر بیٹھے
تو میری جان میں جان آئی۔ میں نے اپنا شک دُور کرنے کے خیال سے ان تینوں کا ذہن
پڑھا۔ دونوں پولیس والے ایک مرغا پھانس کر لائے تھے کہ اس سے رشوت لیں اور کھا
کھائیں۔ سادے لباس میں ملبوس شخص نے ایک ہیر ڈنچی کو اپنی گاڑی سے کچل دیا تھا۔ وہ
چونکہ گرفتاری سے بچنا چاہتا تھا اس لئے معاملات طے کرنے آیا تھا۔ اُن کی میز پر ویٹر
آرڈر لینے گیا تو حوالدار نے تین پلیٹ مرغ پلاؤ، چکن کڑاہی اور تافتان کا آرڈر دیا۔

میرے ذہن میں پولیس کا بالکل بھی خیال نہیں رہا تھا کہ وہ مجھے تلاش کرے گی اور کر
سکتی ہے۔ میں کسی صورت میں بخشا نہیں جاؤں گا۔ کیونکہ میں ان کے نزدیک ایک قاتل
تھا، ملزم تھا۔ اور پھر میں موقع پا کر تھانے سے فرار ہو گیا تھا یہ بھی ایک جرم تھا۔ لہٰذا اب
ضرورت اس بات کی تھی کہ میں چوکنا اور محتاط رہوں۔ پولیس کے سائے اور عفریت سے
بچنے کی ایک ہی صورت تھی کہ ایسا بہروپ بھرلوں کہ میری شناخت نہ ہو سکے۔ جن جن
پولیس والوں نے مجھے دیکھا تھا، وہی میری شناخت بھی کر سکتے تھے۔ اس بات کا امکان تھا
کہ پولیس اخبارات میں میری قلمی تصویر شائع کر دے اور مجھے اشتہاری ملزم قرار دے۔
کل کے اخبارات میں ریل گاڑی میں قتل کی واردات کی خبر شائع ہونے والی تھی۔ میری
تصویر اور حلیہ شائع ہونے کی صورت میں میرے لئے بڑی مشکل کھڑی ہو سکتی تھی۔

میں یوں بھی سینکڑوں میں نہیں، ہزاروں میں نہیں بلکہ لاکھوں میں منفرد تھا۔
خوبصورت اور پُرکشش شخصیت کا مالک۔ اس لئے میری شناخت مشکل نہ تھی۔ میں سوچ
میں پڑ گیا کہ کیا بہروپ بھروں......؟ صرف رنگین شیشوں کا چشمہ پہننے سے بات نہیں بنتی
تھی۔ ایک صورت اور تھی کہ میں داڑھی رکھ لوں۔ لیکن داڑھی ایک دو دن میں بڑھنے سے
رہی تھی۔ گھنی داڑھی کے لئے دو تین ہفتے درکار تھے۔ جبکہ یہاں دو تین گھنٹے اور دن بھی
بہت بھاری تھے۔ داڑھی اور مونچھیں رکھنے سے میرا حلیہ خاصا تبدیل ہو جاتا۔ میں فوری
طور پر ایسا بہروپ بھرنا چاہتا تھا کہ کوئی مجھے پہچان نہ سکے۔

تھوڑی دیر کے بعد میں ہوٹل سے نکلا اور جوہری بازار کی طرف بڑھا۔ میں اس خیال
سے جوہری بازار کی گلیوں میں گھومنے لگا کہ شاید اس بازار میں میرا کوئی شناسا، رشتہ دار،
دوست یا گھر کا فرد مل جائے۔ میں کوئی ایک گھنٹے تک ساری گلیوں میں گھومتا رہا۔ یہاں

کوئی بھی ایسا شخص نہیں ٹکرایا جو مجھ سے واقف ہو، جو مجھے پہچان لے یا میں اُسے پہچان
لوں۔ کس قدر حیرت اور تعجب کی بات تھی کہ سینکڑوں اور ہزاروں مردوں اور عورتوں میں
میرا ایک بھی شناسا اور واقف کار نہیں نکلا۔ جبکہ جوہری بازار شہر کے بڑے اور پرانے
بازاروں میں سے ایک تھا۔ شہر میں اور بھی نئے بازار بن گئے تھے لیکن اس کے باوجود شہر
کے مختلف علاقوں میں سے لوگ آج بھی یہاں خریداری کے لئے آتے تھے۔ یہاں
خریداری فخر اور بڑے پن کی نشانی تھی۔

یہ بات بھی میرے لئے حیرت انگیز اور تعجب خیز تھی کہ میں شہر کے تمام علاقوں اور ان
کے ناموں سے بہت اچھی طرح واقف ہوں۔ میں اس امر سے واقف تھا کہ کون سے
روٹ کی بس کہاں جاتی ہے؟ یہاں سے فلاں علاقے کا فاصلہ کتنا ہے؟ اس شہر کے اعلیٰ
اقامتی علاقے کون کون سے ہیں؟ لیکن میں اپنے نام، رہائش اور گھر والوں کے نام اور ان
کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ جبکہ ایک شخص اگر اپنی یادداشت کھو چکا ہے تو پھر اسے کچھ
بھی یاد نہیں رہنا چاہئے۔

میں جوہری بازار سے زیب النساء سٹریٹ آیا تو شام ہو چکی تھی۔ روشنیوں نے زیب
النساء سٹریٹ کا حسن دوبالا کر دیا تھا۔ اس وقت وہ کسی پُر شباب حسینہ کی طرح دکھائی دے
رہی تھی۔ بڑی رونق، چہل پہل اور رنگینی ہر سمت دکھائی دے رہی تھی۔ اس کا حسن حسین
لڑکیوں اور عورتوں کی مستانہ خرامی، اُن کے سراپا اور جاذبیت نے دوچند کر دیا تھا۔ لیکن
مجھے یہاں مایوسی اور نا اُمیدی کا منہ دیکھنا پڑا۔ پھر میں وکٹوریہ روڈ آ گیا۔ وکٹوریہ روڈ پر
اب وہ حسن نہیں رہا تھا جو پہلے کبھی ہوا کرتا تھا۔ میں وکٹوریہ روڈ غیر ارادی طور پر آ نکلا تھا۔
میں بڑی بڑی دُکانوں میں جھانکتا پھرتا رہا۔ مردوں اور عورتوں کے ذہن پڑھتا رہا۔

میں نے سوچا کہ شام ہو چکی ہے کیوں نہ کینٹ سٹیشن جا کر وہاں کسی ہوٹل میں کمرہ
کرائے پر لے لوں۔ میں بہت تھک چکا تھا اور آرام کرنا چاہتا تھا۔ پھر خیال آیا۔ کہ بغیر
سامان کے ہوٹل میں کمرہ لینے سے مشکوک ہو سکتا ہوں، اس لئے ضروری تھا کہ میں
جوہری بازار جا کر ایک دستی بیگ اور دو تین جوڑے اور زیر جامے بھی خرید لوں۔ اس
خیال کے آتے ہی میں نے جوہری بازار کا رُخ کیا۔

میں وکٹوریہ روڈ کی بغلی گلی میں زیب النساء سٹریٹ جانے کے لئے داخل ہو گیا۔ یہ گلی

اس وقت سنسان اور ویران پڑی تھی۔ دائیں بائیں اِکا دُکا گاڑیاں پارک تھیں۔ گلی میں اندھیرا سا تھا۔ اس گلی کے سرے اور درمیان میں کوئی دُکان نہیں تھی۔ میں چند قدم چل کر ٹھٹک کے رُک گیا۔ میرے جسم پر ایک وحشت ناک سی سنسنی دوڑ گئی۔ تین بدمعاش جو ریوالوروں سے مسلح تھے ایک خوش پوش مرد کو اپنے حصار مین لے رہے تھے جس کے ہاتھ میں ایک سیاہ بریف کیس تھا۔ اُس کی عمر ساٹھ برس کے لگ بھگ ہوگی۔ لیکن وہ صحت مند اور چاق و چوبند تھا۔ بدمعاش اُس کے ہاتھ سے بریف کیس چھین لینا چاہتے تھے۔

اُس خوش پوش مرد نے مجھے دیکھ لیا تھا لیکن وہ انجان ہی رہا۔ اس کے اور میرے درمیان دو تین قدم کا فاصلہ تھا وہ مجھ سے مدد کا طالب بھی نہیں ہوسکتا تھا کیونکہ میں نہتا تھا، مسلح بدمعاشوں سے اُسے بچا نہیں سکتا تھا۔ اس بات کو وہ بھی سمجھ گیا۔ یہ تینوں بدمعاش نوجوان لڑکے تھے۔ ابھی تو اُن کی مسیں بھیگ رہی تھیں۔

ایک بدمعاش نے غراتے ہوئے بریف کیس والے سے کہا۔ ''خیریت چاہتے ہو تو شرافت سے یہ بریف کیس میرے حوالے کردو!''

''میں ایک شرط پر بریف کیس تمہیں دے سکتا ہوں۔'' اُس شخص نے بدمعاش سے کہا۔

''کوئی شرط ورط نہیں چلے گی...... میں تمہارے باپ کا نوکر نہیں ہوں۔ لاؤ جلدی سے بریف کیس دو۔'' اُس بدمعاش کی آواز سے صاف محسوس ہورہا تھا کہ وہ نروس ہورہا تھا۔

بریف کیس والے نے بڑے پُرسکون لہجے میں کہا۔ ''ہٹ دھرمی سے باز آجاؤ.. میری شرط بہت چھوٹی سی ہے، بڑی آسان ہے۔ تمہارے لئے قابل قبول ہے۔ شرط نہیں مانو گے تو پھر یہ بریف کیس تمہیں کسی قیمت پر نہیں ملے گا...... اچھی طرح سوچ لو...... سمجھ لو!''

''کیا شرط ہے تمہاری؟'' اُس نے بگڑتے ہوئے برہمی سے پوچھا۔ ''جلدی سے بتاؤ۔''

''تم تینوں اپنے اپنے ریوالور جیبوں میں رکھ لو۔ پھر یہ بریف کیس لے کر چلتے بنو۔'' بریف کیس والے نے کہا۔

''تم یہ چاہتے ہو کہ ہم غیر مسلح ہو جائیں اور تم اپنے ریوالور کے زور پر ہمیں گرفتار کرا دو۔'' بدمعاش نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ ''کیا تم ہمیں بیوقوف سمجھتے ہو جو تمہاری باتوں میں آجائیں گے؟''

''میرے پاس ریوالور یا پستول تو کیا ایک قلم تراش بھی نہیں ہے۔ تم میری تلاشی لے

سکتے ہو۔''

''یار! اس کی بات مان لو۔ جلدی کرو۔'' اُس کے ساتھی نے مشورہ دیا۔ ''باتوں میں وقت ضائع نہیں کرو۔''

اُس بدمعاش کے چہرے کے تاثرات سے ایسا لگ رہا تھا کہ اُس شخص کی یہ عجیب شرط سن کر اُسے بڑی حیرت ہورہی ہے۔ تاہم اُس نے اپنے ساتھی کے کہنے پر اپنا ریوالور اپنی جیب میں رکھا تو اُس کے ساتھیوں نے بھی اُس کی پیروی کی۔ پھر وہ تینوں اُس کے گرد اپنا گھیرا تنگ کرنے لگے۔ بریف کیس والے شخص نے دونوں ہاتھوں سے بریف کیس پکڑ کر اُوپر اُٹھایا اور یکلخت اُسے میری طرف اس طرح سے پھینک دیا جیسے وہ باسکٹ بال ہو۔ اُس نے جیسے مجھے پاس دیا ہو۔ یہ میرے لئے اچانک اور غیر متوقع تھا۔ میں ایک دم سے چونک گیا۔ میں نے اسے فضا ہی میں پکڑ لیا، اسے زمین پر گرنے نہیں دیا۔

پھر بریف کیس والے نے ہذیانی لہجے میں کہا۔ ''مسٹر! یہ بریف کیس لے کر بھاگ جاؤ...... جلدی کرو......!''

بریف کیس بہت بھاری تھا۔ ایک لمحے کے لئے میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا کیونکہ میں ذہنی طور پر اس کے لئے تیار نہ تھا۔ میں جتنی دیر میں بریف کیس کو سنبھالتا، اتنی دیر میں اُن بدمعاشوں نے بلا کی تیزی اور پھرتی دکھائی۔ وہ تینوں میری طرف برق رفتاری سے لپکے۔ اُن میں سے وہ بدمعاش سب سے آگے تھا جس نے ریوالور جیب میں رکھنے کا مشورہ دیا تھا۔ وہ بدمعاش میری راہ میں حائل تھا۔ میں بریف کیس لے کر بھاگ نہیں سکتا تھا۔ میں نے اُس کی طرف تیزی سے ایک قدم بڑھایا اور پوری قوت سے بریف کیس اُس کے سر پر دے مارا جس کی اُسے توقع نہیں تھی۔ بریف کیس کی ضرب لگتے ہی اُس کی کھوپڑی بج اُٹھی۔ وہ اپنا توازن قائم نہ رکھ سکا اور چکراتا ہوا زمین پر گرا اور بے ہوش ہوگیا۔ دوسرا بدمعاش جو اُس کے پیچھے تھا وہ مجھ پر حملہ آور ہوا تو میں نے بریف کیس اُس کے منہ پر اس بری طرح دے مارا کہ وہ لڑکھڑاتا ہوا قریب کھڑی ایک گاڑی کے بونٹ پر گرا اور بیہوش ہوگیا۔

تیسرے بدمعاش کو جو مہلت ملی تو اُس نے فوراً اپنی جیب سے ریوالور نکال لیا لیکن میں نے اُسے مہلت نہیں دی۔ میں نے بریف کیس اُس کے ریوالور والے ہاتھ پر دے مارا تو اُس کے منہ سے ایک دل خراش چیخ نکلی اور ریوالور اُس کے ہاتھ سے چھوٹ کر

بریف کیس والے کے پیروں کے پاس جا گرا۔ اُس نے فوراً ہی ریوالور اُٹھا لیا۔ اُس بدمعاش نے ریوالور جو بریف کیس والے کے ہاتھ میں دیکھا تو وہ بگٹٹ وکٹوریہ روڈ کی طرف بھاگنے لگا۔ اپنے بے ہوش ساتھیوں کو مصیبت میں چھوڑ گیا۔

بریف کیس والے شخص نے میرے پاس آ کر میرے ہاتھ سے بریف کیس لیا اور بولا۔ ''میرے ساتھ چلیں۔''

چند قدم پر ایک سفید رنگ کی ٹویوٹا کرولا گاڑی کھڑی تھی۔ اُس نے دروازہ کھولا اور اندر بیٹھ کر دوسری طرف کا دروازہ کھول دیا۔ کچھ لوگ اس گلی میں کھڑے یہ تماشہ دیکھ رہے تھے۔ میں جیسے ہی گاڑی میں بیٹھا، اُس نے انجن سٹارٹ کیا اور گاڑی آگے بڑھا دی۔ گاڑی جب زیب النساء سٹریٹ پر آئی تو اُس نے کہا۔ ''آپ کا بہت بہت شکریہ...... آپ نے بڑی بہادری اور ذہانت سے کام لیا جس کی مجھے توقع نہیں تھی۔ آپ نے دونوں کا جو حشر نشر کیا ہے اسے وہ ساری زندگی نہیں بھولیں گے۔ تیسرا بھی کیا میدان چھوڑ کر بھاگا ہے۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ یہ تینوں لڑکے جرائم پیشہ نہیں تھے۔ یہ شاید ان کی پہلی واردات تھی۔ اس لئے ان کی آواز میں کپکپاہٹ تھی۔ وہ گھبرائے ہوئے تھے...... اُنہوں نے ریوالور میرے کہنے پر اپنی جیبوں میں رکھ لئے۔'' وہ ایک قہقہہ مار کر ہنسا۔

''آپ نے ان دونوں کو پولیس کے حوالے کس لئے نہیں کیا؟'' میں نے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''اس لئے کہ میں پولیس والوں کے چکر میں پڑنا نہیں چاہتا۔'' وہ کہنے لگا۔ ''میں دو ایک مرتبہ ایسی واردات سے دوچار ہو چکا ہوں۔ اپنی ہوشیاری اور ذہانت سے لٹنے سے بچ گیا، رقم بھی بچ گئی اور ان ڈکیتوں کو پکڑ کر پولیس کے حوالے کر دیا۔ لیکن مصیبت میری بھی آ گئی...... پولیس والوں نے میرا جینا حرام کر دیا۔ یہ رقم کہاں سے آئی؟ کالا دھن ہے یا سفید دھن؟ اس کا انکم ٹیکس دیا ہوا ہے کہ نہیں؟ آپ ثابت کریں کہ یہ رقم آپ کی ہے۔ کہاں سے اور کیسے آئی؟ اس روز سے میں نے توبہ کر لی کہ لٹ جانے کی صورت میں بھی پولیس کے پاس نہیں جاؤں گا۔ اس لئے اُن مردودوں کو بے ہوش چھوڑ دیا۔''

اُس نے اپنی گاڑی ایک اقامتی عمارت کے سامنے روک دی۔ پھر اُس نے بریف کیس اُٹھاتے ہوئے کہا۔ ''پلیز! آپ پانچ منٹ کے لئے اجازت دیں۔ میں یہ امانت

پہنچا کر حاضر ہوتا ہوں۔''

وہ کوئی سات منٹ کے بعد عمارت کے بیرونی دروازے سے باہر آتا دکھائی دیا۔ اُس کا چہرہ دمک رہا تھا۔ اُس نے گاڑی میں بیٹھ کر انجن سٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔ ''میں اب اپنے آپ کو بے حد ہلکا پھلکا سا محسوس کر رہا ہوں۔''

میں نے اُس کی بات کا جواب نہیں دیا۔ وہ گاڑی کو سڑک پر لاتے ہوئے بولا۔

''دولت بھی کسی عذاب سے کم نہیں ہوتی ہے۔ یہ رقم ایک پارٹی کی امانت تھی۔ میں اگر لٹ جاتا تو نجانے میرا کیا حشر ہوتا؟ کیونکہ میں اس کا ذمہ دار ہوتا اور مجھے رقم ادا کرنا پڑتی۔ اب میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ آئندہ سے یہ ذمہ داری قبول نہیں کروں گا۔ خطرہ مول نہیں لوں گا۔ یہ عمر ایسے خطرات مول لینے کے لئے نہیں ہوتی ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟''

''میں کیا کہہ سکتا ہوں؟ آپ ہی بہتر سمجھ سکتے ہیں۔'' میں نے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

''میں تو جیتے جی مر جاتا...... اللہ نے بچا لیا۔ اُس نے میری مدد کے لئے آپ کو بھیج دیا، ورنہ شاید آج میں نہ صرف لٹ جاتا بلکہ موت سے ہمکنار بھی ہو جاتا۔ میں تقریباً روز ہی پستول ساتھ رکھتا ہوں کیونکہ بدمعاش گاڑی چھیننے کی کوشش کرتے ہیں۔ روز بروز رہزنی اور ڈکیتی کی وارداتوں میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ کم ہونے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی ہے۔ پولیس بھی ان پر قابو پانے میں ناکام ہو چکی ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ پولیس میں جو کالی بھیڑیں موجود ہیں وہ ان جرائم پیشہ کی سرپرستی کرتی ہیں۔ اس میں ان کا مساوی حصہ ہوتا ہے۔ اللہ نے میری مدد کے لئے آپ کو بھیج دیا۔ اور پھر یہ لڑکے ناتجربہ کار اور کم عمر بھی تھے۔ سراسیمہ اور بدحواس بھی تھے، اس کا اندازہ آپ اس بات سے کر سکتے ہیں کہ میں نے اُن سے ریوالور جیب میں رکھنے کے لئے کہا تو میری بات فوراً ہی مان لی جس کی مجھے توقع نہیں تھی۔ دوسری طرف اس بات کا قوی امکان تھا کہ وہ مجھے گولی مارنے سے بھی نہیں چوکتے...... آپ نے اُن کا خوب مقابلہ کیا۔ میں آپ کا یہ احسان کبھی نہیں بھلا سکتا۔''

''میں نے کوئی احسان نہیں کیا بلکہ اپنا فرض ادا کیا ہے۔ آپ اسے احسان کا نام نہ دیں۔'' میں نے کہا۔

''آپ نے میری رقم بچانے کے لئے اپنی جان کی بھی پرواہ نہیں کی۔ آپ کی جگہ کوئی اور ہوتا تو وہ بریف کیس ان کے حوالے کر کے اپنی جان بچاتا...... آپ نے جرأت اور بہادری دکھائی۔ جبکہ اس میں آپ کی کوئی غرض پوشیدہ نہ تھی۔''

اُس نے اتنا کہہ کر ایک ایئر کنڈیشنڈ ریسٹورنٹ کے آگے گاڑی روکی۔ میرے کہنے سے پیشتر اُس نے کہا۔ ''چلیئے...... اندر چل کر کچھ پیتے ہیں۔ مجھے آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔''

میں نے سوچا کہ انکار کر دُوں کیونکہ مجھے دیر ہو رہی تھی۔ کچھ چیزیں بھی خریدنی تھیں۔ ٹھیک آٹھ ساڑھے آٹھ بجے دُکانیں بند ہونا شروع ہو جاتی تھیں۔ اس وقت سات بج کر دس منٹ ہو رہے تھے۔ لیکن میں چاہتے ہوئے بھی انکار نہ کر سکا۔

پھر میں اُس کے ساتھ ریسٹورنٹ میں داخل ہوا۔ اس کا ہال وسیع اور بہت خوبصورتی سے آراستہ و پیراستہ تھا۔ میزیں بھری ہوئی تھیں۔ اُن میں نوجوان جوڑے بھی تھے۔ اُن کی موجودگی سے بھی ماحول بڑا خوابناک سا ہو گیا تھا۔ ایک کونے میں ایک میز خالی تھی۔ ہم اُس پر جا بیٹھے۔ اُس نے ویٹر کو بلا کر فالودہ آئس کریم کا آرڈر دیا۔

جس وقت وہ ویٹر کو آرڈر دے رہا تھا تب میں نے اُسے غور سے دیکھا، وہ اپنی وضع قطع اور چہرے مہرے سے خوشحال گھرانے کا فرد اور ایک اعلیٰ قسم کی شخصیت لگ رہا تھا۔ میں نے اُس کا ذہن پڑھ کر اُس کے بارے میں کچھ معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی۔ کیونکہ مجھے یہ بات مناسب نہیں لگی کہ میں ہر کسی کا ذہن پڑھتا پھروں۔ اس وقت اس کی ایسی کوئی خاص ضرورت نہ تھی۔

جب ویٹر چلا گیا تو اُس نے میری طرف مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''ہم دونوں اب تک ایک دوسرے سے متعارف نہیں ہوئے ہیں۔ میرا نام ایس بی یگانہ ہے۔ میں بزنس مین ہوں۔ میرا ایک کارخانہ ہے کپڑے کا۔ آپ کا نام کیا ہے؟''

''میرا نام...... ؟'' میں ایک پل کے لئے چکرایا۔ میں نے ادھر اُدھر دیکھا، سامنے والی میز پر ایک نوجوان جوڑا بیٹھا تھا۔ لڑکے کا نام سالار تھا۔ میں نے اُس کا نام اُس کے ذہن سے فوراً ہی معلوم کر لیا تھا۔ میں نے کہا۔ ''میرا نام سالار ہے۔''

''سالار...... بہت اچھا اور منفرد نام ہے۔'' اُس نے تعریفی لہجے میں کہا۔ ''آپ کا

مشغلہ کیا ہے؟''

''فی الحال تو کوئی مشغلہ نہیں ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''دراصل میں اپنے ایک چھوٹے بھائی کی تلاش میں آج ہی کراچی آیا ہوں جو میرے والد کی ڈانٹ پر گھر سے بھاگ گیا۔ میری والدہ اور بہنوں نے رو رو کر اپنا برا حال کر لیا ہے۔ میں اُس کی تلاش میں جوہری بازار سے ہوتا اِدھر آ نکلا تھا۔ آپ سے حادثاتی طور پر ملاقات ہو گئی۔ اب اُسے کل سے پھر تلاش کرنا شروع کر دُوں گا۔''

''اخبارات میں اُس کی گمشدگی کے اشتہارات اور تصویر شائع کرائی تھی؟'' اُس نے دریافت کیا۔

''جی ہاں......'' میں نے اثباتی انداز میں سر ہلایا۔ ''اس کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ اس لئے مجھے اُس کی تلاش میں کراچی آنا پڑا۔''

''آپ کے پاس اُس کی کوئی تصویر وغیرہ ہے؟ اگر ہے تو مجھے دے دیں۔ میں اُسے اخبارات میں مفت شائع کرا دُوں گا۔''

''اُس کی تصویر میرے پاس تھی۔ سفر کے دوران کسی نے میرا سوٹ کیس چرا لیا۔ نہ صرف میرے کپڑے بلکہ اُس کی تصویر بھی چوری ہو گئی۔''

''اوہ......'' اُس نے اظہارِ افسوس کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ کیا کسی رشتہ دار وغیرہ کے پاس ٹھہرے ہوئے ہیں؟''

''جی نہیں...... یہاں میرا کوئی رشتہ دار نہیں۔'' میں نے اُسے بتایا۔ ''میں کسی ہوٹل میں جا کر کمرہ لے کر رہوں گا۔''

''آپ کو ہوٹل میں ٹھہرنے کی کوئی ضرورت نہیں...... میرا وی آئی پی ٹائپ لگژری فلیٹ ہے۔ اُس میں کل سات کمرے ہیں جن میں چار بیڈ رُومز ہیں، ٹی وی لاؤنج، ڈائننگ اور ڈرائنگ رُوم میں کافی بڑے بڑے ہیں۔'' اُس نے کہا۔

''بہت بہت شکریہ۔ آپ پلیز! تکلف نہ کریں۔ میں ہوٹل میں ٹھہر جاؤں گا۔'' میں نے انکساری سے کہا۔

''یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں اپنے محسن کو ہوٹل میں ٹھہرنے دُوں...... آپ کو میرے ساتھ گھر چل کر ٹھہرنا ہوگا۔'' وہ بولا۔

پھر وہ مجھے اپنے لگژری فلیٹ پر لے کر پہنچا جو ڈیفنس سوسائٹی میں تھا۔ اُس نے اطلاعی گھنٹی بجاتے ہوئے کہا۔ ''معلوم نہیں مجھے آج کیا ہو گیا ہے...... میں چابی بھی گھر بھول گیا ہوں۔ ورنہ ایک چابی تو میرے پاس ہر وقت رہتی ہے۔ گھر میں تین تین ڈپلی کیٹ چابیاں موجود ہیں۔ میں آپ کو ایک چابی دے دُوں گا۔ آپ یہاں جب تک رہیں گے اُسے اپنے پاس رکھیں۔''

اگلے لمحے دروازہ کھلا۔ دروازہ ایک بہت ہی حسین و جمیل اور نوجوان لڑکی نے کھولا۔ اُس کی عمر بمشکل بیس برس کی ہو گی۔ اُس میں بڑی رعنائی و دلکشی تھی۔ وہ متناسب، چھریرے اور شاداب بدن کی تھی۔ اُس کا سراپا اور سرخ و سفید رنگت عجب بہار دے رہی تھی۔ اُس نے مجھے چونک کر دیکھا۔

یگانہ مجھے اندر لے کر داخل ہوا۔ میں اُس لڑکی سے نظریں نہ ہٹا سکا۔ ایسی خوبرو لڑکیاں سینکڑوں اور ہزاروں میں ایک ہی نظر آتی ہیں۔ جب وہ لڑکی دروازہ بند کر کے نشست گاہ میں آئی تو یگانہ نے اُس سے کہا۔ ''رخشندہ! اِن سے ملو...... یہ میرے محسن مسٹر سالار ہیں۔''

رخشندہ نے بڑی خندہ پیشانی سے آداب کیا اور یگانہ کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ''کیا مطلب......؟''

''مسٹر سالار نے تین مسلح بدمعاشوں سے نہ صرف میری جان بچائی ہے بلکہ پچاس لاکھ روپے بھی......'' یگانہ نے جواب دیا۔ ''انہوں نے تنہا تینوں بدمعاشوں پر قابو پایا اور اُن کی زبردست پٹائی بھی کر دی۔''

رخشندہ نے مجھے پُرستائش نظروں سے دیکھا۔ ''پھر تو مسٹر سالار میرے محسن بھی ہوئے۔''

''ہاں......'' یگانہ نے سر ہلایا۔ پھر مجھ سے کہا۔ ''آئی ایم سوری۔ میں نے آپ سے رخشندہ کا تعارف نہیں کرایا۔ یہ میری بیوی ہیں۔''

میں ششدر رہ گیا...... مجھے اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا۔ ایک بیس برس کی نوجوان لڑکی ایک ساٹھ برس کے شخص کی بیوی ہے...... یگانہ نے اس عمر میں اپنی نواسی یا پوتی کی عمر کی لڑکی سے شادی کی......؟ یہ ناقابل یقین یا انہونی بات نہیں تھی۔ ایسی شادیاں صرف ایشیا ہی میں نہیں بلکہ امریکہ اور یورپ میں بھی ہوتی تھیں اس میں حیرت کی بات اس لئے

تھی کہ یگانہ ایک پڑھا لکھا اور مہذب اور نفیس آدمی تھا۔ اس شخص سے اس بات کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ وہ چونکہ دولت مند تھا اس لئے اس نے ایک نوجوان لڑکی سے شادی ی ہوئی تھی۔ اس میں حیرت سے زیادہ دُکھ ہو رہا تھا۔

میں نے رخشندہ کے چہرے پر اُداسی کی ایک لہر دیکھی۔ اُس نے اپنے شوہر کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''میں آپ دونوں کے لئے کھانا لگا دُوں؟ یا کچھ دیر کے بعد کھائیں گے؟''

''ابھی نہیں...... تھوڑی دیر کے بعد۔ کیونکہ ہم دونوں آئس کریم فالودہ کھا کر آ رہے ہیں۔'' یگانہ نے کہا۔

''آپ دونوں کے لئے کولڈ ڈرنکس لیتی آؤں؟ کیا پینا پسند کریں گے؟'' رخشندہ نے ی انداز سے پوچھا۔

''کچھ نہیں...... تم بیٹھو...... میں ان کے بارے میں تمہیں کچھ باتیں بتاؤں۔'' یگانہ نے اُسے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

جب وہ سامنے والی کرسی پر سینے اور شانے پر پھسلتا ہوا دوپٹہ درست کرتی ہوئی بیٹھ گئی، ری نگاہ ارادی طور پر اُس کی طرف اُٹھ گئی۔ وہ مجھے ہی دیکھ رہی تھی۔ ہم دونوں کی نگاہیں چار ہوئیں۔ میں نے اُس کے چہرے سے نگاہیں ہٹا لیں لیکن وہ کسی ضدی بچے کی طرح اس کے سراپا کو دیکھنے کے لئے مچلنے لگیں۔ اُس کے انگ انگ سے مستی اُبلی پڑ رہی تھی۔ میں سوچے بغیر نہیں رہ سکا کہ رخشندہ نے خواب ناک زندگی اور دولت کی وجہ سے شادی کر لی۔ کیا ایک ایسی حسین لڑکی کے لئے کوئی جوان دولت مند شخص نہیں مل سکتا تھا؟ ایک بے مثال حسن و شباب کی لڑکی کے لئے کیا جوان اور اچھے گھروں کے رشتوں کی کوئی کمی تھی؟ وہ ایک تعلیم یافتہ، نفیس اور شائستہ مزاج کی لگ رہی تھی۔ کسی اچھے گھرانے سے اُس کا تعلق اُس کی وضع قطع اور چہرے مہرے سے ہو رہا تھا۔ بظاہر اس میں کوئی عیب اور خامی بھی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ اُس کی آواز میں بھی کھنک اور دلکشی تھی۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اس کے گھر والوں نے کسی وجہ سے اس کی شادی ایک بوڑھے شخص سے کر دی ہو۔

''مسٹر سالار اس وقت تک یہاں رہیں گے جب تک انہیں اپنا گمشدہ بھائی نہیں مل جاتا۔'' یگانہ کہنے لگا۔ ''ان کا چھوٹا بھائی والد کی کسی بات پر ڈانٹنے سے گھر سے بھاگ کر

کراچی آ گیا ہے۔ یہ اُسے یہاں تلاش کرنے آئے ہوئے ہیں۔ ایک اتفاقی لمحے
ہمیں ملا دیا۔ یہ میرے لئے مسیحا بن گئے، میرے محسن بھی..... لہٰذا تم ان کا ہر طرح
خیال رکھو گی۔''

''میں اپنی طرف سے اس بات کی کوشش کروں گی، انہیں کسی بھی شکایت کا کوئی موقع
نہیں ملے۔'' رخشندہ بڑی آہستگی سے بولی۔

میں نے ایک بات محسوس کی کہ جب اُس نے یہاں میرے رہنے کے بارے میں
تو اُس کا حسین چہرہ ایک پل کے لئے دمک اُٹھا تھا اور اُس کی بڑی بڑی آنکھوں میں ایک
چمک سی ہوئی، ایک کوندا سا لپکا تھا۔ لیکن اگلے لمحے اُس کا چہرہ سپاٹ اور ہر قسم کے جذبات
سے عاری ہو گیا تھا۔ اُس کی حسین آنکھوں کی روشنی بجھ سی گئی تھی۔

''اب آپ اسے اپنا ہی گھر سمجھیں۔'' یگانہ کہنے لگا۔ ''آپ کو جس چیز کی بھی ضرورت
ہو بلا تکلف کہہ دیں۔ جو کھانے کو دل کرے وہ رخشندہ سے کہہ دیں۔ میرا خیال ہے
میرے کپڑے بھی آپ کو آ جائیں گے کیونکہ قد اور جسامت ہم دونوں کی ایک ہی ہے
آپ بغیر کسی جھجک کے انہیں پہن سکتے ہیں۔ کپڑے گھر پر دُھلتے ہیں۔ رخشندہ استری
کر دیا کرے گی۔''

پھر اُس نے توقف کر کے رخشندہ سے کہا۔ ''جانی! بات یہ ہے کہ مسٹر سالار
کپڑے بلکہ ان کا سوٹ کیس چوری ہو گیا۔ ریل گاڑی میں کسی نے چرا لیا۔ اب ان
پاس تن کے جوڑے کے علاوہ کوئی جوڑا نہیں ہے۔ یہ کپڑے خریدنا چاہ رہے تھے لیکن میں
نے منع کر دیا کیونکہ میرے پاس بالکل نئے کچھ جوڑے رکھے ہوئے ہیں۔''

''آپ بہت زیادہ تکلف سے کام لے رہے ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''پلیز مجھے شرمندہ
نہ کریں۔ میرے لئے یہی کافی ہے بلکہ آپ کا مجھ پر احسان ہے کہ آپ نے میری رہائش
اور طعام کا بندوبست کر دیا۔ مجھے یہ سب کچھ کسی خواب کی طرح لگ رہا ہے۔''

''اب آپ کے اور ہمارے درمیان تکلف کی کوئی دیوار نہیں رہی۔ اب مجھے تھوڑی دیر
کے لئے اجازت دیں میں کپڑے بدل آؤں۔ اتنی دیر میں آپ بھی نہا کر کپڑے بدل کر
تازہ دم ہو لیں..... رخشندہ! انہیں ایک جوڑا لا دو اور واش رُوم میں لے جاؤ۔''

پھر وہ اپنے شوہر کے ساتھ بیڈ رُوم میں چلی گئی۔ کچھ دیر کے بعد ایک سفید نیا جوڑا لا
ایک سلیپنگ سوٹ لے کر آئی، پھر مجھ سے بولی۔ ''آپ میرے ساتھ آئیں..... میں آپ
کو آپ کا کمرہ دکھا دوں۔''

اُس نشست گاہ کے ایک کونے میں اُوپر جانے کے لئے زینہ بنا ہوا تھا۔ میں نے کبھی
کسی فلیٹ میں ایسا زینہ اور اُوپر کمرے بنے ہوئے نہیں دیکھے تھے۔ وہ مجھے لے کر اُوپر
پہنچی۔ زینے کے سامنے ہی ایک کمرہ تھا۔ یہ شاید مہمانوں کے لئے تھا۔ نہایت آراستہ و
پیراستہ تھا، بہت ہی شاندار قسم کا تھا۔ ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ اُس نے کپڑے بستر پر
رکھ دیے، پھر وہ دروازہ بھیڑ کر نکل گئی۔

میں نیا جوڑا لے کر غسل خانے میں چلا گیا جو خاصا کشادہ اور اُس فلیٹ کے شایانِ
شان لگا۔ کسی بھی فائیو سٹار ہوٹل کے واش رُوم سے کہیں شاندار..... اس میں باتھ ٹب تھا۔
دیوار میں ایک بہت بڑا آئینہ نصب تھا اور اُس کے نیچے واش بیسن..... ایک ٹرکش تولیہ،
اس کے علاوہ شیونگ کٹ، ہر قسم کے لوشن اور مختلف شیمپو اور صابن بھی تھے۔

میں نے شیو کیا، خوب اچھی طرح سے نہایا۔ جب میں کمرے میں آ کر سنگھار میز کے
سامنے کھڑا بالوں میں کنگھی کر رہا تھا، تب رخشندہ نے آ کر کہا کہ کھانے کے لئے آ
جاؤں۔ جب میں نیچے آیا تو یگانہ کھانے کی میز پر میرا منتظر تھا۔ میز پر کھانا چنا ہوا تھا۔

یگانہ میرے دائیں ہاتھ پر اور رخشندہ میرے سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔ اُس پر ایک
چالیس برس کی عمر کی عورت کی سی سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔ اُس پر ایک استانی کا سا دھوکا ہو
رہا تھا۔ اُس نے خاموشی سے کھانا کھایا لیکن اس دوران نظروں کا تصادم ہوتا رہا۔ میں
اسے بڑی معیوب سی بات سمجھ رہا تھا کیونکہ وہ کسی کی بیوی تھی اور پھر اُس سے شناسائی کو
صرف بیس پچیس منٹ ہوئے تھے۔ گو کہ یگانہ کھانے میں مصروف تھا لیکن کسی بھی لمحے
میری نظروں کی چوری پکڑی جا سکتی تھی۔ شوہر کی موجودگی کے باوجود وہ سالن، روٹی اور
مرغی کی ڈش میری طرف بڑھا دیتی۔ یگانہ بھی اصرار کر کے کھلاتا رہا جیسے میں اُس کا کوئی
دیرینہ دوست یا رشتہ دار ہوں۔

رخشندہ نے کھانا بہت اچھا پکایا تھا۔ بہت مزیدار تھا۔ اُس کے ہاتھ میں ذائقہ تھا۔ وہ
بڑی سگھڑ، سلیقہ مند اور روایتی قسم کی عورت لگ رہی تھی۔ میں نے ایک لمحے کے لئے سوچا
کہیں ایسا تو نہیں کہ اس کی عمر تیس بتیس برس کی ہو اور اپنے متناسب اور چھریرے بدن کی

وجہ سے بیس برس کی دکھائی دے رہی ہو؟ کچھ عورتیں چور عمر کی ہوتی ہیں، اپنی عمر۔
برس چھوٹی لگتی ہیں۔ کھانے سے فراغت پانے کے بعد وہ برتن اُٹھا کر باورچی خا۔
چلی گئی۔ یگانہ نے ٹی وی آن کر دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ قہوہ بنا کر لے آئی۔
ساتھ بیٹھ کر ٹی وی دیکھنے اور قہوہ پینے لگی۔ میں مختلف حیلے بہانے سے اُس کی طرف
پر مجبور تھا۔ اُس میں اس قدر کشش اور جاذبیت تھی کہ میری نظروں کو قرار نہیں آرہا
بیٹھی بھی ایسی جگہ تھی کہ اُس کی صورت اور سراپا میری نظروں میں جذب ہو رہا
میری نگاہوں کی زد میں تھی۔ میں نے سوچا کہ اب مجھے چل کر سو جانا چاہئے۔

میں یگانہ سے اجازت لے کر اپنے کمرے میں سونے کے لئے آ گیا۔ کپڑے
بستر پر دراز ہو گیا۔ نیند میری آنکھوں سے کوسوں دُور تھی۔ میں خود بھی سونا نہیں چاہ
سوچنا چاہتا تھا کہ یہ میری یادداشت کو کیا ہو گیا؟ میں اسے کیسے اور کیونکر کھو چکا ہوں
مجھے دوسروں کے ذہن اور اُن کی یادداشت کے بارے میں کیسے معلوم ہو جاتا ہے
قدر عجیب وغریب اور حیرت انگیز بات ہے۔ وہ اس وقت کیا سوچ رہا ہے، میرے
کے چاہنے پر علم میں آ جاتا ہے۔ میں اس علم کا مالک کیسے اور کیونکر بن گیا؟ میں نے
یگانہ اور رخشندہ کے ذہن کو پڑھنے کی کوشش نہیں کی اور نہ مجھے اس کی کوئی ایسی ضر
آن پڑی تھی اور نہ میں یہ چاہتا تھا۔

مقتولہ کے بارے میں مجھے کوئی علم نہیں تھا کہ وہ کون تھی......؟ وہ کون بدمعاش
اُسے میرے کمپارٹمنٹ میں لے آئے، مجھے بے ہوش کر دیا، پھر اُس لڑکی کی بے ح
کے اُس کا گلا گھونٹ کر اُسے ہلاک کر دیا۔ پولیس نے مجھے اُس کے قتل کے الزام م
لیا۔ پولیس نے مجھ پر بھونڈا، بے سروپا اور مضحکہ خیز الزام لگایا۔ گرفتار کر کے تھانے لے
حالات نے ساتھ نہ دیا ہوتا تو پھر پولیس مجھے قتل کا ملزم ثابت کر کے پھانسی پر لٹکا دیتی)

ایک اور دوسرا عجیب اتفاق یہ پیش آیا کہ یگانہ سے میری حادثاتی ملاقات ہو گئی۔ وہ
مدد کے جذبے سے اس قدر متاثر ہوا کہ مجھے اپنے گھر لے آیا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ
ایک اجنبی ہوں، ایک خوبصورت جوان اور وجیہہ مرد ہوں۔ اُس کی بیس برس کی بہت
حسین بیوی گھر پر موجود ہے۔ اُسے شاید اپنی بیوی پر اعتماد تھا۔ وہ مجھ پر اس قدر مہربان
گیا کہ اس نے مجھے اپنے ہاں اس وقت تک قیام کرنے کی اجازت دے دی کہ

تک مجھے اپنا بھائی نہیں مل جاتا۔ مجھے بھائی کو کیا، اپنے آپ کو تلاش کرنا تھا۔ اگر میں یگانہ
کو سچ سچ بتا دیتا تو شاید وہ میری اس کہانی کا یقین نہیں کرتا۔ تاہم مجھے اُمید تھی کہ میں جلد
از جلد اپنے آپ کو تلاش کر لوں گا۔''

میں سوچتے سوچتے گہری نیند سو گیا۔ میری آنکھ کب لگی مجھے خبر نہیں ہو سکی۔ میں نے
نیند کی حالت میں محسوس کیا کہ ایک نرم و نازک ہاتھ جس میں گداز اور ایک لطیف سی تپش
ہے وہ میرا شانہ پکڑ کر آہستہ آہستہ ہلا رہا ہے۔ پھر میں نے اپنی نتھنوں میں ایک مست کر
دینے والی سی خوشبو محسوس کی۔ چند ثانیوں کے بعد میں نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔

میں نے جو کچھ دیکھا وہ ناقابل یقین تھا..... چند ثانیوں تک میں خواب کی سی حالت
میں دیکھتا رہا۔ رخشندہ مجھ پر جھکی ہوئی تھی۔ اُس کے چہرے پر ایک عجیب سا نکھار تھا جس
نے اُسے اور حسین بنا دیا تھا۔ اُس کے بھرے بھرے سرخ گداز ہونٹوں پر ایک دلآویز
مسکراہٹ تھی۔ اُس کی آنکھوں میں اُفق تک اُفق ایک اُجالا سا پھیلا ہوا تھا۔ اُن کے بدن
سے پھوٹتی ہوئی سوندھی سوندھی خوشبو کی مہک میرے دل و دماغ پر چھائی ہوئی تھی۔ وہ
میری آنکھوں میں جھانکنے لگی، پھر سیدھی ہو کر کھڑی ہو گئی۔

میں ایک دم سے ہڑبڑا کے اُٹھ بیٹھا۔ اس وقت صبح ہو چکی تھی۔ میری نگاہ دیوار گیر
گھڑی پر پڑی۔ صبح کے دس بج رہے تھے۔ پھر میں نے اُس کی طرف دیکھا، وہ یکسر بدلی
ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ رات میں نے اُس کے چہرے پر جو سنجیدگی دیکھی تھی اُس کا
دُور دُور تک کوئی نام و نشان نہ تھا۔ اُس کے چہرے پر کنول کھل رہے تھے۔

''سالار صاحب!'' وہ کھنک گئی۔ اُس کی آواز کا زیر و بم فضا میں لہرایا۔ ''آپ تیار ہو
کر ناشتے کی میز پر آ جائیں۔ میں نے بھی ناشتہ نہیں کیا ہے..... میں نے آپ کو گہری نیند
سے جگا دیا، آپ نے برا تو نہیں منایا؟''

''آپ کا بہت بہت شکریہ! جو آپ نے جگا دیا۔'' میں نے کہا۔ ''دراصل رات مجھے
بہت دیر تک نیند نہیں آئی تھی اس لئے میں جلد بیدار نہ ہو سکا۔ آپ مجھے نہ جگاتیں تو شاید
میں سہ پہر تک سویا رہتا۔ میں ابھی حاضر ہوتا ہوں۔''

میں کچھ دیر کے بعد زینے کی طرف بڑھا تو مجھے خیال آیا کہ اُس نے کہا تھا کہ
میں نے بھی ناشتہ نہیں کیا۔ کیا مطلب؟ کیا یگانہ گھر پر موجود نہیں ہے یا اُس نے ناشتہ کر لیا

ہے؟ جب میں نیچے آیا تو وہ ناشتے کی میز پر اکیلی بیٹھی ہوئی تھی۔ یگانہ موجود نہیں تھا۔ میں نے اُس کے سامنے کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ ''یگانہ صاحب کہاں ہیں؟ وہ دکھائی نہیں دے رہے۔''

''وہ صبح آٹھ بجے گھر سے نکل جاتے ہیں۔'' اُس نے جواب دیا۔ ''اس لئے کہ آج کل کام بہت ہے۔ باہر کے آرڈر بھی ملے ہوئے ہیں۔''

''آپ نے مجھے آٹھ بجے سے پہلے ہی جگا دیا ہوتا......'' میں نے کہا۔ ''میں کل سے صبح سات بجے بیدار ہو جاؤں گا۔''

''آپ اتنی جلدی بیدار ہو کر کیا کریں گے؟'' رخشندہ بولی۔ ''آپ آرام سے سو کر اُٹھیں۔ میں دس بجے آ کر جگا دیا کروں گی۔''

''میں یگانہ صاحب کے ساتھ ہی نکل جایا کروں گا۔'' میں نے کہا۔ ''مجھے اپنے بھائی کو جلد سے جلد تلاش کرنا ہے۔ کیونکہ میری امی نے اُس کے فراق میں رو رو کر اپنا حال برا کر لیا ہے۔ اُن کے لئے ایک ایک دن صدی کے برابر ہے۔''

''شروع کیجئے...... ناشتہ ٹھنڈا ہو رہا ہے۔'' وہ بولی۔ ''آپ پریشان نہ ہوں۔ آپ کو آپ کا بھائی جلد مل جائے گا۔''

میں نے میز پر نظر ڈالی۔ مکھن، ملائی، ہاف فرائی انڈے، قیمہ پراٹھے اور انڈوں کا آملیٹ بھی تھا۔ اُس نے پراٹھے بہت اچھے بنائے تھے۔ اُس نے تین پراٹھے بنائے تھے، وہ بہت موٹے اور بڑے بڑے تھے، گرم گرم تھے۔ میرے لئے ایک ہی پراٹھا کافی تھا لیکن اُس نے اصرار کر کے دو پراٹھے میری پلیٹ میں رکھ دیئے۔

''یہ بہت مرغن اور بہت بڑے پراٹھے ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''انہیں کھاتے ہی نیند آ جائے گی۔ میرے لئے ایک ہی پراٹھا کافی ہے۔''

''آپ جب بھائی کی تلاش میں سڑکوں کی خاک چھانیں گے تب ایک کیا تین پراٹھے بھی ہضم ہو جائیں گے۔ وہ ہنس پڑی تو اُس کے موتیوں جیسے دانت چمک اُٹھے۔ ''یگانہ دو پراٹھے کھا جاتے ہیں۔ جبکہ اُنہیں اس عمر میں ایک پراٹھا بھی نہیں کھانا چاہئے۔''

میں نے اُس کی بات کا جواب نہیں دیا۔ ناشتہ شروع کر دیا۔ اُس نے چار انڈوں کا ہاف فرائی کیا ہوا تھا۔ آملیٹ بھی چار انڈوں کا ہی بنا ہوا تھا۔ اُس نے دو انڈے، آدھا آملیٹ اور قیمہ کھلا کر ہی دم لیا، خود بھی خوش خوراک تھی۔

''میں ناشتہ بہت ہی زوردار اور پُرتکلف کرتی ہوں۔ کیونکہ اس فلیٹ میں کوئی ماسی کام کرنے نہیں آتی ہے۔ میں ہی جھاڑ پونچھ کرتی ہوں۔ کپڑے ہاتھوں سے دھو کر استری کرتی ہوں۔ اس طرح چاق و چوبند اور صحت مند رہتی ہوں۔ وقت بھی گزر جاتا ہے۔''

''میں آپ سے بہت معذرت خواہ ہوں کہ میری وجہ سے آپ کو ناشتہ دس بجے کرنا پڑ رہا ہے۔'' میں نے خجل ہو کر کہا۔

''میں صبح دس بجے ہی ناشتہ کرتی ہوں۔ کیونکہ مجھ سے اتنی جلدی ناشتہ نہیں ہوتا ہے۔'' اُس نے کہا۔

ناشتے سے فراغت پانے کے بعد وہ گرم گرم چائے بنا کر لانے کے لئے باورچی خانے میں چلی گئی۔ میری نگاہ کارنس پر رکھی ہوئی تصویر پر پڑی۔ یہ تصویر یگانہ اور رخشندہ کی شادی کی تھی۔ میں قریب جا کر تصویر دیکھنے لگا۔ یہ تصویر تین سال پرانی تھی۔ وہ سترہ برس کی عمر میں ہی بڑی بھرپور اور جوان عورت کی طرح لگ رہی تھی۔ بھرا بھرا جسم، بیضوی چہرہ......اور پیاسی آنکھیں دیکھنے والوں کو جیسے پہلی ہی نظر میں کھینچ لیتی تھیں۔ بوڑھے شوہر کے سامنے اُس کی عمر آپ ہی آپ کم ہو گئی تھی۔ وہ نوخیز عمر کی ایسی لڑکی نظر آ رہی تھی جس میں کچے پھل کی سی ترشی ہوتی ہے۔ وہ اپنی نوجوان بیوی کے پہلو میں کھڑا اپنی عمر سے زیادہ بوڑھا لگ رہا تھا۔ کھلی ہوئی کلی کے پہلو میں مرجھائے ہوئے کانٹے کی طرح کھٹک رہا تھا۔

یگانہ گو بظاہر خود نوجوان لڑکوں کی طرح مضبوط اور قد آور نظر آ رہا تھا۔ ساٹھ برس کی عمر میں اکثر لوگ اپنی عمر سے دس برس بڑے دکھائی دیتے ہیں اور ان کی کمر کمان ہو جاتی ہے۔ مگر ابھی وہ صرف شانوں کی طرف قدرے جھکا تھا۔ شاید اندر سے کمزور ہو، مگر اُوپر سے ایک تناور درخت کی طرح مضبوطی سے کھڑا ہوا لگتا تھا۔ اُس کے چہرے پر عمر کی چھاپ اور بڑھاپے کے نقوش بہت مدھم تھے۔

''آپ کیا دیکھ رہے ہیں......؟'' رخشندہ میری پشت پر کھڑی ہو کر بولی۔ ''ہماری شادی کی تصویر......!''

میں اُس کی طرف تیزی سے گھوما۔ وہ ٹرے میں چائے کے کپ لئے کھڑی تھی۔ میں اپنا کپ لے کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ وہ بھی میرے مقابل بیٹھ گئی۔ میں نے نہ چاہتے ہوئے

بھی اُس سے پوچھ ہی لیا۔ ''آپ کی شادی کو کتنا عرصہ ہوگیا ہے؟''

''تین برس......'' اُس نے جواب دیا۔ اُس کے چہرے پر ایک کرب سا چھا گیا۔

''اُس وقت میری عمر سترہ برس تھی۔''

''آپ کی شادی کیا بہت جلدی نہیں ہوگئی؟'' یہ بات میری زبان سے بلا ارادہ نکل گئی۔

''شادی جلدی نہیں ہوئی...... ہمارے ملک اور معاشرے میں چودہ چودہ برس کی عمر میں شادی ہو جاتی ہے۔ سولہ سترہ برس کی عمر میں ایک لڑکی کی شادی عام سی بات ہے۔ ایک طرح سے یہ عمر صحیح بھی ہوتی ہے۔ میرے خیال میں آپ شاید یہ کہنا چاہتے ہیں کہ میری شادی اس عمر میں ایک بوڑھے شخص سے کیوں ہوگئی......؟ یہ شخص جو میرے دادا کی عمر کا ہے۔'' اُس کے لہجے میں تلخی تھی۔

وہ میری بات کی تہ میں پہنچ گئی تھی۔ اس لئے میں نے سر ہلایا۔ ''جی ہاں...... میں یہی بات کہنا چاہتا تھا۔''

''چونکہ میں یہاں سونے کے پنجرے میں رہتی ہوں۔ میری کوئی سہیلی نہیں ہے، نہ دوست ہے۔ اس لئے آپ کو سچ سچ بتا دینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ کیونکہ آپ اجنبی ہیں، پردیسی ہیں۔ کچھ دنوں کے بعد چلے جائیں گے۔ آپ کو میں اور میری کہانی یاد رہے گی۔ شاید میری یاد بھی دلاتی رہے۔ میں نے اپنی زندگی میں بہت دُکھ اُٹھائے ہیں۔ مصیبتوں کا ایک سمندر پار کیا ہے۔ میں ایک تنہا یتیم لڑکی تھی۔ جس میں سات برس کی تھی، میری ماں مرگئی۔ پھر میرے باپ نے دوسری شادی کر لی۔ میری سوتیلی ماں بہت حسین اور کم عمر تھی۔ اُس نے میرے باپ کو اپنے حسن و شباب کے طلسم سے اپنا غلام بنا لیا۔ میرے باپ نے مجھ پر ایک احسان کیا کہ مجھے انٹر تک تعلیم دلا دی۔ جب میں سولہ برس کی ہوئی تب میرے باپ کو میری سوتیلی ماں کے آشنا نے قتل کر دیا۔ چونکہ یہ قتل میری سوتیلی ماں اور اُس کے آشنا نے مل کر کیا تھا اس لئے دونوں کو جیل ہوگئی۔ میری ماں کو بیس برس کی سزا ہوئی اور آشنا کو پھانسی دے دی گئی۔

میری دُور کی ایک رشتہ دار خالہ تھی۔ وہ غریب عورت تھی۔ اُس کا شوہر ڈرائیور تھا۔ اُس کے پانچ بچے تھے۔ پانچوں لڑکیاں تھیں۔ گزارہ مشکل سے ہوتا تھا اس لئے وہ اور اُس کی تین لڑکیاں دوسروں کے گھروں میں کام کر کے گھر چلاتی تھیں۔ مجھے بھی میری نالہ نے اسی کام پر لگا دیا۔ پھر مجھے یہ کام چھوڑنا پڑا۔ کیونکہ میں جس گھر میں کام کرتی تھی، س کی مالکن کا بیٹا شرابی تھا۔ دن رات نشے میں ڈوبا رہتا تھا۔ مجھے اس لئے گالیاں دیتا ور مارتا تھا کہ میں اُس کی بات نہیں مانتی ہوں۔ میں مجبوری میں کام کر رہی تھی۔ ایک روز س نے میری عزت لوٹنے کی کوشش کی تو میں نے اُسے رُوئی کی طرح دھنک دیا۔ اُس کا نہ نوچ لیا۔ اُس روز اتفاق سے یگانہ اس کوٹھی میں مالکن کے شوہر سے ملنے آئے ہوئے تھے۔ اُس وقت مالکن اور اُس کا شوہر گھر پر نہیں تھا۔ اُن دونوں کی غیر موجودگی میں ان کا بیٹا دست درازی اور من مانی کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ اُس کی بہنوں نے مجھے ہمیشہ اُس کے ہاتھوں سے بچایا تھا۔ یگانہ نے میری خالہ کے ہاں آ کر مجھ سے کہا کہ...... تم مجھ سے شادی کر لو۔ میں تمہیں ایک شہزادی کی طرح رکھوں گا۔ میں نے اُس کی بات مان لی۔

ہر عورت کے دل میں بڑے ارمان ہوتے ہیں، بڑی انجانی خواہشیں ہوتی ہیں۔ بہت سارے سہانے خواب ہوتے ہیں۔ ہر وہ عورت جس کا گھر نہیں ہوتا وہ دوسری عورتوں کی طرح سوچتی ہے۔ میں بھی دوسری عورتوں کی طرح سوچتی تھی کہ میرا بھی ایک گھر ہو اور میں اس گھر کو جنت کا نمونہ بنا کر رکھوں۔ زندگی کی کتنی ہی سردیاں اور گرمیاں جھیل کر مجھے یہ گھر نصیب ہوا ہے۔ اس خواب کو پورا کرنے کے لئے میں نے حساب نہیں کیا اور ایک بوڑھے کا ہاتھ تھام لیا۔ شادی کے بعد پتہ چلا کہ جس پیار کی تلاش میں عورت بھٹکتی ہے وہ پیار مجھے نہ ملا تو میں اپنے گھر کو جنت کا نمونہ نہیں بنا سکوں گی۔'' اُس کا لہجہ دل گرفتہ سا ہو گیا۔

وہ ایک خوبصورت گھر کے لئے اپنی دیرینہ خواہش کا اظہار کر رہی تھی۔ یہ اُس کے جذبات و احساسات تھے۔ اُس نے مجھے اپنی داستانِ غم کچھ ایسے درد بھرے انداز سے سنائی تھی کہ میں متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔ اُس کی حسین آنکھوں سے جو صاف و شفاف موتی نکل کر اُس کے رخساروں پر ڈھلکے تھے اس سے میرے دل کو ایک عجیب سے صدمے کا احساس ہوا تھا۔

''آپ کی داستان بڑی دردناک ہے۔ آپ کو غربت و افلاس اور تنگ دستی اور طوفانوں سے نجات مل گئی۔ آپ کے شوہر نے آپ کو ایک محل نما گھر میں شہزادی کی طرح رکھا ہوا ہے۔ آپ کا گھر بس گیا۔ آپ کی دیرینہ خواہش پوری ہوگئی۔''

رخشندہ نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے افسردگی سے کہا۔ ''میری خواہش ایک انمول اور انہونی خواہش نہیں ہے جو میرے دل میں ہے۔ ہر عورت اپنا گھر بسانے کے خواب دیکھتی ہے۔ مجھے یہ گھر مل گیا ہے لیکن میرے اندر ایک خلا ہے، ایک چیز کی کمی ہے جس سے میرے وجود میں ادھورا پن ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ ماں بن جاؤں...... میں ماں بن گئی تو میری تکمیل ہو جائے گی۔ میرے اندر کا خلا بھر جائے گا، ادھورا پن دُور ہو جائے گا۔ میں ایک عظیم عورت بن جاؤں گی۔''

''اولاد دینا یا نہ دینا اُس کا کام ہے...... آپ خدا کی ذات سے مایوس نہ ہوں۔'' میں نے اُسے دلاسہ دیا۔

''یگانہ نے مجھے کیا کچھ نہیں دیا......؟ اُس نے مجھے رانی بنا کر رکھ دیا۔ لیکن اُس نے مجھے محبت نہیں دی۔'' وہ سرگوشی میں بولی۔

یکلخت مجھے احساس ہوا کہ رخشندہ مجھ سے تھوڑی ہی دیر میں ایک دوست کی طرح پیش آنے لگی ہے۔ اُس نے اپنے ماضی کے بارے میں بتا دیا ہے۔ وہ میری ہمدردی حاصل کرنا چاہتی ہے۔ کیوں اور کس لئے...... جبکہ وہ جانتی ہے کہ میں ایک مسافر ہوں اور پھر ہم دونوں اکیلے ہیں۔ وہ بھی جوان ہے اور میں بھی ایک جوان مرد ہوں۔ تنہائی میں جب مرد اور عورت یکجا ہوتے ہیں تو پھر درمیان میں شیطان آ جاتا ہے۔ اُس نے مجھے ناشتے کی میز پر بتایا تھا کہ یگانہ شام کے وقت گھر لوٹتا ہے۔ کسی کسی دن اُسے بہت دیر بھی ہو جاتی ہے۔ وہ گھر کے کام کاج میں مصروف رہتی ہے۔ جب وقت ملتا ہے تو پھر ٹی وی دیکھتی ہے، اخبار پڑھتی ہے، رسالے اور ناولوں کا مطالعہ کرتی ہے، سودا سلف لانے بھی نکل جاتی ہے۔ اُس کے ذاتی استعمال کے لئے گاڑی بھی ہے۔

تھوڑی دیر کے بعد میں اُس سے اجازت لے کر نکل گیا۔ اُس نے مجھ سے کہا کہ میں دوپہر کا کھانا گھر آ کر کھاؤں۔ لیکن میں نے کہہ دیا کہ باہر کھاؤں گا۔ پھر میں دن ڈوبے تک آوارہ گردی کرتا رہا۔ بسوں میں سفر کیا، بازاروں میں گھوما، اپنے آپ کو تلاش کرتا رہا۔ جب میں اپنے آپ کو پانے میں ناکام ہو گیا تو پھر میں یگانہ کے پاس پہنچ گیا۔ وہ گھر لوٹ آیا تھا۔ میاں بیوی میرا انتظار کر رہے تھے۔

میں نے محسوس کیا کہ رخشندہ کل کے مقابلے میں آج کچھ بنی سنوری ہے۔ اُس نے بھڑکیلا لباس پہن رکھا ہے اور پھر اُس پر گہری سنجیدگی طاری ہے جو کل میں نے دیکھی ہے۔ وہ میری طرف دیکھنے اور بات کرنے سے اجتناب کر رہی تھی۔ میں نے اپنی نظروں پر پوری طرح قابو رکھا تھا۔ لیکن میرے لئے یہ سب کچھ بہت دُشوار اور ناممکن سا لگ رہا تھا۔ میں کھانے کے بعد تھکن کا بہانہ کر کے سونے کے لئے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ وہ دونوں ٹی وی کے سامنے بیٹھ گئے تھے۔

میں نے کمرے میں آ کر زیرو واٹ کا بلب جلا لیا۔ لیکن اُس کی روشنی بھی خاصی تیز تھی۔ کمرے کی ہر چیز صاف اور واضح دکھائی دے رہی تھی۔ اس وقت مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ میں آرام دہ کرسی پر بیٹھ کر سوچنے لگا کہ آج میں ناکام اور نامراد رہا۔ پھر میرے دل نے کہا کہ مجھے ہمت ہارنے اور مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے...... کراچی بہت بڑا اور چاروں طرف پھیلا ہوا شہر ہے۔ ابھی تو میں نے اس کا ایک حصہ بھی پورا نہیں دیکھا ہے۔ اب مجھے ایک نئے عزم و حوصلے کے ساتھ اپنی تلاش جاری رکھنی چاہئے۔

پھر میرے تصور میں رخشندہ کا سراپا اور چہرہ لہرانے لگا۔ میں نے بہت کوشش کی کہ اُس کے بارے میں نہ سوچوں، اُس کا تصور نہ کروں کیونکہ وہ ایک شادی شدہ عورت ہے۔ کیا ہوا وہ جوان اور حسین ہے؟ میرے محسن کی بیوی ہے۔ ایک پاک باز اور پاک دامن عورت ہے۔ اگر وہ دن میں اپنے شوہر کی غیر موجودگی میں ایک دوست کی طرح پیش آئی، مجھ سے قدرے بے تکلف ہوگئی، میری طرف کن اکھیوں سے شوہر کی موجودگی میں بھی دیکھتی ہے، اس کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ وہ مجھے پسند کرنے لگی ہے۔ مجھے اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتی ہے۔ آج شام جو اُس نے قمیض پہنی ہوئی تھی اُس کا گلا نامناسب حد تک کھلا ہوا تھا۔ میری نگاہیں بار بار نظارے کے لئے اُٹھ جاتی تھیں۔ اُس نے اُس وقت جب یگانہ ٹیلی فون کی گھنٹی کی آواز سن کر ٹیلی فون کی طرف بڑھا اور جتنی دیر وہ ٹیلی فون پر بات کرتا رہا، اُس کا دوپٹہ گلے سے ہٹ کر گردن میں سمٹ گیا تھا۔ اُس نے غیر محسوس انداز سے وہ دوپٹہ ہٹا لیا تھا۔ یہ نظارہ بڑا توبہ شکن تھا۔ میں کوئی برف کا تودہ نہیں تھا جو آنکھیں چرا لیتا۔ میری رگوں میں خون کی گردش تیز ہوگئی تھی۔ تاہم میں اخبار دیکھتا رہا، اُس خبر کو تلاش کرتا رہا جو گاڑی میں قتل کی واردات کی تھی۔ آخر وہ خبر نظر آ گئی۔ اُس خبر میں لکھا تھا کہ...... کالج کا ایک طالب علم اپنے تین بدمعاش دوستوں کی مدد سے اپنی ایک

ہم جماعت لڑکی کو اُس وقت بہلا پھسلا کر فرسٹ کلاس ایئر کنڈیشنڈ ڈبے میں لے گیا جب
وہ کراچی ٹی وی اسٹیشن انٹرویو دینے جا رہی تھی۔ اُس ڈبے میں ایک مسافر سو رہا تھا۔ اُ
بے ہوشی کی دوا سونگھا دی، پھر اُن چاروں نے لڑکی کی اجتماعی بے حرمتی کی اور پھر اُس
گلا گھونٹ کر ہلاک کر دیا، پھر اُس مسافر کا سامان بھی چوری کر لیا۔ جس لڑکے نے اُ
ہلاک کیا، اُسے گرفتار کر لیا گیا بلکہ اُس نے تھانے میں آ کر خود کو پولیس کے حوالے کر
کیونکہ اُس کے ضمیر نے ملامت کی تھی۔ لیکن اُس کے ساتھی مفرور ہیں۔ پولیس اُنہیں
سرگرمی سے تلاش کر رہی ہے۔ اس خبر کو پڑھ کر مجھے بڑا سکون ملا اور میرے اعصاب
پھول کی طرح ہلکے ہو گئے تھے۔ اگر میرا سامان پولیس کی تحویل میں ہوتا تو میں پولیس
اسٹیشن چلا جاتا۔ سامان تو یہ بدمعاش لے گئے تھے میں اس لئے تھکن کا بہانہ کر کے اپنے
کمرے میں چلا آیا تھا۔

نائٹ بلب کی دودھیا روشنی چاندنی کی طرح لگ رہی تھی۔ میں نے اس لمحے ایک
محسوس کیا کہ رخشندہ بستر پر نیم دراز ہے۔ وہ میری سوچتی ہوئی آنکھوں کے سامنے بار بار
انگڑائی لے رہی تھی۔ کلی کی طرح چٹک رہی تھی، پھول کی طرح کھل کر مسکرا رہی تھی۔ دل
کی دھڑکنوں میں دھماکے کی طرح بج رہی تھی۔ اُس کے چہرے پر ایک دل آویز نکھار تھا
جو میری آنکھوں میں جذب ہو رہا تھا۔

جب سے میں یہاں آیا تھا، اُسے دیکھ کر میرے دل و دماغ پر ایک فسوں سا چھا گیا تھا۔
تب سے میں اُس کے حسن اور اُبلتے شباب کے طلسم سے نکلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے
اُس سے نفرت کی، اُسے دشمن کی نظروں سے دیکھا تھا۔ میں نے اس حقیقت کو جھٹلانے کی
کوشش کی تھی کہ وہ حسین نہیں ہے، جوان نہیں ہے۔ میں نے اس سے بچاؤ کی کتنی ہی نفرت
انگیز تدبیریں سوچیں لیکن وہ ایک ناگن کی طرح میری سوچ میں آ کر مجھے ڈس رہی تھی اور
زہر کی طرح دماغ کی رگ رگ میں پھیلتی جا رہی تھی۔ آج اُس نے ایسا لباس کیوں پہنا؟
کیا مجھے ورغلانے کے لئے......؟ جانے کیوں میرا دل نہیں کیا کہ اُس کا ذہن پڑھوں۔

پھر میں اُٹھ کر بڑے اضطراب سے ٹہلنے لگا۔ ٹہلنے کے دوران میرے قدم فرش پر
دھماکے سے پڑ رہے تھے۔ یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے میں اپنے اندر کے منہ زور جذبوں کو
قدم قدم پر بے رحمی اور شقاوت سے کچل رہا ہوں۔

پھر میں ذرا دیر کے لئے رُک گیا۔ اس وقت مجھے شدت کی پیاس محسوس ہو رہی تھی۔
کل رخشندہ ایک جگ میں ٹھنڈا پانی اور گلاس رکھ گئی تھی۔ باورچی خانے میں فریج رکھا ہوا
تھا۔ میں باہر آیا۔ زینے پر اندھیرا تھا۔ نیچے والے زینے، نشست گاہ اور ٹی وی لاؤنج میں
بھی تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ اُن کی خواب گاہ کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اُس میں روشنی ہو رہی
تھی۔ وہ دونوں پلنگ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ مجھے دیکھ نہیں سکتے تھے کیونکہ میں گھپ
اندھیرے کی آغوش میں تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ یگانہ کی آنکھوں میں باپ بننے کی تمنا
جاگ رہی ہے۔ رخشندہ اس طرف دیکھ رہی تھی جدھر میرا کمرہ تھا۔ وہ اس طرح سے دیکھ
رہی تھی جیسے آر پار اُسے نظر آ رہا ہو۔

یگانہ نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر بڑی حسرت سے کہا۔ ''میری دولت، جائیداد اور
خاندان کو بڑھانے کے لئے ایک بیٹے کی ضرورت ہے۔''

''میرے ہونے والے بیٹے کو صرف تمہاری ہی نہیں، بلکہ اُس کو تمہاری وراثت کی بھی
ضرورت ہے۔'' رخشندہ بولی۔

''مرد ایک کسان ہے...... عورت ایک زمین ہے اور اولاد ایک میٹھی فصل ہے۔
ہمارے ہاں بیٹا ضرور ہو گا۔ یگانہ نے پُر اعتماد لہجے میں کہا۔ اُسے جیسے دلاسا دیا۔ ''تم
مایوس اور نا اُمید کیوں ہوتی ہو؟''

''نہیں...... میں نا اُمید نہیں ہوں۔ مجھے اندھیرے میں اُمید کی شعاع دکھائی دے
رہی ہے۔ میں ماں ضرور بنوں گی۔'' رخشندہ نے کہا۔

''اولاد کی خواہش صرف مرد ہی کو نہیں، عورت کو بھی ہوتی ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ
اولاد کے لئے مرد زیادہ سنجیدہ اور خواہش مند ہوتا ہے۔ کیونکہ اُسے وارث اور نسل
بڑھانے کی تمنا کچھ زیادہ ہی ہوتی ہے۔'' یگانہ نے کہا۔

''نہیں...... ایسا نہ کہو!'' رخشندہ تڑپ کر جذباتی لہجے میں کہنے لگی۔ ''اولاد کی سب
سے بڑی آرزو عورت کو ہوتی ہے۔ اس لئے کہ اُس کے اندر مامتا ہوتی ہے، جو مردوں میں
نہیں ہوتی ہے۔ مرد میں خود غرضی ہوتی ہے، اُسے وارث کے لئے ایک عورت اور بیوی
کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ بیٹے کی تمنا اس لئے کرتا ہے کہ اس کی نسل ختم نہ ہو جائے بلکہ
آگے بڑھے۔ جبکہ عورت کی کوئی غرض نہیں ہوتی۔ عورت کا ادھورا پن تب ہی دُور ہوتا ہے

جب وہ ماں بن جاتی ہے۔''

''کیا ایک عورت کی تمنا اور سب سے بڑی دولت اُس کی اولاد ہی ہوتی ہے؟'' یگانہ نے پوچھا۔

''ہاں۔'' رخشندہ نے سر ہلایا۔''اس کے لئے اولاد سے بڑی دولت اور تمنا کوئی نہیں ہے۔''

''کیا دو تین بچوں کی طالب ہوتی ہے یا پھر اس کے لئے صرف ایک ہی بچہ کافی ہوتا ہے؟'' یگانہ نے سوال کیا۔

''ایک ہو یا دو تین بچے ہوں، بات ایک ہی ہوتی ہے۔'' رخشندہ نے جواب دیا۔''وہ نہ صرف سب کو ایک نظر سے دیکھتی ہے بلکہ سب پر اپنی ممتا نچھاور کرتی ہے۔ اس کے وجود میں ممتا کا چشمہ ہوتا ہے جس سے وہ اپنی اولاد کو سیراب کرتی ہے۔''

''تم صرف ایک بچے کی ماں بن جاؤ تو کیا تمہارے لئے یہ کافی ہوگا؟ تم خوش رہا کرو گی؟'' یگانہ نے پوچھا۔

''ایک بچہ بھی میرے لئے بہت بڑی دولت ہوگا، خوشی کا خزانہ ہوگا۔ جب میں ماں بن جاؤں گی، پھر میرے دل میں کسی چیز کی حسرت نہیں رہے گی...... میری ساری زندگی اس پھول سے مہکتی رہے گی۔ پھر میں آپ سے کچھ نہیں مانگوں گی۔''

''کاش......'' یگانہ نے ایک سرد آہ بھری۔''ہمارا خواب جلد پورا ہو جائے۔ میں تمہیں خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔''

''میں نے تم سے کہا ہے نا کہ مجھے اندھیرے میں شعاع نظر آ رہی ہے...... تمہیں وارث دُوں گی۔'' وہ پُر اعتماد لہجے میں بولی۔

کمرے میں ایک گہرا سناٹا چھا گیا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے دونوں مختلف سمتوں میں سوچ رہے ہوں۔ پھر میں چوروں کی طرح باورچی خانے کی طرف بڑھا۔ میں نے فریج سے ٹھنڈے پانی کی بوتل نکالی اور اُسے منہ سے لگا لیا۔ غٹا غٹ پانی پینے کے بعد بوتل واپس فریج میں رکھ دی۔ پھر زینے کی طرف بڑھا۔ میں نے دو سیڑھیاں طے کر کے اُن کے کمرے کی طرف دیکھا۔ یگانہ نے اُس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اُسے قریب کر لیا۔''کیا بات ہے تم اچانک خاموش ہوگئی ہو......؟ بہت سنجیدہ نظر آ رہی ہو......؟''

رخشندہ نے دیوار سے نظریں ہٹا کر اُس کی طرف دیکھا، پھر اُس کے بازو کے حلقے میں کسمسائی۔ پھر اُس نے بڑی نرمی اور آہستگی سے یگانہ کا ہاتھ کمر سے ہٹایا۔''میں آج بہت تھک گئی ہوں۔ تم سو جاؤ! رات کے گیارہ بج رہے ہیں۔ تمہیں جلدی اُٹھنا ہوتا ہے۔''

رخشندہ نے اُٹھ کر اپنے بالوں کو درست کیا۔ پھر وہ سوئچ بورڈ کی طرف بڑھی۔ اگلے لمحے کمرے میں گھپ اندھیرا چھا گیا۔ پھر میں نے بہت ہی آہستہ آہستہ سیڑھیاں طے کیں۔ اپنے کمرے میں آ گیا، پھر میں بستر پر بیٹھ گیا۔

چند لمحوں کے بعد میں اپنی حساس سماعت سے رخشندہ کے قدموں کی دھمک سن رہا تھا۔ وہ جیسے اپنے بیڈ رُوم سے نکل کر میرے کمرے کے عین نیچے والے کمرے میں آ گئی ہے۔ وہ بے چین ہے اور دہکتے جذبات کے انگاروں پر ٹہل رہی ہے۔ شاید وہ اس بات کو پسند نہیں کرتی تھی اُس کا بوڑھا شوہر اُسے سونے نہ دے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ میرا خواب دیکھنے لگی ہو؟ لیکن میں نے اُس کی آنکھوں میں بالکل بھی پیاس محسوس نہیں کی...... لیکن اُس کا مجھ سے کھل جانا؟ بے تکلف ہونا......؟

تھوڑی دیر کے بعد میں نے زینے پر چاپ سنی۔ رخشندہ آ رہی تھی۔ چند لمحوں کے بعد وہ کمرے میں داخل ہوئی۔ اُس کے ہاتھ میں دُودھ سے بھرا گلاس تھا۔ اُس کے سرخ گداز ہونٹوں پر ایک دلآویز تبسم رقصاں تھا۔ چہرے پر دمک تھی اور آنکھوں میں چراغ جل رہے تھے۔ وہ بغیر دوپٹے کے چلی آئی تھی۔ اُسی قمیض میں ملبوس تھی جس کا گریبان خطرناک حد تک کھلا ہوا تھا۔ رات...... تنہائی...... ایک بھرپور جوان عورت جیسے اُسے روکنے والا، ٹوکنے والا کوئی نہ ہو، جیسے راستہ سیدھا اور صاف ہو......

پھر اُس نے رسیلی آواز میں پوچھا۔''کیا بات ہے؟ کیا نیند نہیں آ رہی ہے؟ آپ نے تو کہا تھا کہ نیند آ رہی ہے۔''

''بستر پر آ کر لیٹا تو نیند غائب ہو چکی تھی۔ آپ بھی تو نہیں سوئی ہیں۔ یگانہ صاحب سو گئے؟''

میں ذرا دیر سے ہی سوتی ہوں۔ جب تک وہ سو نہ جائیں، میں جاگتی رہتی ہوں۔ وہ خواب آور گولیاں کھا کر سوتے ہیں۔ تھوڑی دیر پہلے میں نے آ کر دیکھا تو آپ آنکھیں بند کئے کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے، اس لئے میں آپ کے لئے دُودھ بنا لائی۔ دُودھ پینے سے نیند آ جاتی ہے۔'' اُس نے میری جانب دُودھ کا گلاس بڑھایا۔ وہ اتنی قریب آ گئی تھی

که میں اُس کے جسم کی تپش محسوس کرنے لگا۔ میری نگاہ اُس کے بدن کے فراز پر پڑی تو
میرے سارے جسم میں میٹھی سنسنی دوڑ گئی۔ وہ چاہتی تو گلاس میز پر بھی رکھ سکتی تھی۔ شاید
قریب آنے کے لئے اُسے بہانہ درکار تھا۔ گلاس لیتے وقت میرا ہاتھ اُس کی اُنگلیوں سے
چھو گیا تو برقی رو دوڑ گئی۔

''بہت بہت شکریہ......'' میں نے کہا۔ ''ویسے میں رات کو دُودھ پی کر سونے کا عادی
نہیں ہوں۔ کل سے آپ زحمت نہ کریں۔''

''دُودھ بہت اچھی چیز ہے۔ میں رات سونے سے پہلے ایک گلاس دودھ پی کر سوتی
ہوں۔ کیونکہ اس سے توانائی ملتی ہے۔ سارے دن کی تھکن دُور ہو جاتی ہے۔ آپ بھی تو
بھائی کی تلاش میں سارا دن دوڑ دُھوپ کر کے تھک چکے ہیں۔''

وہ جس لباس اور جس حالت میں بیٹھی تھی، اُس نے ماحول کو ہیجان خیز بنا دیا تھا۔
خاموشی اور تنہائی میرے جذبات کو تند کر رہی تھی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ یہاں بیٹھی رہے
اور میرا امتحان لیتی رہے، مجھے ایک سخت آزمائش میں مبتلا کر دے۔ اس لئے میں نے
دودھ کا گلاس ایک ہی سانس میں خالی کر دیا۔ ''اب میں سونے کی کوشش کرتا ہوں۔ شب
بخیر......'' میں نے دودھ کا گلاس اُس کے ہاتھ میں تھما دیا۔

''شب بخیر......'' وہ بستر سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ ''میں پہلو والے بیڈ رُوم میں جا کر
ایک گھنٹے تک ناول پڑھتی رہوں گی۔ میں جب تک کچھ پڑھ نہ لوں نیند نہیں آتی ہے۔
دوسرے کمرے میں اس لئے پڑھتی ہوں کہ ذرا سکون، اطمینان اور تنہائی ہوتی ہے۔ میں
بیڈ لیمپ کی روشنی میں نہیں پڑھتی، کمرے کے سارے بلب جلا لیتی ہوں۔ اس طرح یگانہ
کی نیند بھی خراب نہیں ہوتی ہے۔''

پھر وہ واپس جانے کے لئے مڑی۔ دروازے کی طرف بڑھی۔ اُس کے جسم کے
تناسب جیسے مجھ سے کہہ رہے تھے...... میں جا رہی ہوں...... تم میرے پاس آؤ گے......؟
میں نیچے جا کر اس بیڈ رُوم کا دروازہ بند کر دُوں گی جس میں یگانہ سو رہا ہے۔ میں پہلو
والے کمرے کا دروازہ کھلا رکھوں گی جس میں مطالعہ کروں گی...... میں تمہارا انتظار کروں
گی۔ اُس کمرے میں صرف ہم دونوں ہوں گے......''

جب وہ دہلیز پر پہنچی تب اُس نے یک بارگی میری طرف مڑ کے دیکھا۔ میری نظریں
اُس کی نظروں میں پیوست ہو گئیں۔ پھر وہ زینے کی طرف بڑھنے لگی۔ میں اُسے دیکھے جا
رہا تھا اور میرے چہرے سے میری کمزوری عیاں ہو رہی تھی۔ شاید...... اسی لئے وہ مسکرائی
تھی۔ پھر وہ چند ثانیوں کے بعد نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

کچھ دیر کے بعد میں نے محسوس کیا کہ کوئی غیر مرئی طاقت مجھے کمرے سے نکلنے کے
لئے مجبور کر رہی ہے۔ پھر میں کمرے سے نکل کر زینے پر آیا۔ اُس پہلو دار کمرے کا
دروازہ کھلا تھا۔ صرف اُسی میں روشنی ہو رہی تھی۔ وہ بستر پر لیٹی ہوئی ناول پڑھ رہی تھی۔
میں اُسے کچھ دیر تک دیکھتا رہ گیا۔ میں اُس کے سامنے کتراتا تھا اور نگاہ بھر کے دیکھنے کی
کوشش نہیں کرتا تھا۔ میرے اندر دو دن سے یہ جنگ جاری تھی کہ وہ ایک غیر اور شادی
شدہ عورت ہے۔ اس کے بارے میں پراگندہ احساسات کو دل میں جگہ نہیں دینی چاہئے۔
مجھے اُس کے بارے میں اس طرح سوچنا چاہئے کہ اُس سے نفرت ہے۔ مجھے اُس کے
خلوص، دوستی اور بے غرضی کا غلط مطلب نہیں لینا چاہئے۔ میں اپنے آپ سے لڑتا تھا، لیکن
اب اس وقت اُسے اُس کی نظریں بچا کر دیکھنے پر مجبور تھا۔ طلوع آفتاب کو، کھلے ہوئے
پھول کو اور نگینے کی طرح چمکتے ہوئے حسن کو ہر آنکھ دیکھتی ہے۔ ایک اوباش مے خوار بھی
دیکھتا ہے اور ایک عابد پرہیزگار بھی دیکھتا ہے۔ آنکھ کو بینائی اور نظارے کو پذیرائی قدرت
کے قانون نے دی ہوئی ہے۔ اس حقیقت اور سچائی سے کون اور کیوں انکار کر سکتا ہے؟

میں غیر محسوس انداز سے اس سچائی سے مبرا نہیں تھا۔ میں ایک جوان آدمی دل کے
ہاتھوں مجبور...... دنیا میں حسن و شباب کے مقابلے میں کوئی چیز پُرکشش نہیں ہے۔ اس
سے حسین نظارہ کوئی نہیں ہے۔ اس لئے میں اُسے چھپ کر دیکھ رہا تھا۔ اس لمحے میں یہ
سوچ رہا تھا کہ وہ کمرے کی تیز روشنی میں نہا رہی ہے۔ وہ کتاب پڑھتے پڑھتے سو گئی ہے۔
کتاب فرش پر گری ہوئی تھی۔ میں جو اُسے نظر بھر کے دیکھ رہا ہوں تو اسے کچھ خبر نہیں ہے۔
بالفرض محال اُس نے ایک دم سے اپنی آنکھیں کھول دیں، اس سمت دیکھ لیا اور میں اُسے
اندھیرے میں کھڑا دکھائی دیا یا اُسے احساس ہو گیا تو وہ کیا کہے گی؟ شاید وہ مجھ سے کہے گی
کہ...... کیا بات ہے؟ نیند نہیں آ رہی ہے؟ آ جاؤ...... ہم دونوں بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔
یگانہ نیند کی گولیاں کھا کر گہری نیند سو رہا ہے۔ وہ صبح سات بجے سے پہلے بیدار نہ ہو گا......
لیکن میں تو کسی اور ارادے سے یہاں نہیں آیا ہوں۔ میں حشر سامانیوں کا نظارہ کرنے آیا

ہوں جو بہت ہی دلکش اور دل میں، آنکھوں میں اُتر جانے والا ہے۔ اس طرح دیکھنے سے میری شجر کے سائے میں بھٹکتی ہوئی نگاہوں کو اور تپتے ہوئے جذبوں کو آرام آ جاتا ہے۔

پھر میں نے اپنی حساس سماعت سے محسوس کیا کہ اُس کا بدن غیر محسوس انداز سے بستر میں کسمسایا ہے۔ اُس نے اپنے اُوپری نصف چہرے کو دائیں بازو سے چھپا لیا اور گداز عریاں بازو کے پیچھے سے میری طرف دیکھ رہی ہے۔ اپنی ادھ کھلی آنکھوں سے اُس چور تماشائی کو دیکھ رہی ہے اور دل میں مسکرا رہی ہے۔ عورت فلسفی نہیں ہوتی، دانشور نہیں ہوتی کیونکہ اُس کی تخلیق آدم کے پہلو سے ہوئی ہے۔ اس لئے وہ آدم شناس ہوتی ہے اور اس لئے وہ مجھے اندھیرے میں کھڑے دیکھ کر سمجھ رہی تھی اور سمجھ چکی تھی۔ ایک عورت ہونے کے ناتے اُسے اس بات کا احساس تھا کہ مرد کی سب سے بڑی کمزوری عورت ہے۔

پھر میں ایک طرف کھڑا ہو گیا جہاں سے میں اُسے دیکھ سکتا تھا لیکن وہ مجھے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ میں نے دیکھا...... کچھ دیر کے بعد اُس نے اپنا بازو چہرے سے ہٹا لیا۔ مجھے اپنی نظروں سے اوجھل پا کر اُس کی آنکھیں پوری طرح کھل گئیں...... وہ بے چینی سے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی تھی کہ...... میں کہاں گیا؟ یا ہٹ کیوں گیا......؟ دراصل اُس نے میری چاپ سن کر دانستہ کتاب فرش پر گرا دی تھی کہ میں ہیجان خیز نظارے کی تاب نہ لا سکوں۔ اُس نے اس نظارے کو اور اُجاگر کرنے کے لئے اپنا بازو چہرے پر رکھ لیا تھا۔

پھر میں نے جیسے اُس کی آواز سنی...... وہ خود کلامی کر رہی تھی۔ ''سالار! تم جان بوجھ کر مجھے نظر انداز کر رہے ہو۔ تم نے شاید دل میں یہ سوچا ہے کہ میں کوئی حور پری ہوں؟ نہیں ہوں...... میں دنیا کی سب سے حسین عورت نہ سہی لیکن میں اس قدر حسین ہوں کہ کوئی مجھے دیکھے۔ جب بھی کوئی میری طرف دیکھتا ہے، نگاہ بھر کے دیکھتا ہے۔ میرے چہرے اور سراپا کو نظروں میں جذب کر لیتا ہے۔ تم فطری تقاضوں سے انکار کر رہے ہو...... اپنے آپ سے لڑ رہے ہو...... اپنے دل کو سمجھا رہے ہو۔ فریب دے رہے ہو کہ میں خوبصورت نہیں ہوں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے سالار......! تم سورج کی تپش محسوس کر رہے ہو اس لئے کہ وہ جل رہا ہے۔ اس کی گرمی تم تک پہنچ رہی ہے۔ میں بھی جل رہی ہوں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میرے بدن کی آنچ ایک مرد تک نہ پہنچے؟ تم فطرت کے خلاف باتیں کر رہے ہو۔ میری مثال بھی ایک ایسے قلندر کے درخت کی سی ہے جو زمین کی تہ میں جکڑا ہوا ہے۔ یہ آندھی اور طوفان کا سہارا لے کر خود کو زمین کی گرفت سے آزاد کرانا چاہتا ہے۔ یہ ہوا کی زد میں اِدھر سے اُدھر مچلتا ہے۔ اس کی شاخیں تڑپتی ہیں، پتیاں شور مچاتی ہیں۔ یہ جتنی جدوجہد کرتا ہے اتنا ہی بڑھتا جاتا ہے، پھیلتا جاتا ہے۔ اسی طرح تمہارے دل میں جو چور جذبات جکڑے ہوئے ہیں، تم آندھی طوفان بن کر انہیں مٹانے کی کوشش کرو پھر بھی وہ بڑھتے جائیں گے، پھلتے اور پھولتے جائیں گے۔ تم فطرت سے بغاوت نہیں کر سکتے۔ آج نہیں تو کل تمہیں اس حقیقت کے سامنے جھکنا پڑے گا۔ عورت مفتوحہ ہو کر خوشی محسوس کرتی ہے۔ تم اسے ایک فاتح کی طرح روند سکتے ہو، تاخت و تاراج کر سکتے ہو......!''

وہ قدرے بلند آواز میں خود کلامی اس لئے کر رہی تھی کہ اُس کا خیال تھا کہ میں کہیں چھپ کر کھڑا اُسے دیکھ رہا ہوں۔ میں اُس کی باتیں گم صم سنتا رہا۔ پھر اُس کے خاموش ہوتے ہی اُس کی باتوں کا سحر ٹوٹ گیا۔ میں اپنے کمرے میں چلا گیا۔ بستر پر دراز ہو گیا۔ میں جو نظارہ دیکھ کر آیا تھا اس نے میرے جذبات میں ہلچل مچا دی تھی۔ میں نے سوچا، وہ شاید میری جھولی میں پکے ہوئے پھل کی طرح گرنا چاہتی ہے...... شاید اس لئے کہ اس کا بوڑھا شوہر بہت بوڑھا ہے۔

○

دوسرے دن میں شام تک ناظم آباد کے ایک علاقے کی گلیوں، سڑکوں اور اُس کے بازاروں میں گھومتا رہا اور مکانوں کو اور لوگوں کو بھی دیکھتا رہا، بچوں اور لڑکوں کو بھی شاید ان میں میرا کوئی بھائی ہو...... ہر عمر کی لڑکیوں اور عورتوں کو بھی کہ شاید ان میں میری بہن یا ماں ہو...... یہ جانتے ہوئے بھی میں ان کے ذہن پڑھتا رہا کہ یہ میرے کوئی ہوئے تو مجھے پہچان لیں گے۔ میں اپنی تلاش میں سرگرداں رہا۔ میں بڑی حسرت سے دل میں سوچتا بھی رہا کہ کاش! مجھے اپنا نام ہی یاد آ جائے۔

جب میں دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد ایک ہوٹل میں داخل ہوا تو مجھے خیال آیا کہ...... کیوں نہ میں اپنی تصویر کھنچوا کر اخبار میں ایک اشتہار کے ساتھ شائع کراؤں کہ میرے دوست احباب مجھ سے رابطہ کریں۔ اس طرح میرے گھر والے بھی مجھ سے رابطہ کر لیں گے۔ پتہ اخبار کا پوسٹ بکس بھی دیا جا سکتا ہے۔ یہ خیال آتے ہی میں نے سوچا

که... کاش! میں پہلے ہی دن اس پر عمل کر لیتا۔ پھر میں نے سوچا کہ مجھے اس کام میں
نہیں کرنی چاہئے۔ اشتہار اخبار میں چھپوانے کے بعد مجھے کوئی ضرورت نہیں کہ میں ا
تلاش میں سرگرداں رہوں، خوار ہوتا رہوں۔ اس کا نتیجہ دو ایک دن میں سامنے آ جائے گا۔
کھانے کے دوران مجھے اچانک رخشندہ کا خیال آیا۔ اس وقت وہ فلیٹ میں تنہا
گی۔ کیوں نہ میں چلا جاؤں۔ اس سے باتیں کرتا رہوں۔ صرف باتیں...... یگانہ کے
آنے سے تھوڑی دیر پہلے نکل جاؤں۔ پھر میں نے یہ خیال دل سے نکال دیا۔ کیونکہ ا
میں بہکنے اور پھسل جانے کا خطرہ تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اپنے محسن کا بستر اور اُس کی بیو
کا بدن میلا کروں۔

میں نے ہوٹل سے نکل کر ایک فوٹو سٹوڈیو کا رُخ کیا جو صدر میں تھا اور ایک گھنٹے میں
تصویر کھینچ کر دے دیتا تھا۔ میں نے پاسپورٹ سائز کی تصویر کھنچوائی۔ جب وہ مجھے مل گئ
میں اُسے لے کر ایک مشہور و معروف اخبار کے دفتر پہنچا۔ میں نے کچھ سوچ کر اشتہار
مضمون اس طرح بنایا...... میں اپنے بھائی کی تلاش میں آیا ہوں ہوں۔ میرے دوست
احباب اور رشتہ دار مجھ سے بذریعہ خط رابطہ کریں۔

میں شام کے وقت فلیٹ پر پہنچا۔ میرا خیال تھا کہ یگانہ دفتر سے آ گیا ہو گا۔ لیکن و
نہیں آیا تھا۔ کسی وجہ سے آج اُسے دیر ہو گئی تھی۔ میں نے رخشندہ کو دیکھا، وہ بھڑکی
لباس میں تھی۔ اُس کے گلے میں دوپٹہ نہیں تھا۔ آج بھی اُس نے جو قمیص پہنی تھی اُس
گریبان آگے اور پیچھے سے خطرناک حد تک کھلا ہوا تھا۔ قمیص بغیر آستینوں کی تھی۔ معلو
نہیں یگانہ اُسے کیوں ایسے لباس پہننے دیتا تھا۔ اُس نے ہلکا میک اپ بھی کیا ہوا تھا جس کی
اُسے ضرورت نہ تھی۔ اُس کا حسن کسی میک اپ کا محتاج نہ تھا۔ اُس کے چہرے پر دل مو
لینے والا نکھار تھا۔

میں چاہتا تھا کہ فوراً اپنے کمرے میں چلا جاؤں۔ وہ جس عالم اور لباس میں میرے
سامنے کھڑی تھی وہ مجھے بہکا سکتا تھا۔ بغیر دوپٹے کے عورت ایسے لباس میں برہنہ سی لگتی
ہے۔ میں زینے کی طرف بڑھا تو وہ بولی۔ ''سنیے......!''

میں نے رُک کر اُس کی طرف گھوم کر دیکھا۔ وہ میرے قریب آ کر بولی۔ ''آپ ک
چائنیز کھانے میں کوئی اعتراض تو نہیں ہے؟''

میں نے کسی قدر اپنے لہجے پر زور دے کر کہا۔ ''اعتراض کیوں ہو گا...... چائنیز کھانے
تو مجھے بہت مرغوب ہیں۔''

''آپ کو کیا کیا مرغوب ہے، آپ نے مجھے بتایا کیوں نہیں؟'' رخشندہ نے مجھے
بڑا استفسار نگاہوں سے دیکھا۔

''کیا بتاؤں...... ویسے تو مجھے سب کچھ مرغوب ہے۔ آپ بہت اچھا پکاتی ہیں۔ میں
نے کوئی کمی محسوس نہیں کی۔ جب اتنا اچھا کھانا مل جاتا ہے تو مجھے فرمائش کرنے کی کیا
ضرورت ہے؟'' میں نے کہا۔

وہ بڑے صوفے پر بیٹھتی ہوئی بولی۔ ''آپ بیٹھ جائیں نا...! کھڑے کیوں ہیں....؟''

مجھے کپڑے بدلنے ہیں۔ سوچ رہا ہوں کہ منہ ہاتھ دھو کر تازہ دم ہو جاؤں۔'' میں نے
کھڑے کھڑے کہا۔

رخشندہ نے خود میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے صوفے پر اپنے پاس بٹھا لیا۔ ''پلیز! کچھ دیر
میرے پاس بیٹھ کر بات تو کریں۔ یگانہ کا کوئی ایک گھنٹہ پہلے ٹیلی فون آیا تھا کہ شاید اُسے
آج گھر پہنچنے میں دیر ہو جائے گی۔''

صوفے پر اُس کے پاس پھیل کر بیٹھنے سے مجھے شدت سے پیاس کا احساس ہوا۔ مجھے
یوں لگا جیسے حلق بری طرح سوکھ گیا ہو۔ کبھی مجھے رخشندہ کے اس قدر قریب بیٹھنے کا اتفاق
نہیں ہوا تھا اور نہ اُس نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اس طرح بٹھایا تھا۔ اُس نے جیسے ہی میرا
ہاتھ پکڑا تھا، میرے سارے بدن میں جیسے کرنٹ دوڑ گیا تھا۔ یہ اُس کے ہاتھ کا پہلا لمس
تھا جس نے میرے سارے بدن میں خون کی حدت بڑھا دی تھی۔ میں یونہی اُس کے
پاس بیٹھنا، تنہائی میں بہکنا نہیں چاہتا تھا کہ پیر پھسل جائے۔ میرے اور اُس کے درمیان
احترام اور اُس کی آبرو کی عزت کی ایسی دیوار حائل تھی کہ میں اسے ڈھا نہیں سکا اور نہ
ڈھانا چاہتا تھا۔ نشست گاہ میں آرائش و زیبائش کا بہت سارا سامان چاروں طرف بھرا ہوا
تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ جیسے اس کے بوجھ سے دیوار جھک گئی ہے اور موقع ملتے ہی گر پڑے
گی۔ میں نے اپنی پشت پر کشن ٹھیک کرتے ہوئے کہا۔ ''نجانے کیوں بڑے زور کی پیاس
لگ رہی ہے۔'' نشست گاہ میں ایئر کنڈیشنر چل رہا تھا۔

''ابھی دیتی ہوں۔'' رخشندہ صوفے سے اُٹھ کر باورچی خانے کی طرف بڑھ گئی۔ چند

منٹ کے بعد سفید جھلکتا ہوا پانی کا گلاس لئے وہ واپس آ گئی۔ اُس نے گلاس بڑھاتے
ہوئے پوچھا۔ ''کچھ کھاؤ گے......؟ کہو تو پکوڑے بنا دُوں یا شامی کباب تل دُوں؟''
''نہیں......رہنے دیجئے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''جب یگانہ صاحب آ جائیں گے تو
ساتھ کھا لوں گا۔''
رخشندہ نے بائیں ہاتھ سے اپنی آنکھ ملتے ہوئے کہا۔ ''سالار صاحب! دیکھنا تو......
میری آنکھ میں کیا پڑ گیا ہے؟ بڑی تکلیف ہو رہی ہے۔'' اُس نے میرے قریب آ کر اپنی
آنکھ کا نچلا حصہ کھینچ کر آنکھ میرے سامنے کر دی اور پتلیاں اِدھر اُدھر گھمانے لگی۔
میں نے بائیں ہاتھ سے اُس کے کندھے پر دباؤ ڈال کر دائیں ہاتھ کی اُنگلیوں سے
اُس کی پلکیں پکڑ کر آنکھوں میں جھانکا اور چند لمحوں تک آنکھوں میں پڑی ہوئی چیز تلاش
کرتا رہا۔ رخشندہ میرے اور قریب آ گئی۔ اتنی قریب کہ اُس کے شانے میرے سینے سے
مس ہو گئے۔ ایک پل کے لئے میں نے گلے سے نیچے دیکھا، پھر نگاہیں ہٹا لیں۔ کیونکہ
یہ معیوب سی حرکت تھی۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ اُس نے ایسا جان بوجھ کر کیا تھا
یا غیر ارادی طور پر ہو گیا ہے۔ میری دونوں آنکھیں دُھندلا گئیں اور ہاتھ کانپنے لگے۔
میں نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔ ''مجھے تو کچھ بھی دکھائی نہیں دیا۔''
''پلیز! ذرا ٹھیک سے دیکھیں۔ یہ رُومال لیں۔'' اُس نے میری جیب سے رُومال
نکال کر میری طرف بڑھا دی۔
میں نے اپنی اُنگلیوں سے پلکیں چیر کر غور سے دیکھا۔ میں اچھی طرح دیکھ چکا تھا
اُس کے کہنے پر دوبارہ غور سے دیکھنے لگا۔ اس کے بعد میں نے دیکھا کہ اُس کا جسم ہلکا ہلکا
کانپنے لگا ہے۔ مجھے حیرت ہوئی کہ یہ عجیب و غریب غیر فطری بات تھی۔ اُس کے جسم کی
لرزش آہستہ آہستہ بڑھتی گئی۔ اُس کا شاخِ گل جیسا بدن تڑپنے لگا۔
میں نے اُس کے دونوں کندھوں کو جھنجھوڑ کر کہا۔ ''یہ آپ کو کیا ہوا......؟''
رخشندہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ دونوں آنکھیں بند کئے، کانپتے کانپتے وہ فرش پر
پڑی۔ میں نے فوراً ہی ٹٹول کر نبض دیکھی۔ نبض تو ٹھیک ہی تھی، پھر بھی میں سخت پریشان
ہو گیا تھا۔ کیا کروں؟ کیا نہ کروں؟ میں کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا۔ اس بے ہوشی کے
میں اُسے علاج کی ضرورت تھی۔ بلاوجہ شور یا ہنگامے سے کوئی فائدہ نہ تھا۔ میں نے جی

کر چند لمحوں تک اُس کا چہرہ غور سے دیکھا اور اس کے بعد ایک ہاتھ سر کے نیچے اور دوسرا
ہاتھ کمر کے نیچے ڈال کر میں نے اُسے اُٹھا لیا جیسے وہ کوئی تین چار سال کی بچی ہو۔ وہ بے
حد ہلکی پھلکی سی تھی۔ اُس کا بدن بے حس و حرکت تھا۔ نرم تھا۔ اتنا نرم کہ معلوم ہوتا تھا کہ
اسے جہاں سے بھی الگ کیا جائے، الگ ہو جائے گا۔ دیکھنے میں وہ صحت مند تھی لیکن
اُس کا بدن بالکل ہلکا تھا۔ اُس کی شلوار کے پائنچے پنڈلیوں کو آزاد کئے ہوئے تھے۔ میں
نے دیکھا اُس کی مکھن جیسی پنڈلیاں سڈول اور خوبصورت تھیں۔ میں نے چند لمحوں تک
اُس کے سینے سے کان لگا کر دل کی حرکت معلوم کرنے کی کوشش کی، پھر اُسے بیڈ رُوم میں
لے جا کر بستر پر لٹانے کے لئے آگے بڑھا۔ اس کے بعد میں اپنے دونوں ہاتھ بند کر کے
اُسے بستر پر لٹانا چاہتا تھا کہ یکایک رخشندہ بیہوشی کے عالم میں ہڑبڑا کے کھڑی ہو گئی اور
دونوں آنکھیں بند کئے ہوئے مجھ سے بری طرح لپٹ گئی اور مجھے اپنے سینے سے ٹکائے
بستر پر لڑھک گئی۔ میں بھی اُس کے ساتھ کروٹ کے بل بستر پر گرا۔ وہ مجنونانہ طور پر مجھے
اپنے سینے سے لگاتی اور بڑبڑاتی رہی۔ الفاظ کچھ بے ربط تھے۔ آواز اس قدر مدھم تھی کہ
میں ایک لفظ بھی ٹھیک سے سن نہ سکا اور نہ میری سمجھ میں آ سکا۔ پھر اُس کے سرخ گداز
بھرے بھرے اور جلتے اور پیاسے ہونٹوں نے میری گردن، میرے رخساروں اور ہونٹوں
کو جیسے جھلسا دیا۔ پھر وہ کہنے لگی۔ ''یگانہ...... میری جان یگانہ...... میں کیا تمہاری سلومی
نہیں ہوں؟ دیکھ! میں مر رہی ہوں۔ مجھے اپنے سینے میں جذب کرو۔ میرے ہونٹوں کا
بوسہ لے لو...... میں کیسی آگ میں جل رہی ہوں۔ دیکھو......''
پھر وہ اپنی آنکھیں بند کئے رونے لگی اور دیر تک روتی رہی۔ یہاں تک کہ میری قمیض
اُس کے آنسوؤں سے بھیگ گئی۔ پھر اُس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ اُس کا سینہ بری طرح
دھڑک رہا تھا۔ سانسوں کے زیر و بم نے اسے ہیجان خیز بنا دیا تھا۔ پھر مجھے احساس ہوا کہ
میرا اُس کے ساتھ لیٹے رہنا مناسب نہیں ہے۔ مجھے یکلخت ایسا محسوس ہوا کہ یگانہ گھر میں
داخل ہو گیا ہے۔ اُس کے ہاتھ میں وہی ریوالور ہے جو اُسے اُس روز بدمعاش سے ملا
تھا۔ وہ گھر میں یوں داخل ہو سکتا تھا کہ اُس کے پاس فلیٹ کی ایک چابی ہوتی تھی۔ وہ
مجھے اپنی بیوی کی آغوش میں دیکھ کر مشتعل ہو جائے گا۔ رخشندہ ایک تو نامناسب لباس میں
ہے اور پھر ہم دونوں اس کے بیڈ پر ہیں۔ میں ڈر سا گیا۔ میرے دل میں خوف کی لہر

اُٹھی۔ مجھے ایسے لگا وہ دہلیز پر کھڑا ہم دونوں کو قہر آلود نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ ایک غیرت مند مرد ہم دونوں کو اس حالت میں دیکھ کر شوٹ کرنے سے باز نہیں رہ سکتا۔ وہ ہم دونوں کو بھی شوٹ کر دے گا۔ میں نے سر گھما کر دہلیز کی طرف دیکھا، وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں نے فوراً ہی غیر محسوس انداز سے اُس کی بانہوں کے خنجر سے اپنے آپ کو نکالا۔ اُس کی گرم سانسیں میرے چہرے کو جھلسا دیئے جا رہی تھیں۔ میں بستر سے نکل کر فرش پر کھڑا ہو گیا۔

پھر میں نے تکیہ ٹھیک کر کے اُس کا سر تکیے پر رکھا اور اُسے بستر پر درمیان میں ٹھیک سے سلا دیا کیونکہ بائیں جانب کروٹ لینے سے وہ فرش پر گر سکتی تھی۔ وہ کنارے پر لیٹی ہوئی تھی۔ پھر میں غور سے اُس کا چہرہ دیکھتا رہا۔ رخشندہ اب بھی آنکھیں بند کیے بڑبڑا رہی تھی۔ کیا اسے دورے بھی پڑتے ہیں......؟ لیکن اُسے دیکھ کر اندازہ کرنا مشکل تھا۔ کیا میں یگانہ کو ٹیلی فون کر دوں؟ میرے پاس یگانہ کا فون نمبر نہیں تھا اور نہ میں نے اس کی ضرورت سمجھی اور محسوس کی تھی۔ میں نے سوچا کہ اسے اس کے حال پر چھوڑ دینا چاہیئے۔ شاید اس طرح سو جائے گی۔ نیند آنے سے شاید اس کی طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔ یگانہ بھی شاید آتا ہو گا۔

میں نے سوچا تھا کہ میں شام کے وقت طارق روڈ کا ایک چکر لگاؤں گا۔ شاید اس بازار میں میرا کوئی جاننے والا ٹکرا جائے۔ میں سوچ میں پڑ گیا کہ جاؤں یا نہ جاؤں؟ اس وقت رخشندہ کو اس حالت میں چھوڑ کر جانا مناسب نہیں تھا۔ اگر جانا ہے تو مجھے یگانہ کا انتظار کر لینا چاہیئے۔ ورنہ رخشندہ اور وہ دل میں کیا سوچیں گے کہ میں کس قدر خود غرض شخص ہوں۔

میں نے اپنے کمرے میں آ کر اپنا وہ جوڑا الماری سے نکالا جو رخشندہ نے دھو کر استری کر کے ہینگر میں لگایا ہوا تھا۔ پہلے نہانے کا ارادہ نہیں تھا لیکن اب نہانا ضروری ہو گیا تھا۔ پھر میں وہ جوڑا لے کر ملحقہ غسل خانے میں آ گیا۔ اس جوڑے کو میں نے آج ہی پہنا تھا اور یہ دو دن تک چل سکتا تھا۔ لیکن اب اسے دھونے کی ضرورت تھی۔ اس لئے میں نے اُتار کر اسے اُس جگہ ٹانگ دیا جہاں دھونے کے کپڑے ٹانگے جاتے تھے۔

نہاتے وقت میرے سارے بدن پر ایک میٹھی سنسنی دوڑ رہی تھی۔ مجھے اس بات کی خوشی ہو رہی تھی کہ میں غلاظت کے دلدل میں گرتے گرتے بچ گیا۔ میری جگہ کوئی زاہد بھی ہوتا تو شاید وہ اپنے آپ کو گرانے سے بچا نہیں سکتا تھا۔

میں جلد ہی نہا کر کپڑے پہن کر غسل خانے سے باہر آ گیا۔ نہانے میں، میں نے

صرف دس پندرہ منٹ صرف کئے تھے۔ میں نے کمرے میں آ کر تولیے سے اپنے بالوں کو اچھی طرح خشک کیا، پھر بالوں میں کنگھی کی۔ اس میں بھی دس منٹ لگ گئے۔ سوچا چل کر کیوں نہ رخشندہ کو دیکھ لوں۔ اسی لمحے اطلاعی گھنٹی گنگنائی۔ میں نے سوچا کہ جا کر دروازہ کھول دُوں شاید یگانہ آیا ہے۔ آج شاید وہ پھر اپنی چابی بھول گیا ہے۔ میں دروازے کی طرف بڑھا اور دہلیز پر ٹھٹک گیا۔ کیونکہ رخشندہ دروازہ کھولنے کے لئے جا رہی تھی۔ میں فوراً ہی دروازہ بھیڑ کر جھری میں سے دیکھنے لگا۔ رخشندہ کی طبیعت ٹھیک لگ رہی تھی۔ اُس کی چال متوازن تھی۔

رخشندہ نے دروازہ کھولا۔ یگانہ اندر داخل ہوا تو اُس کا چہرہ دھک رہا تھا۔ وہ کوئی جوان نہیں تھا، ایسا لگ رہا تھا وہ اس کا باپ ہو۔ وہ پوری طرح سے گنجا تھا۔ اُس کے سر پر دائرے کی شکل میں بال تھے جو چاندی کی باڑ معلوم ہوتے تھے۔ وہ مسکراتا تو ایک نرم مزاج اور خوش اخلاق شخص نظر آتا تھا۔ خوش پوشاکی کے باعث وہ قدرے وجیہہ اور جوانوں کی طرح چاق و چوبند دکھائی دیتا تھا۔

اُس نے رخشندہ کے لباس پر ایک تنقیدی نظر ڈالی۔ ''تم تو اس لباس میں میرے دل پر قیامت ڈھا رہی ہو۔''

رخشندہ نے اس تعریفی انداز پر کسی ردِعمل کا اظہار نہیں کیا۔ اُس کا چہرہ سپاٹ ہی رہا۔ وہ دروازہ بند کرنے کے لئے بڑھ گئی۔ جب وہ چٹخنی لگا کر اُس کے پاس سے گزرنے لگی تو یگانہ نے اُس کی بانہہ پکڑ لی۔ ''جان! معاف کرنا......آج مجھے خاصی دیر ہو گئی۔''

پھر اُس نے رخشندہ کو بازوؤں میں سمیٹ کر اُس کی گردن اور ہونٹوں پر ہونٹ رکھ دیئے۔ بوسہ لیتے وقت وہ جیسے کسی احساسِ کمتری میں مبتلا ہو جاتا اور ایک ڈلنگا پن سا ہوتا تھا۔ اُس کے انداز میں کوئی گرم جوشی نہیں تھی۔ یہ میرا اندازہ تھا۔ رخشندہ ایک سرد لاش کی طرح اُس کے بازوؤں میں تھی۔ اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی تھی کہ اسے اپنی بیوی کی عمر اور سرد مہری کا شدت سے احساس تھا۔ اور شاید وہ اپنے اور اُس کے ذہنی فاصلے سے بھی آگاہ تھا۔ عمروں میں بہت فرق تھا۔ اُس میں نوجوانوں کی سی بات نہیں آ سکتی تھی۔

رخشندہ نے اپنی سرد مہری اور بیزاری کے باوجود اُسے بوسہ لینے سے نہیں روکا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ پہلے بھی اُسے نہیں روکتی تھی۔ وہ کوئی اُس کا آشنا نہیں، شوہر تھا۔ وہ ایک

اداکارہ تھی۔ ہر عورت ایک اداکارہ ہوتی ہے لیکن وہ ایک اچھی اداکارہ نہیں تھی۔ وہ ایک فاصلے کے باعث شاید گرم جوشی اور مسرت ظاہر نہیں کرتی تھی۔ اس سرد مہری اور اُکتاہٹ کے انداز سے میں یہ محسوس کر رہا تھا کہ اسے اپنی ازدواجی زندگی سے اطمینان نہیں تھا اور یہ بات اُس نے پوشیدہ رکھنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی تھی۔ یوں بھی مرد اپنی بیوی کے رویئے سے محسوس کر لیتا ہے۔ اور پھر ایک عورت جانتی اور اتنا تو سمجھتی ہے کہ اس کے شوہر کو اس کی جذباتی کیفیت کا پورا احساس ہو جاتا ہے۔ رخشندہ نے شاید کبھی اس قدر بے چینی اور ناآسودگی ظاہر نہیں کی تھی کہ اُس کا شوہر یہ شک کرے کہ اُس کے کسی مرد سے تعلقات ہیں۔ اور پھر شاید وہ اپنے شوہر پر مکمل اعتماد بھی نہیں کرتی ہوگی۔ اس لئے وہ کسی ایسے دوراہے پر آنے سے گریز کرتی تھی جہاں سے واپسی ناممکن ہو جائے۔ وہ بڑی محتاط اور دُوراندیش تھی۔ جب یگانہ کچھ زیادہ ہی جذباتی اور وحشی ہونے لگا تو وہ سسکاری بھرتی ہوئی اُس کے بازوؤں سے نکل آئی۔

''سالار کیا ابھی تک نہیں آئے......؟'' یگانہ نے اپنا بریف کیس فرش سے اُٹھاتے ہوئے دریافت کیا۔

''وہ آچکے ہیں......'' رخشندہ نے جواب دیا۔ ''اپنے کمرے میں ہیں۔ شاید نہانے اور کپڑے بدلنے گئے ہیں۔''

''اُنہیں آئے کتنی دیر ہوئی......؟'' یگانہ کے لہجے میں شک کی پرچھائیاں تک نہ تھیں۔

''ایک گھنٹہ تو ہو رہا ہے۔'' رخشندہ اتنا کہہ کر بیڈ رُوم کی طرف بڑھی۔

اُس نے بیڈ رُوم میں داخل ہو کر سنگھار میز کے آئینے میں اپنے سراپا پر تنقیدی نظر ڈالی۔ اُس کے خوبصورت چمکیلے سیاہ بال بے ترتیب تھے لیکن اتنے نہیں کہ یگانہ کو شک میں مبتلا کریں۔ وہ اپنی لپ اسٹک بھی صاف کئے ہوئے تھی۔ اُس کی بڑی بڑی آنکھیں سیاہ بالوں کی وجہ سے پُرکشش دکھائی دیتی تھیں۔

''کیا کوئی خوشخبری ہے؟'' یگانہ نے بیڈ رُوم کا دروازہ بند کرتے ہوئے پوچھا۔

معلوم نہیں وہ رخشندہ سے کس خوشخبری کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ مجھے کوئی تجسس تھا اور نہ ہی کوئی اشتیاق اور نہ میں نے اُن کے ذہنوں سے اپنے ذہن کا رابطہ کرنے کی کوشش کی۔ کھانے کی میز پر یگانہ آیا تو میں نے دیکھا کہ اُس نے کپڑے نہیں بدلے ہیں۔ اُس

نے کہا۔ ''مسٹر سالار! میں ایک بہت ضروری کام سے رات کی فلائٹ سے لاہور جا رہا ہوں۔ کل رات واپسی ہوگی۔ میں اس لئے جا رہا ہوں کہ آپ یہاں موجود ہیں۔ رخشندہ بھی رات اتنے بڑے گھر میں اکیلی نہیں رہی ہے۔ اسے آپ کی موجودگی سے ڈھارس رہے گی۔''

مجھے اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ میں نے سوچا اسے مجھ پر کس قدر اعتماد ہے کہ اپنی جوان بیوی کو ایک اجنبی مرد کی موجودگی میں چھوڑ کر جا رہا ہے۔ مرد جو تنہائی میں ناگ بن جاتا ہے، عورت کو ڈس لیتا ہے۔ اور پھر اس کی بیوی جو نوجوان، حسین اور پُرشباب اور گداز بدن کی بے حد پُرکشش عورت ہے اس پر بھی تو آنچ آسکتی ہے۔ کیا اس عمر میں ایک شخص اس قدر سٹھیا جاتا ہے؟ کیا اسے اپنی نوجوان بیوی پر اندھا اعتماد ہے؟ میں نے کن انکھیوں سے رخشندہ کی طرف دیکھا۔ اُس پر ایک گہری سنجیدگی طاری تھی۔ اُس کا چہرہ ہر قسم کے جذبات سے عاری تھا۔

یگانہ کھانا کھانے کے نصف گھنٹے کے بعد چلا گیا۔ میں اپنے کمرے میں آگیا۔ نیچے والے کمرے میں ایک جوان عورت تھی۔ اس احساس نے میری نیند اُڑا دی تھی۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ نیچے چلا جاؤں، رخشندہ کو نظر بھر کے دیکھوں......

اسی وقت دروازہ کھلا اور میں ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ میں ٹھٹک گیا۔ مجھے اپنی نظروں پر یقین نہیں آیا۔ اُس کا بدن شب خوابی کے لباس میں آنچ دے رہا تھا۔ وہ میری طرف بڑھتی ہوئی جذبات سے لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔

''سالار! تم میرے پاس آرہے تھے نا......؟'' جب وہ میرے پاس آکر رُکی تو اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ''تم آئے کیوں نہیں...... میں تمہارا انتظار کر رہی تھی۔''

''سنو رخشندہ!'' میں نے کہا۔ ''تم میرے دوست کی بیوی ہو۔ وہ میرا محسن بھی ہے۔ وہ تمہیں بطور امانت میری تحویل میں دے گیا ہے۔ میں اُس کی امانت میں خیانت کا تصور بھی نہیں کر سکتا...... ایک بوسہ بھی خباثت کے مترادف ہوگا۔''

''میں عورت ہوں اور تم مرد ہو... میں اپنے جسم کی مالک ہوں۔ یہ میری اپنی ملکیت ہے۔ اپنا تن جس پر چاہوں نچھاور کر دوں...... اس میں کوئی خیانت نہیں ہوگی۔ وہ تمہارا دوست اور محسن ہے، میرا نہیں... اب تم بھول جاؤ کہ تم کون ہو؟ یگانہ کون ہے؟ میں کون ہوں؟''

''آخر تم کس لئے ایسا چاہتی ہو؟'' میری سانس آواز کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔

''اس لئے کہ میں ایک عورت ہوں۔ میرے وجود میں ممتا ہے۔ سیراب ہونا چاہتی ہوں۔ میری ممتا اسی وقت سیراب ہوسکتی ہے کہ میں ماں بن جاؤں۔ میں چاہتی ہوں کہ تم میرے بچے کے باپ بن جاؤ......'' اُس کی آواز بھرا گئی۔

''لیکن وہ ناجائز اولاد ہوگی...... میں اتنی دُور نہیں جاسکتا۔'' میں ایک قدم پیچھے ہٹا۔

''مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں کہ وہ جائز ہے یا ناجائز......'' اُس نے دل گرفتہ لہجے میں کہا۔ ''سالار! انکار نہ کرو۔ میں اپنی خالی جھولی لئے تمہارے سامنے ایک بھکارن بنی کھڑی ہوئی ہوں۔ میرے پاس تمہیں دینے کے لئے کچھ نہیں ہے۔ لیکن مانگنے کے لئے میرے پاس جھولی ہے۔ تم مجھے بہت کچھ دے سکتے ہو...... مجھے ایک بچہ چاہئے جو میرا ادھوراپن دُور کردے۔ مجھے عورت بنادے۔ میری ممتا کی ٹھنڈک بن جائے۔''

وہ رونے لگی۔ اُس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ پھر ان ہچکیوں کے درمیان بولی۔ ''میں اپنی ممتا کہاں تلاش کروں......؟ میں اپنی خالی جھولی لئے کہاں کہاں پھروں......؟ اگر تم نے میری آرزو پوری نہیں کی تو معلوم نہیں میں کیا کروں گی؟''

''میں تمہیں ایک مشورہ دُوں......'' میں نے کہا۔ ''اس طرح تمہاری آرزو پوری ہو جائے گی۔''

''تمہارا مشورہ کیا ہے......؟'' اُس نے مجھے بھیگی آنکھوں سے دیکھا۔

''تم یگانہ سے طلاق لے کر کسی اور مرد سے شادی کرلو...... تم حسین ہو۔ تمہیں کوئی نہ کوئی ہم سفر مل جائے گا۔''

''نہیں...... میں ایسا نہیں کرسکتی۔ میں اتنا لمبا سفر نہیں کرسکتی۔'' پھر اُس نے تڑپ کر اپنی دونوں عریاں باہیں میرے گلے میں حائل کردیں پھر مجھ سے لپٹ کر جذباتی آواز میں بولی۔ ''تم میری زندگی میں آنے والے پہلے اور آخری مرد ہو جس سے میں نے محبت کی...... میں اپنی محبت سدا قائم رکھوں گی...... یگانہ نے دیوار بننے کی کوشش کی تو میں اُسے قتل کردُوں گی۔'' یہ کہتے ہوئے اُس کا لہجہ سفاک ہوگیا......!

ooo

میں نے چونک کر حیرت اور خوف سے اُس کی شکل دیکھی۔ میرے سارے بدن میں ایک سرد لہر سی دوڑ گئی۔ ''سنو رخشندہ!'' میں اُس کی آنکھوں میں جھانکنے لگا۔ ''تم میری محبت کے لئے اپنے شوہر کو موت کے منہ میں دھکیل دوگی؟''

''ہاں......!'' رخشندہ نے سر ہلایا۔ ''ایک عورت اپنی محبت کو پانے کے لئے بہت کچھ کرسکتی ہے۔''

''تم یہ بات کیوں بھول رہی ہو کہ یگانہ تمہارا مجازی خدا ہے۔ چاہے وہ جیسا بھی ہے، جو بھی ہے وہ تمہارا اپنا ہے۔ تمہیں اُس سے محبت کرنی چاہئے۔ وہ تم سے نہ صرف بے پناہ محبت کرتا ہے بلکہ تم پر اندھا اعتماد کرتا ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں ایک غیر مرد ہوں، اجنبی ہوں اور ایک دن کی شناسائی ہے، مجھ سے اُس کا کوئی رشتہ نہیں ہے اور نہ تم سے میرا کوئی تعلق...... نہ دوستی اور نہ ہی کوئی جان پہچان...... پھر بھی وہ یہ جانتے ہوئے کہ میں ایک جوان اور خوبصورت مرد ہوں اُس نے مجھ پر اعتماد کیا۔ تمہیں اُس کے بھروسے کو پامال نہیں کرنا چاہئے۔ ایک مرتبہ اعتماد کا شیشہ چکنا چور ہوجائے تو پھر وہ جڑتا نہیں ہے۔''

اسی ایک لمحے رخشندہ کا مزاج بدل گیا۔ وہ مجھے ایک محبوبہ کی طرح سمجھانے لگی۔ ایک عورت کی طرح مجھ سے لپٹ لپٹ کر اپنے بدن کو سینکنے لگی۔ میرے بدن، رخساروں، گردن اور ہونٹوں پر ایک میٹھی اور انوکھے لمس کی تپش ہونے لگی۔

بعض اوقات جذبات کی افراتفری میں ایسی دوغلی کیفیت طاری ہوجاتی ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا دل کدھر جارہا ہے؟ دماغ کدھر جارہا ہے؟ ممتا کے قدم کہاں پڑ رہے ہیں اور عورت کے پاؤں کہاں پھسل رہے ہیں۔

رخشندہ دونوں ہاتھوں سے میرے چہرے کو تھام کر اپنی سانسوں کے قریب لے آئی۔ میں نے مزاحمت کی لیکن میں نے محسوس کیا کہ یہ بڑی کمزور سی مزاحمت ہے۔ اس میں

بے دلی سی ہے۔

''میرے سالار! میں تم سے محبت کر رہی ہوں۔ مجھے پیار کرو...... ایسا پاکیزہ بوسہ لو
غلیظ نہیں ہوتا ہے...... جو آئینے کی طرح صاف وشفاف ہوتا ہے...... جو دودھ کی طرح ا
اور میٹھا ہوتا ہے...... میرے ہونٹوں کو اس طرح چھولو کہ دوستی کی ابتداء اور محبت کی انتہا
جائے...... امر محبت کی انتہا...... یادگار محبت کی انتہا......

پھر نجانے مجھے کیا ہوا؟ اُس نے کیا جادو کر دیا کہ میں اُس کے چہرے پر جھک گیا۔
ہم دونوں کے ہونٹ بڑی آہستگی اور بڑی نرمی سے اس طرح ملے جیسے مصافحے کے
لئے دو ہاتھ خلوص سے ملتے ہیں۔

اس بوسہ کی ابتدائی پاکیزگی میں کوئی شبہ نہیں تھا۔ لیکن پھر اس پاکیزگی اور خلوص میں
سانسوں کی گرمی گھلنے لگی......

پھر شفاف آئینے میں ذرا سا بال آ گیا...... اُس پر خراش پڑ گئی......!

دُودھ میں ذرا سا پانی مل گیا اور وہ بوسہ ایک ضدی بچے کی طرح مچلنے لگا۔

وہ بوسہ انسانی تاریخ کی ابتداء سے شجر ممنوعہ کے سائے سے رینگتا رینگتا ہم دونوں
کے لبوں تک آیا تھا۔ اس لئے منہ زور جذبات کی طرح لب بہ لب پھڑ پھڑانے لگا۔ ماہی
بے آب کی طرح پھڑ پھڑانے لگا۔

ہم دونوں شجر ممنوعہ کی چھاؤں میں تھے۔ وہ شجر ممنوعہ جس کی جڑیں جنت آسمانی میں
ہیں اور جس کا سایہ جنت ارضی پر پھیلتا ہے۔ اور جس کے سائے میں بنت حوا اور ابن آدم
آج بھی جلتے ہیں...... یہ الگ بات ہے کہ وہ اس جلن کا اظہار نہیں کرتے ہیں...... اخلاق
اور تہذیب کی پابندیوں میں چور جذبوں کو چھپائے پھرتے ہیں...... میں نے دیوانہ وار
ان جذبوں کو چومتے ہوئے کہا۔ ''اب میں سمجھا کہ میرے دل میں چور تھا، اُس دن سے
جس دن تمہیں پہلی بار دیکھا۔''

''تمہیں کیا بتاؤں...... تمہیں دیکھتے ہی میرے دل نے کہا کہ تم وہی ہو جس کا میں
خواب نو جوانی کے آغاز سے دیکھتی آ رہی ہوں۔''

رخشندہ جادوگرنی تھی۔ وہ شاید کچھ جادو جانتی تھی۔ مجھے جوانی کے جنگل میں لے گئی۔
جوانی کے جنگل سے گزرنے کا یہ میرا پہلا اتفاق تھا۔ میں نو وارد تھا، اجنبی تھا۔ ہم دونوں

خود فراموشی کی حالت میں ایک دوسرے کی دل داری کر رہے تھے۔ وہ میری رہنما تھی۔
میری رہنمائی کر رہی تھی۔ میں اندھیرے میں راستہ بھول جاتا تو وہ چراغ دکھاتی تھی۔ میں
راہ سے بھٹکتا تو وہ مجھے منزل کی طرف کر دیتی۔ دُشوار گزار سفر پر ہم سفر کی اہمیت
احساس ہوتا ہے۔ اب ہم دونوں ہم سفر ہی نہیں تھے بلکہ ہم نفس بھی تھے۔ ہم قدم اور ہم
مزاج...... ہم دونوں ایک دوسرے پر منکشف ہو رہے تھے۔ اپنے اپنے راز ایک دوسرے
پر کھول رہے تھے۔ اپنی اپنی کہانی ایک دوسرے کو سنا رہے تھے۔ ہم دونوں بہت لمبے سفر
پر نکل کھڑے ہوئے تھے۔ سرشاری وسرمستی سے ہم دونوں کے پاؤں زمین پر نہیں لگ
رہے تھے۔ ہم دونوں اعتراف واقرار کر رہے تھے۔ اس مسافت نے ہم دونوں کو ایک
دوسرے سے آشنا کر دیا تھا۔ یہی محبت کا حاصل تھا۔ جب رُوح ملتی ہے تو جسم بھی درمیان
میں آ جاتا ہے۔ ہم رُوح کے سفر میں ایک دوسرے کے بدن کے شریک تھے، ایک
دوسرے کے دل شریک، جان شریک اور وفا شریک...... پھر ہم دونوں غلاظت کے دلدل
میں گر پڑے۔ جتنا نکلنے کی کوشش کرتے اتنا ہی دھنستے جا رہے تھے......!

صبح جب میں اپنے کمرے میں آیا تو مجھے افسوس، دُکھ اور پچھتاوا سا ہوا کہ یہ کیا ہو
گیا....؟ اب چونکہ تیر کمان سے نکل چکا تھا اس لئے دُکھ اور پچھتاوا بیکار تھا۔ میں نہا کر اور
ناشتہ کر کے فلیٹ سے نکل گیا کیونکہ رخشندہ رات کی یادیں پھر سے تازہ کرنا چاہتی تھی۔
ایک دُلہن کی طرح اُس کا جسم مستی اور مسرتوں کی فراوانی سے ٹوٹ رہا تھا۔ اُس نے مجھ
سے کہا تھا یگانہ رات تک آئے گا لہٰذا میں رُک جاؤں۔ اس تنہائی سے فائدہ اُٹھاؤں۔
شاید ہی پھر کبھی ایسے نشاط انگیز لمحات زندگی میں آئیں۔

رات میرے لئے شادی کی پہلی رات کی طرح تھی۔ ہم دونوں جیسے سچ مچ کے دُلہا
دُلہن بن گئے تھے۔ میرے سینے میں ایک پھانس سی گڑ گئی تھی۔ میرا دل مجھے ملامت کر رہا
تھا۔ ضمیر کچوکے لگا رہا تھا۔ اب مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ میں یگانہ سے سامنا ہونے پر
اُس سے نظریں ملا سکوں۔ اُس نے میرے ساتھ نیکی کی، لیکن میں خیانت کا مرتکب ہوا۔

میں فلیٹ سے نکل کر بس سٹاپ کی طرف جا رہا تھا کہ مخالف سمت سے مجھے یگانہ کی
گاڑی آتی دکھائی دی۔ میں نے کترا کر نکل جانا چاہا۔ اُس نے مجھے دیکھ لیا۔ گاڑی لا کر
میرے پاس روک لی۔ اُس نے پوچھا۔ ''مسٹر سالار! آپ کہاں جا رہے ہیں؟''

"اپنی تلاش میں جا رہا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔ "کیا آپ لاہور نہیں گئے......؟ آپ کہاں سے آ رہے ہیں؟"

"میں لاہور اس لئے نہیں جا سکا کہ میری فلائٹ صبح تک روانہ نہیں ہو سکی۔" اُس نے گاڑی کا دروازہ کھول دیا۔ "میں اپنے دفتر سے آ رہا ہوں۔ اچھا ہوا آپ مل گئے...... مجھے آپ سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔ آیئے بیٹھ جائیں۔"

میں گاڑی میں بیٹھ گیا۔ گاڑی چل پڑی۔ میں سوچنے لگا کہ اچھا ہی ہوا میں فلیٹ میں رُکا نہیں...... یگانہ آ کر جب دیکھتا کہ اُس کی بیوی مجھ پر مہربان ہو رہی ہے اور ہم دونوں غلاظت کی دلدل میں دھنسے ہوئے ہیں تو شوٹ کر دیتا۔ ہم دونوں رنگے ہاتھوں دھر لئے جاتے۔ میں اُسے منہ دکھانے کے قابل نہیں رہتا۔

یگانہ مجھے اپنے ہمراہ لے کر ایک فائیو سٹار ہوٹل کے ہال میں پہنچا۔ اس وقت وہ تقریباً خالی پڑا تھا۔ صرف دو ایک میزوں پر جوڑے بیٹھے تھے۔ ہم دونوں ایک ایسی میز پر جا بیٹھے جس کے آس پاس، آگے اور پیچھے کی تمام میزیں خالی پڑی تھیں۔ اُس نے ویٹر کو آرڈر دینے کے بعد کہا۔ "مسٹر سالار! مجھے آپ سے ایک التجا اور درخواست کرنی ہے۔ اُمید ہے کہ نامنظور نہیں کریں گے۔"

"میری کیا مجال کہ میں آپ کی بات نہ مانوں...... آپ میرے محسن ہیں۔" میں نے کہا۔ "آپ حکم کریں۔"

"آپ نے اُس روز بدمعاشوں سے میری جان اور رقم بچا کر مجھ پر احسان کیا۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ مجھ پر ایک احسان اور کریں۔"

"آپ کو جو کام ہے وہ بتائیں...... لیکن اسے احسان کا نام نہ دیں۔" میں نے کہا۔

"میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ رخشندہ کے بچے کے باپ بن جائیں......" یگانہ نے کہا۔ "اس لئے کہ میں باپ نہیں بن سکتا...... دو برس سے میں عورت کے قابل نہیں رہا...... کیا کیا علاج نہیں کرایا......؟ آپ مجھے خاندان کا وارث دے دیں۔"

میں بھونچکا سا ہو گیا۔ چند لمحوں کے لئے مجھ پر سکتہ سا طاری ہو گیا۔ "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ کہیں ایسا ہوا ہے؟ ایسا ہو سکتا ہے؟"

"رخشندہ یہ چاہتی ہے کہ اُس کی گود بھر جائے...... بس...... اُسے کچھ اور نہیں چاہئے۔

میں بھی یہی چاہتا ہوں۔ اُسے کھونا نہیں چاہتا ہوں۔ میرے فلیٹ میں آپ دونوں میاں بیوی کی طرح رہیں جب تک وہ ماں نہیں بن جاتی۔"

میں اُس کی بات سن کر ششدر رہ گیا...... کیا دنیا میں ایسے بھی لوگ موجود ہیں جو ایک بچے کے حصول کے لئے اتنی دُور جا سکتے ہیں؟ کیا یہ بے غیرتی نہیں ہے؟ گھناؤنا فعل نہیں ہے؟ انتہائی نیچ اور گھٹیا حرکت نہیں ہے؟ ایک ایسی قبیح بات جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا...... حیرت اور دُکھ کی بات یہ تھی کہ ایک مہذب، شائستہ اور تعلیم یافتہ شخص مجھ سے یہ بات کہہ رہا تھا۔

دوسری طرف ایک پل بھی میں سوچے بغیر نہیں رہ سکا کہ...... آخر اس میں حرج ہی کیا ہے؟ رات کا فسوں، رخشندہ کا اُبلتا شباب اور اُس کے جسم کے دل کش نشیب و فراز اور جوانی میرے اعصاب پر چھانے اور نظروں کے سامنے لہرانے لگے۔ اس لمحے میرے ذہن پر پرانی شراب کا خمار چھایا ہوا تھا جو اُترتا نہیں ہے۔ میں ایک لمبے عرصے تک اُس کے ساتھ ایک غیر قانونی شوہر کی طرح رہ سکتا تھا۔ جوانی کا سفر جاری رہتا۔ ایک عورت میرے ہاتھ کھلونا بنی رہتی۔ پھر مجھے شیطان بہکانے اور ورغلانے لگا۔ تم اس کی پیشکش قبول کر لو...... ایسا سنہری موقع، ایسی حسین جوان اور پُر شباب عورت تمہیں ساری زندگی نہیں مل سکتی۔ بے وقوف آدمی! اس موقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دینا۔ ورنہ ساری زندگی افسوس اور پچھتاوا رہے گا۔

"آپ کیا سوچ رہے ہیں مسٹر سالار!" یگانہ نے مجھے سوچ میں ڈوبا ہوا پا کر پوچھا۔

"میں یہ سوچ رہا ہوں کہ یہ کس قدر معیوب اور گری ہوئی سی بات ہے۔" میں نے بڑی صاف بیانی سے کام لیا۔ "آپ ایک ناجائز بچے کے باپ بننا چاہتے ہیں...... اسے لاوارث بنانا چاہتے ہیں...... ساری دنیا کی آنکھوں میں دُھول جھونکنا چاہتے ہیں۔ اس طرح آپ کی نسل کیسے بڑھے گی؟ اس کی رگوں میں تو میرا خون ہو گا۔ کیا یہ امر کرب کی اذیت کا باعث نہیں ہو گا کہ میرا خون آپ کے گھر میں پل رہا ہے......؟ کیا ساری زندگی ایک پھانس آپ کے سینے میں گڑی نہیں رہے گی......؟ آپ نے اس پہلو پر بھی سوچا ہے...... آپ محض ایک خوبصورت عورت کے قرب کے لئے اتنی بڑی قربانی دینا چاہتے ہیں...... دراصل آپ کو اس سے نہیں بلکہ اس کی جوانی اور حسن سے محبت ہے۔"

میں جذباتی سا ہو گیا۔ یگانہ بہت خاموشی اور تحمل سے میری بات سنتا رہا۔ میں خاموش
ہوا تو اُس نے کہا۔ ''یہ ساری باتیں میرا مسئلہ ہے۔ یہ کیا ہے، کیا نہیں ہے میں جا
ہوں۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ میری یہ التجا منظور کر لیں۔''

''آپ نے یہ بھی سوچا ہے کہ آپ کی بیوی اس بات کو پسند کرے گی؟'' میں نے کہا۔

''میں آپ سے کوئی بات نہیں چھپاؤں گا'' یگانہ کہنے لگا۔ ''رخشندہ نے اپنی زند
میں بڑے دُکھ اور مصیبتیں اُٹھائی ہیں۔ میں نے اُس کے حسن و شباب سے متاثر ہو کر ا
سے شادی کر لی۔ میں نے شادی کی پہلی رات ہی اُسے بتا دیا کہ میری جوانی اپنی آخر
منزل پر ہے۔ اس کے بدلے میں تمہیں دنیا کی تمام آسائشیں اور راحتیں دے سکتا ہوں
دو برس گزر جانے کے بعد اُس نے مجھ سے کہا کہ میں ماں بننا چاہتی ہوں۔ میں بچے
ماں بن جاؤں تو پھر مجھے کسی چیز کی خواہش اور تمنا نہیں رہے گی۔ میں اس بچے
سہارے اپنی ساری زندگی گزار لوں گی۔ اپنی جوانی اور جذبات کی آگ سرد کر دوں گی
کسی مرد کی طرف نہیں دیکھوں گی۔ سوال یہ تھا کہ کون ایسا شخص ہے جو اُسے ماں بنا سک
ہے...... یوں تو ایسے لوگوں کی کوئی کمی نہیں تھی جو رخشندہ کے ایک اشارے پر اُس س
تعلقات استوار کر لیں۔ لیکن میں اپنے خاندان اور ملنے جلنے والوں میں سے نہیں چاہتا تھ
کہ وہ باپ بن جائیں۔ مجھے ایک اجنبی اور شریف شخص کی تلاش تھی۔ آپ سے حادثات
طور پر ملاقات ہو گئی۔ میں آپ کو گھر لے آیا۔ مجھے آپ جیسے شخص کی تلاش تھی۔ مَی
دوسرے دن دانستہ گھر سے جلدی نکل گیا۔ میرا خیال تھا کہ تنہائی میں ایک جوان عورت ک
موجودگی آپ کو بہکا دے گی۔ لیکن آپ نے کوئی پیش قدمی نہیں کی۔ آپ زاہد بن
رہے۔ رخشندہ کا نامناسب لباس بھی آپ کے جذبات کو بے قابو نہیں کر سکا۔ اور پھر کل
شام رخشندہ نے ایک منصوبے کے تحت ایک کھیل کھیلا...... بے ہوشی کا...... لیکن آپ برف
کا تودہ بنے رہے۔ پھر میرے اور رخشندہ کے درمیان ایک بات طے پائی۔ رخشندہ نے
مجھ سے کہا کہ آپ آج کی رات اور کل کا دن کسی بہانے گھر سے باہر رہیں، میں سالار کو
کر لوں گی، اپنی مٹھی میں کر لوں گی۔ آپ کو تھوڑی دیر پہلے دیکھا تو مجھے لگا کہ رخشندہ اپنے
منصوبے میں ناکام رہی۔ اُس کا جادو آپ پر چل نہیں سکا۔ اس لئے میں آپ کو یہاں
لے آیا تا کہ آپ سے کھل کر بات کروں۔ آپ کو اعتماد میں لوں......''

میں نے ایک لمحے کے لئے سوچا کہ اس سے کہوں کہ یہ مٹی کا دیا ساری رات طوفانوں
کی زد میں رہا۔ رخشندہ نے مجھے غلاظت کے دلدل میں گرا دیا۔ اُس نے مجھے فتح کر لیا۔
میں اپنی نظروں میں گر گیا اور ذلیل ہو گیا ہوں۔ لیکن میں نے یہ کہنا مناسب نہیں سمجھا۔
اب یہ سب کچھ اسے گھر جانے پر رخشندہ کی زبانی معلوم ہو جائے گا۔

''آپ نے کیا سوچا...... کیا فیصلہ کیا......؟'' چند لمحوں کے بعد یگانہ نے سکوت توڑتے
ہوئے پوچھا۔

''میں شام کو گھر آ کر اپنے فیصلے سے مطلع کروں گا۔'' مَیں نے سوچوں کی دنیا سے نکل
کر جواب دیا۔

یگانہ نے میرے کہنے پر مجھے صدر کے علاقے جوہری بازار کے سامنے اُتار دیا۔ جب
اُس کی گاڑی آگے بڑھ گئی تو میں نے قریبی بُک سٹال سے وہ اخبار خریدا جس میں اپنا
اشتہار شائع کروایا تھا۔ قریب ہی ایک ہوٹل تھا۔ میں اس میں داخل ہو کر ایک خالی میز پر
بیٹھ گیا۔ چائے کا آرڈر دے کر اخبار میں اشتہار تلاش کرنے لگا۔ ایک اندرونی صفحے پر میرا
دیا ہوا اشتہار چھپا ہوا تھا۔

پھر مجھے چائے پیتے ہوئے یکلخت یگانہ کی پیشکش کا خیال آیا۔ اُس نے گاڑی میں مجھے
اُس وقت تک کے لئے ایک معقول رقم کی پیشکش بھی کی تھی جب تک رخشندہ اُمید سے
نہیں ہو جاتی۔ یگانہ چاہتا تھا کہ میں رخشندہ کے اُمید سے ہونے تک وہاں رہوں۔ اس کے
علاوہ اُس نے یہ بھی کہا تھا کہ میں چاہوں تو اُسے اپنے ہمراہ مری یا سوات لے جا کر ہنی مون
منا لوں۔ وہ سارے اخراجات برداشت کرنے کے لئے بھی تیار تھا۔ لیکن میں نے دل میں
فیصلہ کر لیا تھا کہ اب میں وہاں نہیں جاؤں گا۔ اور مجھے یگانہ کی گھناؤنی پیشکش منظور نہیں تھی۔

میں نے اخبار ہوٹل میں ہی چھوڑ دیا۔ پھر میں وہاں سے زیب النساء اسٹریٹ پر آ
گیا۔ پھر میں وہاں مٹر گشت کرنے لگا۔ میں نے سوچا تھا کہ میں یہاں سے طارق روڈ
جاؤں گا۔ شام تک اس علاقے میں بازار اور گلیوں کی خاک چھانتا رہوں گا، اپنے آپ کو
تلاش کروں گا۔ شاید یہاں کوئی میرا جاننے والا مل جائے۔ مجھے میرا گھر مل جائے۔ اب
ایک ہی علاقے میں دوبارہ گھومنا فضول تھا۔

میں ایمپریس مارکیٹ کے پاس ایک بس سٹاپ پر جا کر طارق روڈ جانے والی منی بس

میں سوار ہو کر طارق روڈ اُتر گیا۔ گو دن کا وقت تھا لیکن طارق روڈ پر زیب النساء اسٹر
سے کہیں زیادہ چہل پہل اور رونق تھی۔ میں ایک جیولری شاپ کے شوکیس کے سامنے کھ
ہو کر زیورات کے سیٹ دیکھنے لگا۔ اس دُکان کے اندر خواتین کا بہت رش تھا۔ وہ ا
طرح سے زیورات خرید رہی تھیں جیسے وہ سبزی ترکاری ہوں۔ اعلیٰ گھروں کی بیگمات کے
لئے ان کی حیثیت سبزی ترکاری ہی کی قیمت کے برابر تھی۔

میں جب شوکیس کے پاس سے ہٹا تو ایک جواں سال عورت کو دُکان سے باہر آ
ہوئے دیکھا۔ وہ ایک خوبرو عورت تھی۔ سڈول اور بھرے بھرے جسم کی عورت۔ جس کے
شاداب بدن میں بڑی دلکشی اور جاذبیت تھی۔ اُس کے گلے میں ہیروں کا ایک جڑ
نیکلس تھا جو اُس نے دُکان سے خرید کر پہن لیا تھا۔ اس نیکلس نے اس کے حسن میں
دوچند اضافہ کر دیا تھا۔ اس کے کندھے سے ایک قدرے بڑا سیاہ چرمی پرس لٹک رہا تھا
وہ اکیلی تھی اور مستانہ خرامی سے اپنی گاڑی کی طرف جانے لگی۔

اچانک میری نگاہ دو مردوں پر پڑی جو دیکھنے میں تو شریف آدمیوں کی طرح لگ
رہے تھے لیکن تھے وہ بدمعاش اور رہزن...... اُن کا کام راہ چلتی عورتوں سے پرس چھ
اور ریوالور کی زد میں بدن سے زیورات اُتارنا تھا۔ وہ موٹر سائیکل پر سوار تھا۔ اُنہوں نے
اُس عورت کا موٹر سائیکل ہی پر غیر محسوس انداز سے تعاقب شروع کر دیا۔ فٹ پاتھ پر بہ
رش تھا اور سڑک پر ٹریفک کسی سیلاب کی طرح بہہ رہا تھا اس لئے وہ پرس چھین کر بھاگ
نہیں سکتے تھے اور نہ اُس کے گلے سے نیکلس اُتار سکتے تھے۔ قریب ہی پولیس کی موبا
بھی موجود تھی۔ اس عورت کے ایک ہاتھ میں سونے کے دو جڑاؤ کڑے بھی تھے۔ ایک
ہیرے کی جڑاؤ انگوٹھی اور کانوں میں جو آویزے تھے ان میں بھی ہیرے جڑے ہوئے تھے
ان تمام زیورات کی مالیت کئی لاکھ روپے تھی۔ ان بدمعاشوں کے لئے یہ ایک تگڑا شکار تھا۔

اس عورت نے اپنی گاڑی ایک عقبی گلی میں پارک کی ہوئی تھی۔ اُس بازار کے
کنارے گاڑیوں کی قطار تھی۔ یہاں خریداری کے لئے اسّی فیصد گاڑی والے ہی آ
تھے اس لئے کسی گاڑی کو آسانی سے اور جلد پارکنگ کی جگہ نہیں ملتی تھی۔ وہ عورت جیسے
اُس گلی میں داخل ہوئی جس میں کوئی چہل پہل نہ تھی، اِکا دُکا راہگیر آ جا رہے تھے۔ چونکہ
اس گلی میں دُکانیں نہیں تھیں اور چند ایک گاڑیاں پارک تھیں اس لئے وہ ویران

سنسان پڑی تھی۔ اُن بدمعاشوں نے موٹر سائیکل اس کے آگے لے جا کر روک دی۔
کراچی میں اس قسم کے واقعات روزمرہ کا معمول تھے اس طرح کی پندرہ سے بیس
وارداتیں عام انداز سے ہوتی تھیں۔ اُس عورت کے پرس میں دو لاکھ کی رقم بھی رکھی ہوئی
تھی۔ پیچھے جو بدمعاش بیٹھا ہوا تھا وہ برق سرعت سے اُترا۔ دوسرا بدمعاش بھی اُتر گیا
لیکن اُس نے موٹر سائیکل کا انجن بند نہیں کیا۔ ان دونوں نے بڑی پھرتی سے جیب سے
خوفناک قسم کے ریوالور نکال لئے۔ پہلے بدمعاش نے اُس عورت کو ریوالور کی زد میں لے
لیا۔ دوسرے بدمعاش نے اپنا رُخ سڑک اور گاڑی کی طرف کر لیا تا کہ کسی نے مداخلت
کی تو اُسے ڈرا دھمکا سکے۔ پھر بھی اگر اُس نے بہادری دکھانے کی کوشش کی تو اُسے گولی کا
نشانہ بنانے میں ذرہ برابر بھی تامل نہ کرے۔

پہلے والے بدمعاش نے ریوالور کی نالی اُس عورت کے گلے کے نیچے رکھ دی۔ پھر
اس نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ ”جلدی سے سارے زیورات اُتار دو...... ورنہ تمہیں دوسری
دنیا میں پہنچا دوں گا...... چلو! جلدی کرو۔“

عورت خوفزدہ تو نہیں ہوئی البتہ گھبرا کر تیزی سے ایک قدم پیچھے ہٹی۔ ”نہیں...... میں
زیورات نہیں دوں گی۔“

بدمعاش، عورت کی طرف تیزی سے بڑھا تا کہ اُس کے گلے سے نیکلس کھینچ کر نکال
لے۔ میں نے ایک پتھر اُٹھا کر پیچھے چھپا لیا تھا۔ میں فوراً برق سرعت سے اُن کے
درمیان حائل ہو گیا۔ ”یار طاہر! یہ کیا حرکت ہے؟ مجھے تم سے ایسی اُمید نہیں تھی۔“

وہ میری زبان سے اپنا نام سن کر اُچھلا۔ دوسرے بدمعاش نے بھی میری طرف حیرت
اور خوف سے دیکھا تو میں نے اُس سے کہا۔ ”کہو بھائی انو! آج تم دونوں کو کیا سوجھی؟
بہت بری بات ہے کہ تم لوگ ایک عورت کو تنگ اور ہراساں کرو۔“

انو کی آنکھیں حیرانی سے پھیل گئیں۔ وہ مجھے آنکھیں پھاڑ کے تکنے لگا۔ ”کون ہو تم...؟“

”اپنے دوست کو بھول رہے ہو......؟“ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”بڑے افسوس کی
بات ہے۔“

”سامنے سے ہٹ جاؤ......“ طاہر غرایا۔ ”معلوم نہیں تم کون ہو...... کباب میں ہڈی
بن رہے ہو۔“

''میں تم دونوں کو جانتا ہوں، تم دونوں کو پرانا دوست ہوں۔ تم دونوں جلال آباد میں رہتے ہو۔ تمہارے والد کا نام راشد علی ہے اور انو کے والد کا نام شفاعت حسین...... کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟'' میں نے کہا۔

وہ دونوں بھونچکے ہو گئے۔ طاہر نے تحیر زدہ لہجے میں کہا۔ ''تم کون ہو؟ ہم تمہیں نہیں جانتے۔ ہمیں کیسے جانتے ہو؟''

''میں بتا چکا ہوں کہ میں کون ہوں...... پھر بھی تم پوچھ رہے ہو......؟ انجان مت بنو...... تم نے ایک گھنٹہ پہلے یہ موٹر سائیکل گلبرگ کے علاقے سے چھینی ہے۔ تم دونوں نے واٹر پمپ کے بس سٹاپ پر کھڑی ایک عورت کا پرس چھینا اور وہاں سے بھاگ نکلے۔ اس پرس میں تین سو بیس روپے تھے...... تم دونوں نے صدر میں بروف چکن کھایا اور ادھر نکلے۔''

ایک لمحے کے لئے اُن کے چہرے فق ہو گئے۔ اگلے لمحے انو نے کہا۔ ''طاہر! یہ سب کچھ جانتا ہے۔ اسے یہ سب کچھ کیسے معلوم ہوا......؟''

''معلوم نہیں......'' طاہر نے کندھے اچکائے۔ ''یہ تو بڑا خطرناک شخص ہے۔ لگتا ہے حصہ لینے کے لئے ہمارا تعاقب کرتا آ رہا ہے۔''

''اسے گولی مار دو......'' انو نے مشورہ دیا۔ ''جلدی کرو! وقت ضائع ہو رہا ہے۔''

''تم نے مجھے گولی ماری تو پھر تم دونوں پولیس والوں کے ہاتھوں سے بچ نہ سکو گے...... اُدھر ذیشان کھڑا سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ ذیشان تم دونوں کا سخت دشمن ہے۔ وہ تم دونوں کو گرفتار کرا دے گا۔ پھر تم دونوں جیل کی ہوا کھاؤ گے۔''

''کہاں ہے ذیشان؟'' طاہر نے کہا۔ وہ دونوں پریشان اور دہشت زدہ ہو کر چاروں طرف نظریں دوڑانے لگے۔

میں نے اس موقع سے فائدہ اُٹھایا اور پتھر طاہر کے ہاتھ پر دے مارا۔ طاہر کے ہاتھ سے ریوالور چھوٹ کر زمین پر آ رہا...... اس لمحے انو مجھ سے غافل تھا۔ میں نے اُس کی کمر پر ایک زوردار لات رسید کی تو وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ وہ منہ کے بل زمین پر آ رہا اور خاک چاٹنے لگا۔ اُس کے ہاتھ سے ریوالور چھوٹ کر اُس عورت کی گاڑی کے نیچے چلا گیا۔ پتھر کی چوٹ اتنی زوردار تھی کہ طاہر کے منہ سے دلخراش چیخ نکل گئی۔ تکلیف اُس

کے لئے ناقابل برداشت ہو گئی۔ بائیں ہاتھ سے اُس نے دایاں ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہا تھا۔ میں نے اُس کا ریوالور اُٹھانا چاہا تو اُس نے ریوالور کو ایک ٹھوکر لگائی۔ ریوالور سامنے کھڑی گاڑی کے نیچے چلا گیا۔ اسی اثناء میں انو اُٹھ کر کھڑا ہوا تو میں نے دیکھا اُس کی ناک سرخ ہو گئی ہے۔ ناک اور منہ سے خون بہہ رہا ہے۔ اُس کی پیشانی پر زخم آ گیا تھا۔

میں نے طاہر کو سنبھلنے کی مہلت اور خود پر قابو پانے کا موقع نہیں دیا۔ اگر میں اُس کے ہاتھ پر پتھر کھینچ کر نہیں مارتا تو وہ مجھے شوٹ کرنے میں تامل نہیں کرتا۔ میں نے اُس کا اور انو کا ذہن پڑھ کر بہت کچھ معلوم کر لیا تھا اس لئے وہ مجھے زندہ چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔ میں نے ذیشان کا نام لے کر اُنہیں اور ڈرا دیا تھا۔ ذیشان ان کے دشمنوں میں سے تھا۔ وہ بھی جرائم پیشہ تھا۔ میں نے فوراً ہی طاہر کا گریبان پکڑ کر اُس کے منہ پر ایک زوردار مُکا رسید کیا تو وہ لڑکھڑاتا ہوا پیچھے جو گاڑی تھی اُس کے بونٹ پر جا گرا۔

سڑک کے کنارے ایک ڈنڈا پڑا ہوا تھا۔ انو نے لپک کر اُسے اُٹھا لیا اور مجھ پر حملہ آور ہوا۔ جب اُس نے اپنی پوری طاقت سے مجھ پر ڈنڈا مارنے کی کوشش کی تو میں پھرتی سے ایک طرف ہٹ گیا۔ اگر میں پھرتی نہ دکھاتا تو میری کھوپڑی کے دو ٹکڑے ہو جاتے۔ ڈنڈا زمین پر لگا۔ میں نے فوراً ہی اُسے دبوچ لیا۔ دوسری طرف طاہر جو سنبھل گیا تھا وہ عورت کی طرف بڑھا۔ میں نے انو کی گردن پر کراٹے کا ایک ہاتھ رسید کیا۔ اُسے قریب والی گاڑی کے پاس لے جا کر اُس کے بالوں کو پکڑ کر بونٹ پر اُس کا منہ دے مارا۔ پھر اُسے چھوڑ کر طاہر کی طرف لپکا جو اُس عورت کو دبوچ کر اُس کے گلے سے نیکلس نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اُس کی پشت پر جا کر اُس کی قمیض کا کالر پکڑا اور اُسے اپنی طرف کھینچ کر اُس کے جبڑے پر مُکا رسید کر دیا۔ وہ زمین پر آ رہا۔

انو نے اپنے ساتھی کا جو حشر نشر دیکھا تو اُس کی سٹی گم ہو گئی۔ وہ دہشت زدہ ہو کر مخالف سمت بھاگ نکلا۔ طاہر نے اُسے بگٹٹ بھاگتے ہوئے دیکھا تو وہ خود بھی اُس کے پیچھے پیچھے بھاگا۔ میں نے انہیں روکنے کی کوئی کوشش نہیں کی اور نہ ان کے ریوالور گاڑیوں کے نیچے سے نکالنے کی کوشش کی۔ ان کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ اُن دونوں نے پلٹ کر بھی نہیں دیکھا۔ وہاں جو کچھ لوگ جمع ہو کر تماشہ دیکھ رہے تھے اُن میں سے دو تین نوجوان

لڑکے اُن دونوں بدمعاشوں کو پکڑنے کے لئے اُن کے پیچھے بھاگے۔ طاہر اور انو دائیں
میں مُڑ کر نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ وہ سخت حیران اور دہشت زدہ بھی تھے۔

ان دونوں بدمعاشوں کو فرار ہوتے دیکھ کر عورت نے سکون و اطمینان کا سانس لیا
اُس کا چہرہ دمک اُٹھا۔ وہ میرے پاس آ کر ممنونیت سے بولی۔ ''آپ کا بہت بہت
شکریہ...... آپ نے مجھے ان بدمعاشوں کے ہاتھوں سے لٹنے سے بچا لیا۔''

''آپ یہاں سے فوراً ہی نو دو گیارہ ہونے کی کوشش کریں۔ یہاں رُکنا خطرناک
ہے۔'' میں نے سرگوشی میں کہا۔

''وہ کس لئے؟'' عورت کے چہرے پر استعجاب چھا گیا۔ اُس نے اپنی پلکیں
جھپکائیں۔ ''بدمعاش تو بھاگ گئے۔''

''اس لئے کہ وہ پولیس موبائل وین کو لے کر اس طرف آنے والے ہیں تاکہ
دونوں کو حدود آرڈیننس کیس میں پھنسا دیں اور اس بہانے آپ کے زیورات اور پرس
میں جو رقم ہے اسے ہتھیا لیں۔'' میں نے کہا۔

''کیا......؟'' عورت کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔ ''یہ کیونکر ہو سکتا ہے؟ اتنا بڑا
الزام...... جبکہ ہم دونوں ایک دوسرے کو جانتے بھی نہیں ہیں...... اُن کی کیا مجال کہ وہ
ہمیں اس کیس میں پھنسا دیں؟''

''جذباتی مت ہوں...... عقل سے کام لیں۔ پولیس سے کوئی جیت سکتا ہے؟ پورے
ملک پر پولیس کا راج ہے۔ وہ جو چاہیں کر سکتے ہیں۔ وہ سیاہ و سفید کے مالک ہیں۔ ان
کے آگے تو عدلیہ بھی بے بس ہو کر رہ جاتی ہے۔ کالی بھیڑیں جو ہوتی ہیں وہ بے گناہوں کو
تنگ اور ہراساں کرتی ہیں۔ انہیں دونوں ہاتھوں سے لوٹتی ہیں۔ پلیز! آپ بحث و تکرار
میں وقت ضائع نہ کریں۔''

''کیا آپ میرے ساتھ چلنا پسند کریں گے......؟'' وہ پریشان سی ہو کر بولی۔ ''میں
بعد میں آپ کو جہاں کہیں ڈراپ کر دوں گی۔''

''چلئے......'' میں نے فوراً حامی بھر لی اور اُس کے ساتھ گاڑی کی طرف بڑھا۔

جب وہ گاڑی لے کر سڑک پر آئی تو اُس کے چہرے پر اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔ پھر
اُس نے کچھ دُور جانے کے بعد مجھ سے پوچھا۔ ''یہ آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ موبائل آئے

گی اور ہم دونوں کو حدود آرڈیننس کیس میں پھنسا دے گی؟''

''میں ان پولیس والوں کو جانتا ہوں جو اس موبائل میں موجود ہیں۔'' میں نے کہا۔
''یہ جرائم پیشہ بدمعاشوں کی سرپرستی کرتے ہیں۔ ان بدمعاشوں کی آمدن میں ان کا
نصف حصہ ہوتا ہے۔ جب یہ بدمعاش کسی وجہ سے اپنے کسی کام میں ناکام ہو جاتے ہیں تو
پھر وہ ان کے شکار کو کسی نہ کسی الزام میں پھنسا کر انہیں بلیک میل کرتے ہیں، ان سے موٹی
رقمیں وصول کرتے ہیں۔

''کیا وہ دونوں بدمعاش آپ کے دوستوں میں سے ہیں؟'' عورت نے میری طرف
ایک لحظہ کے لئے دیکھا۔

''جی نہیں......'' میں نے جواب دیا۔ ''میں اُنہیں جانتا تک نہیں۔ آج ہی اُنہیں پہلی
بار دیکھا ہے۔''

''لیکن آپ نے ان دونوں کا نام اور ان کے باپ کا نام اور ان کے محلے کے بارے
میں بتایا تھا۔'' وہ حیرت سے بولی۔

''اسے آپ ایک اتفاق سمجھیں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''یہ دونوں بدمعاش آپ کے
تعاقب میں دُکان تک آئے اور آپ کے باہر نکلنے کے انتظار میں راہداری کے ستون کے
پاس کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ اتفاق سے میں ان کے قریب کھڑا دُکان کا شوکیس دیکھ
رہا تھا۔ ان کے درمیان جو گفتگو ہوئی اس سے مجھے ان کے اور ان کے باپ کا نام اور محلے
کے بارے میں معلوم ہوا۔''

''لیکن یہ ذیشان کون شخص ہے جس کا نام سنتے ہی وہ دونوں یکبارگی گھبرا گئے اور
پریشان ہو گئے؟'' وہ بولی۔

''یہ تو میں نہیں جانتا کہ ذیشان کون ہے لیکن اُن کی باتوں سے ہی مجھے اُس کے
بارے میں معلوم ہوا کہ وہ بھی ایک چھٹا ہوا بدمعاش ہے۔ اُس سے ان کی دشمنی چل رہی
ہے۔ اس کے آدمیوں سے ان کا جھگڑا ہوتا رہتا ہے۔'' میں نے کہا۔

''آپ نہ صرف بہت تیز، ذہین اور ہوشیار شخص ہیں بلکہ بہت بہادر اور نڈر بھی ہیں۔
بیک وقت دو مسلح بدمعاشوں سے اپنی جان کی پرواہ نہ کر کے مقابلہ کرنا بڑی جرأت کی
بات ہے۔ آپ نے مجھے ان بدمعاشوں کے ہاتھوں سے لٹنے سے بچانے کے لئے بہت

بڑا خطرہ مول لیا۔ گھر چل کر میں آپ کی خدمت میں کچھ نذرانہ پیش کروں گی۔ آپ کا احسان کبھی نہ بھلا سکوں گی۔''

''میں نے کسی غرض یا صلے کے لئے آپ کو ان بدمعاشوں کے ہاتھوں لٹنے سے نہیں بچایا ہے۔ میں نے اپنا فرض ادا کیا ہے۔''

''آپ کی مصروفیت کیا ہے؟'' عورت نے موضوع بدلا۔ ''آپ طارق روڈ کس لئے آئے تھے؟ کیا شاپنگ کرنے؟''

''میری مصروفیت کچھ نہیں ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''میں یہاں ملازمت کی تلاش میں آیا ہوا تھا۔''

وہ عورت خاموش ہوگئی اور کچھ سوچنے لگی۔ وہ کیا سوچ رہی ہے یہ مجھ پر منکشف ہو رہا تھا۔ میں اُس کا ذہن پڑھ رہا تھا۔ یکبارگی میں نے سوچا کہ میں گاڑی رُکوا کر اُتر جاؤں اپنی راہ لوں۔ لیکن میں اپنے ارادے پر عمل نہ کر سکا۔ کسی خیال کے زیر اثر خاموش رہا۔ سوچا کہ دیکھوں حالات کا دھارا مجھے کہاں لے جاتا ہے؟ ویسے بھی مجھے اپنی رہائش کا کوئی نہ کوئی بندوبست کرنا تھا۔

اس عورت کا مکان اسی علاقے میں تھا۔ یہ پی ای سی ایچ ایس کہلاتا تھا۔ کراچی کا یک پرانا اور اعلیٰ قسم کا اقامتی علاقہ ہے۔ ایک زمانے میں یہاں لکھ پتی، کروڑ پتی، صنعت کار اور تاجر لوگ رہتے تھے۔ اس علاقے میں بھی بنگلوں اور کوٹھیوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔ لیکن کے ڈی اے اسکیم نمبر ایک، کلفٹن اور ڈیفنس کے اقامتی علاقوں نے اس کی اہمیت کم کر دی تھی۔ لیکن اس کے باوجود آج اور اب بھی یہ علاقہ دولت مندوں کا بسیرا ہے۔ اس کی قدر و قیمت میں کوئی کمی نہیں آئی ہے۔

اُس کی گاڑی ایک ہزار گز پر بنے ہوئے بنگلے کے گیٹ کے سامنے جا کر رُکی۔ اُس نے گاڑی کا ہارن بجایا تو چوکیدار نے گیٹ کھولا۔ اُس نے گاڑی اندر لا کر پارک کر دی۔ اس کے احاطے میں لان کے پاس دو اور گاڑیاں پارک تھیں۔ وہ مجھے نشست گاہ میں بٹھا کر اندر چلی گئی۔ میں نشست گاہ کی سج دھج دیکھنے لگا۔ اُس نے اس نشست گاہ کی تزئین و آرائش پر خوب خرچ کیا تھا۔

میں تپائی پر رکھا ہوا ایک انگریزی زبان کا ماہنامہ رسالہ اُٹھا کر اس کی ورق گردانی

کرنے لگا جو فیشن سے متعلق تھا۔ اسی شہر سے نکلتا تھا۔ اس رسالے میں ہائی سوسائٹی کے خاندانوں کی سماجی تقریبات کی تصویریں شائع ہوئی تھیں۔ دُلہنوں کی بھی تصویریں تھیں۔ ان تصویروں کو دیکھ کر مجھے ایسا لگا کہ یہ کسی یورپی شہر کے لوگوں کی تصویریں ہیں، لڑکیوں اور عورتوں کے آزادانہ لباس اور ان کے فیشن سے ایسا ہی لگ رہا تھا۔ یہ خاتون ہائی سوسائٹی سے تعلق رکھتی تھی۔

وہ تھوڑی دیر کے بعد آئی۔ اُس نے نہ صرف زیورات اُتار دیئے تھے بلکہ کپڑے بھی بدل لئے تھے۔ کالی ساڑھی اور اسی رنگ کے بغیر آستینوں والے بلاؤز میں ملبوس تھی جس نے اسے نمایاں اور پُرکشش بنا دیا تھا۔ وہ میرے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی۔ پھر وہ بولی۔ ''میں اپنا تعارف کرا دوں۔ میرا نام مس سلطانہ شاہد ہے۔ لیکن میں بیگم شاہد کے نام سے جانی جاتی ہوں۔ میرے ملنے والے اور دوست احباب اور میرے حلقے میں سب مجھے بیگم شاہد کہتے ہیں، میں اسی نام سے مشہور ہوں۔ آپ کا نام کیا ہے؟''

''میرا نام سالار ہے۔'' میں نے کہا۔ میں اپنا مزید تعارف اُس سے کیا کراتا جبکہ مجھے اپنا اصل نام تک معلوم نہ تھا۔

اسی لمحے دہلیز پر لہراتا ہوا پردہ ہٹا اور ایک خادمہ ٹرالی دھکیلتی ہوئی ہمارے پاس آئی۔ میری نگاہ اُس خادمہ پر پڑی۔ میں نے اُسے تنقیدی نظروں سے دیکھا۔ وہ بیس برس کی ہوگی۔ اُس کی رنگت گہری سانولی تھی لیکن خاصی جاذب نظر تھی۔ چہرے کے نقش و نگار بھی تیکھے سے تھے۔ بیگم شاہد نے خادمہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ میری ملازمہ ہے۔ اس کا نام شاداں ہے۔''

شاداں نے مجھے سر کے اشارے سے سلام کیا۔ بیگم شاہد نے اُس سے کہا۔ ''اب تم جاؤ!''

میں نے ٹرالی کی طرف دیکھا۔ اس کے سب سے اُوپر دو گلاسوں میں کوک تھی، ٹشو پیپر کا ڈبہ رکھا ہوا تھا۔ کوارٹر پلیٹیں تھیں۔ اس کے نیچے والے خانے میں ایک پلیٹ میں سینڈوچز اور دوسری میں پیسٹری اور تیسری میں پیٹیز اور چوتھی میں پنیر رکھا ہوا تھا۔ بیگم شاہد نے ایک کوارٹر پلیٹ اُٹھا کر میری طرف بڑھائی۔ میں نے اُس کے اصرار پر ایک پیسٹری، ایک سینڈوچ اور ایک پنیر کا ٹکڑا اپنی پلیٹ میں رکھ لیا۔ اُس نے صرف سینڈوچز لئے۔ پھر اُس نے سب سے نیچے پیالے میں رکھا ہوا کیچپ اُٹھایا اور میری پلیٹ میں دو چمچے ڈال دیئے۔

''آپ کہاں ٹھہرے ہوئے ہیں؟'' بیگم شاہد نے سینڈوچ حلق سے اُتارتے ہوئے پوچھا۔

''جی..... میں کہیں نہیں ٹھہرا ہوا ہوں۔ میں آج صبح ہی لاہور سے کراچی پہنچا ہوں۔'' میں نے جھوٹ بولا کیونکہ اس کے سوا چارہ نہیں تھا۔ ''میں طارق روڈ ایک دوست کی تلاش میں آیا ہوا تھا۔ وہ نہ ملا تو پھر کام تلاش کرنے لگا۔ اور آپ سے ملاقات ہوگئی۔''

''آپ کا سامان کہاں ہے..... کیا آپ بغیر سامان وغیرہ کے کراچی آ گئے؟'' وہ حیرت سے بولی۔

''میرا اٹیچی کیس اور بستر سفر کے دوران چوری ہو گیا۔ اب میرے پاس تن کے کپڑے کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔'' میں نے اُسے بتایا۔

''اوہ.....'' اُس نے افسوس کے اظہار کے انداز میں کہا۔ ''آپ کے ساتھ بہت برا ہوا۔ خیر کوئی بات نہیں۔ پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ مجھے ایک شخص کی ضرورت ہے۔ کیا آپ میرے ہاں ملازمت کرنا پسند کریں گے؟ میں تین ہزار روپے ماہانہ کے علاوہ طعام اور قیام کی سہولت بھی دُوں گی۔ آپ کو میرے ہاں دن رات رہنا ہوگا۔ ہفتے میں ایک دن اتوار کو صرف آدھے دن کی چھٹی ملے گی۔''

''مجھے منظور ہے۔'' میں نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے کیا کام کرنا ہوگا؟''

''میں ایک بزنس وومن ہوں۔'' بیگم شاہد نے کہا۔ ''امپورٹ ایکسپورٹ کا کام بھی کرتی ہوں۔ حسب ضرورت کام لیتی رہوں گی۔ تمہیں ہر وقت کسی بھی کام کے لئے تیار رہنا ہوگا۔'' وہ آپ سے تم کے تخاطب پر آ گئی۔

''آپ جو کام کہیں گی میں وہ کام کرنے کے لئے تیار ہوں۔ آپ کا بہت بہت شکریہ۔'' میں نے ممنونیت سے کہا۔

''تم یہ کھالو اور کوک پی لو۔ میں تمہیں گھر اور تمہارا کمرہ دکھائے دیتی ہوں۔'' اُس نے کہا۔

تھوڑی دیر کے بعد اُس نے مجھے گھر کا نچلا حصہ دکھایا۔ اس میں تین بیڈ رُومز، ٹی وی لاؤنج، کھانے کا کمرہ اور نشست گاہ وغیرہ تھی۔ اُس نے مجھے اپنا بیڈ رُوم بھی دکھایا۔ کچن بھی نیچے تھا اور خاصا بڑا تھا۔ کچن میں شاداں کام کر رہی تھی۔ اُس نے شاداں کو میرا نام بتایا اور کہا کہ میں یہاں رہوں گا اس نے مجھے ملازم رکھ لیا ہے۔ پھر وہ مجھے اُوپر لے گئی۔ اُوپر بھی اتنے ہی کمرے تھے۔ اُوپر ایک ٹیرس بھی تھا۔ پھر وہ مجھے ایک نہایت آراستہ

پیراستہ کمرے میں لے گئی۔ مجھ سے کہا۔ ''یہ تمہارا کمرہ ہے۔ ایئر کنڈیشنڈ ہے۔ تم رات میں اے سی چلا سکتے ہو۔ ہر کمرے میں انٹرکام بھی ہے، ٹیلی فون بھی ہے۔ لیکن تم ٹیلی فون ریسیو نہیں کرو گے۔''

اُس نے نیچے آنے کے بعد اپنے پرس میں نے ہزار ہزار کے پانچ نوٹ میری طرف بڑھائے۔ ''یہ لو.....!''

میں نے اُس کے ہاتھ سے نوٹ لیتے ہوئے انجان بن کر حیرت سے پوچھا۔ ''یہ کس لئے.....؟''

''تم ابھی اور اسی وقت بازار جا کر اپنے لئے تین چار ریڈی میڈ کپڑے، زیر جامے اور ایک چھوٹا سا سوٹ کیس خریدو۔ اس کے علاوہ دو ایک جوڑی جوتے بھی خرید لینا۔ یہ رقم الگ سے ہے۔ میں تنخواہ میں سے نہیں کاٹوں گی۔''

''آپ کا بہت بہت شکریہ۔'' میں نے ممنون نگاہوں سے اُسے دیکھا۔ ''میں ابھی جا کر کپڑے وغیرہ خرید کر لے آتا ہوں۔''

میں نے باہر آ کر بنگلے کا نمبر نوٹ کیا، پھر مین روڈ پر آ کر ایک رکشہ لیا اور طارق روڈ آ گیا۔

طارق روڈ پہنچ کر میں نے چار جوڑے کپڑے، موزے اور زیر جامے خریدے۔ نئے جوتے خریدے۔ جب میں گھر پہنچا تو شام ہو چکی تھی۔ شاداں، چوکیدار کی بیٹی تھی۔ اُس کی ماں نذیراں بھی ساتھ رہتی تھی۔ بیگم شاہد نے انہیں سرونٹ کوارٹر دے رکھا تھا۔ چونکہ نذیراں کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اس لئے وہ کام پر نہیں آئی تھی۔ ماں بیٹی مل کر سارے کام کاج کر لیتی تھیں۔ اُس کا باپ چوکیداری کے علاوہ بازار سے سودا سلف بھی لا دیا کرتا تھا۔ ان تینوں کے یہاں خوب مزے تھے۔ ایک طرح سے وہ عیش کر رہے تھے اور اُن کی پانچوں گھی میں تھیں۔

میں نشست گاہ میں داخل ہوا تو ٹھٹک کر رُک گیا۔ بڑے صوفے پر ایک عورت براجمان تھی۔ وہ بیگم شاہد سے سرگوشی کے انداز میں باتیں کر رہی تھی۔ اُس کی عمر تیس برس کے لگ بھگ ہوگی۔ وہ ایک قبول صورت عورت تھی۔ چونکہ وہ متناسب اور چھریرے بدن اور دراز قد تھی اس لئے بے حد پُرکشش دکھائی دے رہی تھی۔ اُس کی قامت نے اُس کے جسمانی نشیب و فراز کی دل کشی میں بے پناہ اضافہ کر دیا تھا۔ تنگ، چست اور بھڑکیلے

لباس وہ ایسی قیامت لگ رہی تھی کہ مرد کے جذبات بے قابو ہو جائیں۔ میں نے اُس کے ذہن سے اُس کا نام اور اُس کے بارے میں سب کچھ معلوم کر لیا تھا۔ وہ اور بیگم شاہد آپس میں گہری سہیلیاں تھیں۔

اُس کی نگاہ جیسے ہی مجھ پر پڑی وہ بری طرح چونکی اور مجھے تنقیدی نظروں سے دیکھنے لگی۔ چند ثانیوں کے بعد اُس نے بیگم شاہد کی طرف دیکھتے ہوئے سرگوشی میں آہستگی سے کہا۔ ''یار! تمہارا یہ ہیرو واقعی ہیرو ہے۔ تم نے کیا اس ہیرو کو......'' اتنا کہہ کر اُس نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ پھر وہ میری طرف تیکھی نظروں سے دیکھنے لگی۔

''آؤ سالار!'' بیگم شاہد نے میٹھے لہجے میں کہا۔ ''کیا تم نے خریداری کر لی؟ کوئی چیز رہ تو نہیں گئی؟ پیسے تو کم نہیں پڑ گئے؟''

میں نے اُن دونوں کے پاس پہنچ کر سوٹ کیس فرش پر رکھ دیا۔ بیگم شاہد کی سہیلی کو سلام کر کے بیگم شاہد کی طرف متوجہ ہوا۔ ''میں نے تقریباً ساری چیزیں خرید لی ہیں...... آپ نے جو رقم دی تھی اُس میں سے صرف ایک سو بیس روپے بچے ہیں۔''

''وہ تم رکھ لو۔ میں تمہیں کل ایک ماہ کی تنخواہ پیشگی دے دُوں گی۔ یہ میری سہیلی شہناز بٹ ہیں۔ ہم دونوں ایک جان دو قالب ہیں۔ یہ تم سے جس کام کے لئے بھی کہیں تم اسے اپنا کام سمجھ کر کرو گے۔ ایک طرح سے یہ بھی تمہاری باس ہیں۔'' بیگم شاہد نے کہا۔

میں نے اُسے اداب کیا، پھر کہا۔ ''آپ کا حکم سر آنکھوں پر...... میں انہیں کبھی شکایت کا کوئی موقع نہیں دُوں گا۔''

''سالار!'' بیگم شاہد نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ جب میں چھوٹے صوفے پر بیٹھ گیا تو وہ کہنے لگی۔ ''میں نے تمہیں جو ملازمت دی ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم میرے نوکر ہو گئے...... تم نوکر نہیں بلکہ ایک دوست کی طرح ہو۔ میرے پرائیویٹ سیکرٹری ہو۔ تم میرے محسن بھی ہو۔ تم نے اپنی جان پر کھیل کر مجھے لٹنے سے بچایا۔ تم بہادری، جرأت اور حاضر جوابی سے کام نہ لیتے تو میں دس لاکھ مالیت کے زیورات اور رقم سے ہاتھ دھو بیٹھتی۔ تم آج سے ہمارے دوست ہو، ہم تمہارے دوست ہیں۔ تم اپنے آپ کو نوکر نہ سمجھنا۔ او کے؟''

''آپ کی اس ذرّہ نوازی کا بہت بہت شکریہ۔'' میں نے گرمجوشی سے کہا۔ ''میں اپنے آپ کو دوستی کا اہل ثابت کرنے کی کوشش کروں گا۔ اور آپ کے اعتماد پر پورا اُترنے کی

کوشش کروں گا۔

''تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی سالار!'' شہناز بٹ اپنی جگہ سے اُٹھ کر میرے پاس آئی اور بڑی گرم جوشی سے ہاتھ ملایا۔

اُس کے ہاتھ کے لمس اور گرمی نے میرے بدن میں حرارت سی پیدا کر دی۔ میں بھی اُٹھ کھڑا ہوا۔ ہم دونوں نے بڑی گرم جوشی سے مصافحہ کیا تھا۔ بیگم شاہد نے مجھ سے کہا۔ ''سالار! تم کمرے میں جاؤ۔ کپڑے وغیرہ الماری میں رکھ دو۔ تیار ہو کر آؤ...... ہم باہر چل کر رات کا کھانا کھاتے ہیں...... شہناز بٹ کی طرف سے آج کی دعوت ہے۔''

مجھے تیار ہونے میں بیس منٹ لگ گئے۔ جب میں نیچے آیا تو وہ دونوں آپس میں کھسر پھسر کر رہی تھی۔ ہم شہناز کی گاڑی میں روانہ ہوئے۔ وہ دونوں اگلی نشست پر بیٹھی تھیں۔ میں پچھلی نشست پر بیٹھا باہر جھانک رہا تھا اور اُن کی باتوں سے بے نیاز تھا۔ مجھے اس لئے بھی کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ میں اُن کے دل و دماغ کی تمام باتیں اور سوچ ایک منٹ کے ہزارویں حصے میں معلوم کر سکتا تھا۔ شہناز بٹ بڑی تیز رفتاری سے گاڑی چلاتی ہوئی جا رہی تھی۔ وہ ڈیفنس جا رہی تھی جہاں ایک ہوٹل کا عمدہ قسم کا کڑاہی گوشت لوگوں کی مرغوب ترین ڈش تھا۔

اس ہوٹل کے باہر وسیع وعریض احاطے میں کوئی بیس، پچیس تخت ایک ترتیب اور سلیقے سے دو تین قطاروں میں موجود تھے۔ اُن پر قالین بچھے ہوئے تھے۔ اور دو تین گاؤ تکیے بھی رکھے ہوئے تھے۔ اس پر چار پانچ آدمیوں کے بیٹھنے کی گنجائش تھی۔ بہت سارے تخت بھرے ہوئے تھے۔ کچھ لوگ کھا رہے تھے اور کچھ آرڈر دینے کے بعد کھانے کے انتظار میں بیٹھے گپ شپ کر رہے تھے۔ ہوٹل کے باہر ایک کونے میں بکرے کی رانیں لٹکی ہوئی تھیں۔ دو تین آدمی گوشت تول تول کر انہیں بنانے میں مصروف تھے۔ ان کے قریب کوئی پندرہ بیس چولہے جل رہے تھے جن پر چھوٹی بڑی کڑاہیاں رکھی ہوئی تھیں۔ کوئی تین باورچی تھے جو بکرے کا کڑاہی گوشت بنانے میں مصروف تھے۔ دوسرے کونے میں صاف کی ہوئی مرغیاں لٹکی ہوئی تھیں۔ مرغی کڑاہی بھی بنائی جا رہی تھی۔ مرد اور عورتیں بھی کھانے والوں میں تھیں۔ اس ہوٹل کے ہال کے اندر جو میزیں اور کرسیاں تھیں، وہ بھی کھچا کھچ بھری ہوئی تھیں۔ اس ہوٹل پر اس قدر رش تھا کہ تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ ہوٹل کے باہر

گاڑیاں اتنی ساری تھیں کہ شہناز بٹ کو پارکنگ پر گاڑی پارک کرنے کی جگہ بمشکل ملی۔

ہم تینوں ہوٹل کے اندر داخل ہو گئے۔ اتفاق سے اُسی وقت ایک کونے والی میز خالی ہوئی تو شہناز بٹ نے فوراً ہی لپک کر اُس پر ڈیرا ڈال دیا۔ جب ویٹر آیا تو اُس نے ایک کلو بکرے کے گوشت کی کڑاہی کا آرڈر دیا۔ کوئی بیس منٹ کے بعد ہمارے آرڈر کی تعمیل ہوئی۔ واقعی اس کڑاہی گوشت کا جواب نہیں تھا۔ بہت ہی مزے دار، لذیذ اور ذائقہ دار تھا۔

وہ دونوں ہوٹل کی طرف جاتے ہوئے ہوٹل میں کھانے کے دوران اور واپسی پر مختلف موضوعات پر باتیں کرتی رہی تھیں۔ مجھے کوئی لفٹ نہیں دی تھی۔ کوئی بات نہیں کی تھی جیسے مجھ سے بات کرنے کے لئے اُن کے پاس کوئی موضوع نہیں تھا۔ میں ہوٹل میں بیٹھ اس کی رونق دیکھ رہا تھا۔ لوگ اس طرح ٹوٹے پڑ رہے تھے جیسے کئی دنوں کے بھوکے ہوں۔ کھانے کے دوران شہناز بٹ نے مجھ سے صرف یہ پوچھا کہ کڑاہی گوشت کیسا ہے؟ پسند آیا......؟ اور منگوایا جائے؟

کڑاہی گوشت کھانے کے بعد کلفٹن کے بیسن بورڈ آ کر وہاں ہم نے آئس کریم کھائی تھی۔ آئس کریم بڑی لاجواب اور مزے دار تھی۔ جب شہناز بٹ نے ہمیں گھر ڈراپ کیا اُس وقت رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ چوکیدار ہمارے انتظار میں برآمدے کے باہر بیٹھا ہوا تھا۔ شاداں نشست گاہ میں بیٹھی اونگھ رہی تھی۔

میں کپڑے بدل کر سونے کے لئے بستر پر دراز ہو گیا۔ مجھے سب سے پہلے یگانہ اور رخشندہ کا خیال آیا کہ وہ دونوں میرا بے تابی سے انتظار کر رہے ہوں گے۔ جیسے جیسے رات گزرتی جائے گی وہ میری آمد سے مایوس اور نا اُمید ہو جائیں گے۔ رخشندہ نے یگانہ کو سب کچھ بتا دیا ہوگا۔ دونوں میاں بیوی کو بہت افسوس اور دُکھ ہوا ہوگا کہ میں اُن کے ہاتھ سے نکل گیا۔ وہ دونوں اس بات پر حیران بھی ہوں گے کہ میں نے کیسی سنہری پیشکش ٹھکرا دی...... رخشندہ کے حسن و شباب کا جادو مجھ پر چل نہ سکا۔ میں کیسا بیوقوف ہوں، سنہری موقع اور نشاط انگیز لمحات کو کھو دیا۔ میری جگہ کوئی اور مرد ہوتا تو شاید اس سے محروم نہ ہوتا۔

پھر میں بیگم شاہد کے بارے میں سوچنے لگا۔ میری اس سے بھی اسی طرح حادثاتی ملاقات ہوئی تھی جس طرح یگانہ سے ہوئی تھی۔ یہ بھی ایک عجیب سا اتفاق ہوا تھا اور میں بادلِ نخواستہ بیگم شاہد کے ساتھ چلا آیا تھا۔ اُس کا ظاہر و باطن میرے سامنے تھا۔ میرے

ذہن نے اُس کے ذہن کو پوری طرح پڑھ لیا تھا۔ اسی طرح شہناز بٹ کے ذہن کو بھی....

شاداں کی ماں، اُس کے باپ اور شاداں سے بھی ہوشیار اور محتاط رہنے کی ضرورت تھی۔ وہ میرے دشمن بن گئے تھے۔ کیونکہ بیگم شاہد کا مجھے ملازم رکھ لینا اُنہیں گراں، ناگوار اور زہر لگا تھا۔ اُنہیں ایسا لگا تھا جیسے میں اُن کے راستے کا پتھر بن گیا ہوں۔ حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ اُن کی نیت میں فتور اور دل میں چور تھا اس لئے وہ میرا یہاں سے پتا کاٹنے کے بارے میں تدبیریں سوچتے رہتے تھے۔ میں نے یہ بات چوکیدار اور شاداں کے ذہن سے معلوم کر لی تھی۔ مجھے نہ تو اُن کی کوئی پرواہ تھی اور نہ اُن سے کوئی ڈر اور خوف تھا۔ سب سے زیادہ میرے خلاف نفرت شاداں کے دل میں تھی کیونکہ اُس کا ایک نوکر سے معاشقہ چل رہا تھا جو پڑوس کے بنگلے میں ملازم تھا۔ وہ رات کو اُس سے ملنے کے لئے اُوپر آ جاتا تھا۔ وہ دونوں اس خواب گاہ میں جو مجھے دی گئی تھی، راتوں کو چھپ کر ملتے تھے۔ شاداں کب کی اُس پر اپنا تن من نچھاور کر چکی تھی۔ اب میں اُن کے درمیان دیوار بن گیا تھا۔

بیگم شاہد اتنے بڑے گھر میں اکیلی رہتی تھی جبکہ اُسے ایسی خاص ضرورت نہ تھی۔ وہ ایک فلیٹ میں بھی رہ سکتی تھی۔ اُس نے دانستہ ایک وجہ سے اس بنگلے میں رہائش اختیار کی ہوئی تھی۔ وہ اس اقامت گاہ سے بہت سے فائدے اُٹھا رہی تھی۔ اُسے یہ بنگلہ اپنے شوہر سے ورثہ میں ملا تھا۔ وہ بہت ساری جائیداد اور دولت چھوڑ کر مرا تھا۔ یہ سب کچھ اُس کی حیثیت سے، اوقات سے بڑھ کر تھا۔ بیگم شاہد اپنی شادی سے پہلے ایک عام قسم کی زندگی گزار رہی تھی۔ وہ اپنے شوہر کے دفتر میں ایک اسٹینو گرافر تھی۔ چونکہ اُس میں اتنی جاذبیت اور اُس کا جسم ایسا بھڑکیلا تھا کہ وہ مردوں کے دلوں پر بجلی بن کر گرتا تھا۔ اور پھر وہ بھڑکیلے لباس پہن کر مردوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی تھی۔ جہاں دفتر کے بہت سارے مرد اُس پر ریشہ خطمی تھے، وہاں اُس کا باس بھی تھا۔ اُس کا باس تجرد کی زندگی گزار رہا تھا۔ اُس کے دفتر میں جو لڑکیاں بہت ہی معاشی مسائل سے دوچار تھیں اور اُن کی کمزوریوں سے فائدہ اُٹھا کر اپنا منہ کالا کرتا تھا۔ اس طرح ان لڑکیوں کی کچھ ضرورتیں پوری ہو جاتیں اور تنخواہ میں اضافہ ہو جاتا۔ یہ لڑکیاں اُس کے لئے ایک کھلونے کی طرح تھیں۔ جب اُس کا دل کرتا وہ کسی نہ کسی کھلونے سے دل بہلاتا۔ لڑکیاں اُس کے اشاروں پر ناچنے

کے لئے مجبور تھیں۔

اُس کے باس نے اُس سے محبت کا کھیل رچایا۔ وہ محبت کے فریب سے اُسے بستر زینت بنانا چاہتا تھا۔ باس نے من مانیاں بھی کی تھیں لیکن اُس نے کبھی باس کو حد تجاوز کرنے نہیں دیا۔ وہ اپنی خود سپردگی اور پُر جوش انداز سے اُس کی آتش شوق کو بھڑکا اور تڑپا رہی تھی، کیونکہ وہ ایک کائیاں لڑکی تھی اور اُس کی سوچ، خواب اور خیالا عام عورتوں سے مختلف تھے۔ وہ بہت اُونچا اُڑنا چاہتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ باس مشروط شادی کر لے۔ جبکہ باس شادی کا قائل نہ تھا۔ جب بازار میں دودھ میسر تھا اُسے شادی کی کیا ضرورت تھی؟ بیگم شاہد کی نظر باس کی دولت پر تھی۔

اُس کے سازشی ذہن نے ایک منصوبہ بنایا تاکہ باس اُس سے شادی کرنے پر مجبور جائے۔ اُس کے پاس چالیس ہزار کی رقم تھی جو اُس نے ماں کے زیورات فروخت کر بینک میں رکھی ہوئی تھی۔ باپ کا انتقال تو اُسی وقت ہو گیا تھا جب وہ بارہ برس کی تھی جب ماں کا انتقال ہوا، اُس کی عمر اکیس برس کی تھی۔ خالہ اور خالو نے اُسے رکھ لیا۔ اُن کوئی اولاد نہ تھی۔ پہلے تو اُس نے ایک سکول میں ملازمت کر لی لیکن وہ تنخواہ سے مطمئن تھی۔ کیونکہ اُسے اس تنخواہ میں ایک عام قسم کی زندگی بسر کرنا پڑ رہی تھی۔ وہ اپنے حسن شباب اور کشش کے خزانوں سے فائدہ اُٹھا کر ایک پُرتعیش زندگی گزارنا چاہتی تھی۔

باس کی پرائیویٹ سیکرٹری تابندہ بائیس برس کی بڑی طرح دار لڑکی تھی۔ ایک ر جب بیگم شاہد نے ایک اہم خط پر دستخط کروانے باس کے کمرے کا دروازہ کھولا تو ٹھٹک گئی۔ وہ دونوں دنیا اور مافیہا سے بے نیاز تھے اور باس اُس کے چہرے پر جھکا ہوا تھا اُس نے دروازہ بند کر دیا۔ یہ منظر اُس کے لئے نیا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ بھی ایک مر ایسا ہو چکا تھا۔ دفتر کی کچھ اور لڑکیاں بھی باس کے جذبات کا نشانہ بنتی تھیں۔ چونکہ وہ ا دنیا میں تنہا تھا اس لئے اُس کی زندگی تتلیوں کا محور بنی ہوئی تھی۔

بیگم شاہد نے ایک روز دفتر کی لڑکی ریشماں کو چھٹی کے وقت اپنے ساتھ لیا اور عز بھٹی پارک پہنچ گئی۔ ریشماں باس سے سخت پریشان اور نالاں تھی کیونکہ باس نے اُ شادی اور محبت کا فریب دے کر کہیں کا نہیں رکھا تھا۔ اُس نے ریشماں کی چھوٹی بہن دیکھ لیا تھا۔ اُسے ہراساں کر رہا تھا کہ اُس کی چھوٹی بہن نے خوش نہیں کیا تو وہ ا

ملازمت سے نکال دے گا۔ وہ غریب سخت پریشان تھی کیونکہ وہ گھر کی واحد فرد تھی جو کفالت کر رہی تھی۔ اُس کی دو چھوٹی بہنیں، ماں اور ایک چھوٹا بھائی تھا۔ یہ ملازمت چھوٹ جانے سے اُنہیں سخت مالی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا۔

اُس نے ریشماں کو اعتماد میں لے کر اپنا منصوبہ بتایا اور بیس ہزار روپے کی پیشکش کی۔ ریشماں نے حامی بھر لی۔ باس نے ایک فلیٹ کرائے پر لے کر اُسے عشرت کدہ بنایا ہوا تھا۔ اُس کی ڈپلی کیٹ چابی اتفاق سے ریشماں کے پاس موجود تھی۔ ریشماں نے باس سے کہا کہ وہ اپنی چھوٹی بہن کو لے کر فلیٹ پر پہنچ رہی ہے۔ باس جب فلیٹ پر پہنچا تو ریشماں کی چھوٹی بہن موجود نہ تھی۔ ریشماں نے باس سے کہا کہ اُسے اچانک تیز بخار ہو گیا ہے اس لئے وہ نہیں آسکی، اُسے کسی اور دن لے آئے گی۔ باس نے ریشماں کی بات کا یقین کر لیا اور اُسے ریشماں پر اکتفا کرنا پڑا۔ وہ جو پہلے سے اس فلیٹ میں چھپی ہوئی تھی اُس نے اُن کی ویڈیو بنا لی جو کہ بہت اچھی تو نہیں تھی لیکن اُس کا مقصد حاصل ہو گیا جو وہ چاہتی تھی۔

اُس نے پرنٹ بنا کر باس کی خدمت میں پیش کر دیا۔ اُس کے باس کی بڑی عزت و شہرت اس لئے پورے شہر میں تھی کہ اُس کا باپ بہت بڑی شخصیت کا مالک تھا۔ باس کی بھی عزت اس لئے تھی کہ وہ ایک سماجی کارکن بھی تھا۔ دو ایک خواتین کے اداروں کی سرپرستی بھی کرتا تھا۔ حکومت کے اعلیٰ سرکاری حلقوں میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ جہاں اُس کے دوست تھے وہاں دشمن بھی تھے۔ ایک مشہور و معروف روزنامے کے مالک و مدیر سے اُس کی برسوں سے چپقلش چلی آ رہی تھی۔ اخبار اُس کی فرم کی پروڈکٹس کے بارے میں ہرزہ سرائی کرتا رہتا تھا۔ ویڈیو فلم اُس اخبار کے ہاتھ لگنے سے اُس کی عزت و شہرت داغ دار ہو جاتی اور وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہتا۔ اس لئے باس نے اُس سے شادی کر لی۔

اُس نے شادی کے بعد اپنے شوہر کو اس طرح سیدھا رکھا کہ وہ صرف اُسی کا ہو کر رہ گیا۔ وہ ویڈیو فلم اُس نے اپنے لاکرز میں حفاظت سے رکھ دی تھی۔ دو برس کی ازدواجی زندگی بڑی پُرمسرت اور خواب ناک گزری۔ ایک روز اچانک اُس کے علم میں یہ بات آئی کہ اُس کے شوہر نے ایک شادی شدہ ٹی وی کی اداکارہ سے تعلقات استوار کر رکھے

ہیں۔ کلفٹن کے ایک فلیٹ میں وہ دونوں چھپ کر ملتے ہیں۔ ایک روز اُس کے شوہر ا
اداکارہ کی لاشیں اُس فلیٹ کے بیڈرُوم میں خون میں لت پت پائی گئی۔ اُن کے قتل ۔
الزام میں اداکارہ کا شوہر دھر لیا گیا۔ اس پستول پر جس سے اس کے شوہر کو قتل کیا گیا
شوہر کی اُنگلیوں کے نشانات پائے گئے۔ لیکن بیگم شاہد کو اتنا کچھ مل گیا جس کی اُسے تو
تھی۔ ایک بنگلہ، دو گاڑیاں اور تین لاکھ روپے کا بینک بیلنس اُسے مل سکا، کیونکہ فرم
کاروبار ٹھپ ہو گیا تھا اور وہ بینک کی مقروض ہو گئی تھی۔ پھر اثاثے فروخت کرنا پڑے
اُسے جو کچھ بھی ملا وہ اُس کے لئے بہت کچھ تھا۔ پھر وہ دولت کے لئے تدبیریں سوچنے لگی

بیگم شاہد کی زندگی کے بارے میں اُس کے ذہن نے مجھے بتایا تھا۔ میں یہ سب
سوچتے ہوئے سونے کی کوشش کر رہا تھا کہ مجھے پیروں کی چاپ سنائی دی۔ میں نے محسوس
کیا کہ کوئی چھت پر جا رہا ہے۔ میرے کمرے میں اندھیرا تھا۔ میں نے دروازہ کھول
باہر جھانکا، مجھے اندھیرے میں شاداں سیڑھیاں چڑھتی ہوئی دکھائی دی۔ زینے
اندھیرا تھا۔ چند لمحوں کے بعد میں بھی تجسّس کے زیر اثر چھت کے زینے کی طرف بڑھا
چھت پر دو کمرے بنے ہوئے تھے۔ ایک کمرے کا دروازہ بند تھا۔ جس کمرے کا درواز
کھلا ہوا تھا اُس میں گھپ اندھیرا تھا۔ ایک مرد کی آواز سنائی دی۔ وہ تلخ لہجے میں کہہ
تھا۔ ''یہ کون مردود ہے؟''

''اُس مردود نے بیگم صاحبہ کو طارق روڈ پر اپنی جان پر کھیل کر لٹنے سے بچایا تھا۔ بیگم
صاحبہ اس کا شکریہ ادا کرنے اور اس کی خاطر مدارات کے لئے گھر لے کر آئی تھیں۔ جب
یہاں آ کر انہیں معلوم ہوا کہ یہ مردود لاہور سے ملازمت کی تلاش میں آیا ہوا ہے تو ا
ملازم رکھ لیا۔ سیکرٹری بنا لیا۔ اور پھر اسے پانچ ہزار روپے بھی دیئے کہ وہ کپڑے، جو
خرید کر لائے۔''

''اس خبیث کو سب سے اچھا کمرہ رہائش کے لئے دے دیا گیا۔'' مرد نے جل بھن
کر کہا۔ ''اب ہم راتیں کہاں اور کیسے گزاریں گے؟''

''میں کل ہی اس کمرے کو ٹھیک کر دُوں گی۔'' شاداں کہنے لگی۔ ''یہ کمرہ کیا برا
ڈبل بیڈ ہے، اٹیچ باتھ بھی ہے۔ اس میں اے سی بھی لگا ہوا ہے۔ چادر، بیڈ شیٹ اور
بھی لے آؤں گی۔ کل قالین اور بستر کی بھی صفائی کر دُوں گی۔''

''وہ بہت خوبصورت اور ہیرو جیسا ہے۔'' مرد نے کہا۔ ''مجھے ڈر لگتا ہے کہ تو اُس پر مر
مٹے گی۔''

''وہ جیسا بھی ہے میری بلا ہے...... میں تمہاری ہوں۔ وہ تمہارے سامنے کچھ نہیں
ہے۔'' شاداں نے کہا۔ ''تمہیں ایسا ہی خوف و خطرہ ہے تو مجھ سے شادی کیوں نہیں کر
لیتے ہو...... کل ہی میرا رشتہ مانگ لو!''

''جہاں تم نے اتنے دن صبر کیا، کچھ دن اور صبر کر لو!'' اُس نے کہا۔ ''میں گاؤں کا
یک چکر لگا آؤں۔''

''تم یہ بات ایک سال سے کہہ رہے ہو۔ تین ماہ پہلے گاؤں جا کر آئے، پھر بھی تم نے
برا رشتہ نہیں مانگا۔''

''بات یہ ہے کہ میرے پاس شادی کے لئے رقم جمع نہیں ہو پا رہی۔ میں گاؤں گیا تو
ہن کی شادی پر خرچ کر آیا...... اب چونکہ کسی کی شادی نہیں کرنی ہے، اپنی شادی کرنی ہے
ں لئے اب رقم جمع ہو جائے گی۔''

''تم ایک سال سے مجھ سے یہی بات کہتے چلے آ رہے ہو کہ رقم جمع نہیں ہو پا رہی ہے
ر مجھ سے کھیل رہے ہو...... میں صرف اسی بات پر اپنا سب کچھ تم پر نچھاور کر رہی ہوں
لہ تم مجھ سے شادی کر لو۔ ایسا لگتا ہے کہ تم مجھ سے شادی نہیں کرو گے۔'' وہ تلخی سے بولی۔

''جب تک رقم نہ ہو شادی کرنے سے کیا حاصل......؟ میں یہ چاہتا ہوں کہ شادی کر
کے ہنی مون کے لئے تمہیں مری لے جاؤں۔ ہم دو ایک مہینے مری اور سوات کی سیر و
تفریح کریں، ہوٹلوں میں ٹھہریں، اچھے اچھے اور مزیدار کھانے کھائیں، پہاڑوں پر
ھیں، دنیا کے سارے مزے لے لیں۔ کیونکہ شادی کے بعد بچے پیدا ہو جانے کے
ر پھر ایک دن بھی سیر و تفریح کے لئے نہیں ملے گا۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ ایک بڑی
جمع ہو جائے۔ اس لئے تم سے کچھ دن صبر کرنے کے لئے کہہ رہا ہوں۔''

''تم مجھے پھر سبز باغ دکھا رہے ہو......؟'' شاداں اُس کے بازوؤں میں کسمساتی ہوئی
ں۔ ''ایک سال سے اس گھر میں ہنی مون منا رہے ہو...... مری اور سوات میں ہنی مون
ے لئے ایک بڑی رقم چاہئے۔ اتنے سارے اخراجات کے لئے دس بارہ سو روپے نہیں
بیس پچیس ہزار روپے چاہئیں۔ تمہاری تنخواہ تین ہزار ہے جس میں سے تم دو ڈھائی

ہزار روپے گھر بھیج دیتے ہو۔ مجھے بیوقوف مت بناؤ۔ میں کوئی بچی نہیں ہوں۔ اصل با
یہ ہے کہ تم مجھے بیوقوف بنا کر مفت میں مزے لوٹ رہے ہو۔''

''اگر تم میری بات مانو اور میرا ساتھ دو تو صرف ایک دن میں لاکھوں کی رقم آ
ہے۔'' مرد نے کہا۔

''وہ کیسے.....؟'' شاداں نے چونک کر حیرت سے پوچھا۔ ''میں تمہارا ساتھ کیسے د
سکتی ہوں؟''

''میری بات ذرا غور، توجہ اور دھیان سے سنو!'' اُس نے شاداں کو بڑے پیار
سہلاتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں یہ پتہ چلانا ہے کہ بیگم صاحبہ اپنی رقم کہاں رکھتی ہیں۔
چھت کا دروازہ کھلا رکھو گی۔ میں، منہ پر ڈھاٹا باندھ کر اور ایک ریوالور لے کر بیگم صا
کے بیڈ روم میں داخل ہو جاؤں گا، اُنہیں سوتے میں بے ہوش کر دوں گا۔ اگر وہ جاگ ر
ہوں تو ریوالور کے زور پر بے ہوش کر دوں گا۔ پھر اُن کی ساری رقم اور زیورات لے کر
جاؤں گا۔ پھر کچھ دنوں کے بعد تم سے شادی کر کے تمہیں ہنی مون کے لئے لے جاؤں گا

''منصوبہ تو تمہارا بہت اچھا اور شاندار ہے۔'' شاداں خوش ہو کر کہنے لگی۔ ''بیگم صا
اپنی الماری کی تجوری میں رقم اور زیورات رکھتی ہیں۔ اس میں لاکھوں کے زیورات ا
لاکھوں کی رقم موجود ہے۔ وہ سب پندرہ بیس لاکھ روپے سے کیا کم ہوں گے.....؟ لیک
ظریف! میں اس بات سے ڈر رہی ہوں کہ میرے بابا کی شامت نہ آ جائے۔''

''تیرے بابا کی شامت نہیں بلکہ اُس ملازم کی شامت آ جائے گی۔'' اُس نے کہا

''بیگم صاحبہ اُس پر شک کریں گے۔''

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو.....'' شاداں تائیدی لہجے میں بولی۔ ''پھر تم کب اور کس د
ڈاکہ مارو گے؟''

''دس بارہ دن کے بعد.....'' اُس نے کہا۔ ''کاش! یہ خیال پہلے آ جاتا تو اب تک
میرے ایک بچے کی ماں بھی بن چکی ہوتیں۔''

''دس بارہ دن کے بعد کس لئے...؟ کیوں...؟'' شاداں نے سرخ ہوتے ہوئے کہا۔

''اس لئے کہ مجھے ایک ریوالور اور کلوروفارم کا انتظام بھی تو کرنا ہے۔ اس میں د
بارہ دن تو لگ جائیں گے۔'' اُس نے کہا۔ ''تم نے یہ تو بتایا نہیں کہ اس الماری کی چابیا

بیگم صاحبہ کہاں رکھتی ہیں؟ اس کا معلوم ہونا بھی بہت ضروری ہے۔''

''وہ الماری کے اندر کی چابیاں تو الماری میں ہی رکھتی ہیں لیکن الماری کھولنے والی
ایک چابی جو ہوتی ہے، وہ سنگھار میز میں کولڈ کریم کی ایک خالی شیشی میں رکھتی ہیں۔ سنگھار
میز کی وہ دراز مقفل کر کے جاتی ہیں جس میں وہ شیشی رکھتی ہیں۔''

''تم نے تو بہت کچھ دیکھ اور معلوم کر رکھا ہے بیوقوف! تم نے مجھے یہ سب کچھ پہلے
کیوں نہیں بتایا؟''

''تم نے مجھ سے پوچھا کب.....تم رات جب بھی ملنے کے لئے آتے ہو تو تمہیں
صرف اپنی غرض ہوتی ہے۔ محبت بھری باتیں کرنے کی فرصت تک نہیں ہوتی۔ تم اپنی غرض
پوری کر کے چلے جاتے ہو۔ تم بہت خود غرض ہو۔'' وہ رُوٹھے ہوئے لہجے میں بولی۔

''میری جان! مجھے تم سے جتنی محبت ہے اتنی مجھے میرے گھر والوں سے بھی نہیں ہے۔
میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں۔ آئی لو یو سویٹ ہنی! اصل میں مجھے ہمیشہ تمہاری عزت کی
فکر رہی اور ہے۔ میں اس بات سے ڈرتا ہوں کہ کسی دن تمہارے ماں باپ نے تمہیں
کمرے میں نہ پایا تو ہم دونوں کی شامت آ جائے گی۔ میں تمہارے باپ کو جانتا ہوں۔
وہ بڑا سخت اور خرانٹ مزاج کا ہے۔''

پھر میں اپنے کمرے میں چلا آیا۔ کیونکہ اُس کمرے میں وہ دونوں اپنی رات کالی کر
رہے تھے۔ پڑوس کے بنگلے کی چھت اور اس بنگلے کی چھت میں چند فٹ کا فاصلہ تھا۔
ظریف اپنے بنگلے کی چھت سے اس چھت پر درمیانی دیوار کے منڈیر سے چلا آتا تھا۔
میری نیند اُڑی ہوئی تھی۔ میں شاداں کے بارے میں سوچنے لگا۔ وہ گھپ اندھیرے میں
تھی۔ ظریف اُسے بیوقوف بنا رہا تھا۔ میں اُسے روشنی میں لانا چاہتا تھا۔ اُس نے میرے
خلاف اپنے ماں باپ کو بہکایا ہوا تھا۔ وہ تینوں مل کر میرے خلاف نفرت انگیز تدبیریں
سوچ رہے تھے۔ میں کچھ دیر کے بعد اس خیال سے چھت پر چلا گیا کہ شاداں کی نظروں
میں ظریف کو ذلیل کر سکوں اور اُس کا اصل چہرہ شاداں کو دکھاؤں۔ تاکہ میں جس مقصد
سے یہاں ٹھہرا ہوا ہوں وہ پورا ہو سکے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ شاداں اور اُس کے والدین
میرے راستے کا پتھر بنیں۔

دروازہ بند تھا۔ روشنی دروازے کے نیچے سے جھانک رہی تھی۔ میں نے قریب پہنچ کر

دروازے کو آہستہ سے اندر کی طرف دھکیلا تو وہ کھل گیا۔ میں اندر گھس گیا۔ وہ دونوں غلاظت کے دلدل میں دھنسے ہوئے تھے۔ اُن کے کپڑے فرش پر بے ترتیبی سے بکھرے پڑے ہوئے تھے۔ اُن دونوں نے مجھے دیکھا تو اُن کے چہرے فق ہو گئے۔ آنکھوں سے خوف اور حیرت جھانکنے لگی۔

''تم دونوں جلدی سے کپڑے پہن لو! میں باہر کھڑا ہوں۔'' میں نے کہا۔ پھر میں نے باہر آ کر دروازہ بند کیا اور کنڈی لگا دی۔

تھوڑی دیر کے بعد اندر سے کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں نے کنڈی ہٹا کر دروازہ کھولا۔ وہ ظریف تھا۔ وہ باہر نکلنا چاہتا تھا۔ میں نے اُسے دھکا دیا، پھر دروازہ بند کر کے اندر سے چٹخنی لگا دی اور دروازے کے پاس کھڑا ہو گیا۔

''مجھے باہر جانے دو......'' ظریف نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔ ''اس وقت وہ رنگے ہاتھوں پکڑے جانے کے سبب بھیگی بلی بنا ہوا تھا۔

''ابھی نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''مجھے تم سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں، پھر تم جا سکتے ہو۔ خاموشی سے کھڑے رہو۔''

''تم کون ہوتے ہو اسے روکنے اور باتیں کرنے والے......؟'' شاداں نے ہذیانی لہجے میں کہا۔ ''اسے جانے دو۔''

''میں کوئی نہیں ہوتا......لیکن یہ تمہارا کون ہوتا ہے جو تم سے اتنی رات گئے ملنے آیا؟ تم دونوں کو میں نے جس شرمناک حالت میں دیکھا ہے کیا وہ اچھی بات ہے؟'' میں نے ترش روئی سے کہا۔

''تمہیں ہمارے معاملات میں دخل دینے کی کوئی ضرورت نہیں......تم کون ہوتے ہو؟'' وہ تیز آواز میں بولی۔

''اچھا...... یہ تمہارے معاملات ہیں......اچھی بات ہے۔ میں ابھی تمہارے باپ کو بلا کر لاتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''نہیں......نہیں......'' وہ دہشت زدہ ہو گئی۔ اُس کا چہرہ سفید پڑتا چلا گیا۔ اُس کا بدن لرزنے لگا۔

''ہم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں اور ہم دونوں نے خفیہ طور پر شادی کی

ہوئی ہے۔'' ظریف نے مُردہ لہجے میں کہا۔

''تم انتہائی جھوٹے، مکار، فریبی اور ذلیل شخص ہو......'' میں نے غصے سے کہا۔ ''کیا میں کوئی بچہ ہوں جو تم مجھے بے وقوف بنا رہے ہو؟''

''تم شاداں سے پوچھ لو کہ ہم دونوں نے شادی کر لی ہے کہ نہیں......؟'' ظریف نے شاداں کی طرف اشارہ کیا۔

''ہاں...... یہ سچ کہہ رہا ہے۔'' شاداں نے فوراً ہی سر ہلایا۔ ''ایک سال ہوا ہم دونوں نے چوری چھپے شادی کر لی۔''

''تم بھی جھوٹ بول رہی ہو اس کے اُکسانے پر......'' میں نے شاداں کو گہری نظروں سے دیکھا۔

''آخر تم ہماری باتوں کا یقین کیوں نہیں کرتے ہو......؟'' شاداں نے جزبز ہوتے ہوئے کہا۔

''اس لئے کہ تم دونوں کے لہجے جھوٹ کی چغلی کھا رہے ہیں۔ اگر تم نے شادی کر لی ہے تو یہ اچھی بات ہے۔ میں تمہارے ماں باپ کو لے کر آتا ہوں۔ اُن کے سامنے اس بات کا اقرار کر لینا۔ میں تمہارے ماں باپ کو سمجھا بجھا کر رخصتی پر رضامند کر لوں گا۔''

''نہیں......نہیں......'' ظریف اُچھل پڑا۔ ''خدا کے لئے ایسا نہیں کرنا...... وہ مجھے گولی مار دے گا۔ زندہ نہیں چھوڑے گا۔''

''تم اس لئے ڈر رہے ہو کہ وہ سچ مچ شاداں کو رخصت کر کے تمہارے ساتھ نہ بھیج دے۔ کیوں......؟ یہی بات ہے نا......؟'' میں نے کہا۔

''نہیں...... یہ بات نہیں ہے۔ تم اُسے نہیں جانتے۔ وہ بڑا غیرت مند اور خود دار ہے۔ وہ مجھے جان سے مار دے گا۔'' وہ ہکلایا۔

''میں اس بات کی ذمہ داری لیتا ہوں کہ وہ تمہیں جان سے نہیں مارے گا، ہنسی خوشی رخصت کر دے گا۔ کیونکہ تم نے شادی کر لی ہے اور ایک سال سے میاں بیوی کی طرح رہ رہے ہو اس لئے اُن کا غصہ سرد پڑ جائے گا۔ اس کے سوا چارہ بھی نہیں ہے کہ وہ صبر کر لیں۔ کیونکہ تیر، کمان سے نکل چکا ہے، جو ہونا تھا وہ ہو چکا ہے۔ آخر کو وہ ماں باپ ہیں، دشمن نہیں۔''

''ابھی نہیں...... دو تین دن کے بعد موقع محل دیکھ کر اُس سے بات کرنا۔'' ظریف
مجھے متوحش نظروں سے دیکھنے لگا۔

''دو تین دن بعد کس لئے......؟ آج، ابھی اور اسی وقت کیوں نہیں؟'' میں نے اُس
کی آنکھوں میں جھانکا تو وہ میری نظروں کی تاب نہ لا سکا۔ اُس نے گھبرا کر اپنی نظریں
جھکا لیں۔ وہ میرے مقابلے میں بھاری بھرکم اور بے حد صحت مند اور توانا تھا، دراز قد تھا
اس وقت وہ کسی ڈرپوک اور بزدل کی طرح سہما ہوا تھا کیونکہ رنگے ہاتھوں جو پکڑا گیا تھا۔

''اس لئے کہ تب وہ شاید زیادہ سخت مزاجی سے کام نہ لے۔ اس وقت ہم دونوں
یکجا دیکھ کر اُس کا پارہ چڑھ جائے گا۔''

''اصل بات یہ نہیں ہے۔'' میں نے تیز لہجے میں کہا۔ ''تم نہیں چاہتے کہ پھنس جاؤ۔''

''اس میں پھنسنے کی کیا بات ہے؟ جبکہ ہم دونوں نے شادی کر لی ہے۔'' وہ بے جان
لہجے میں بولا۔

''تم چونکہ ملازمت چھوڑ کر بھاگ جانا چاہتے ہو اس لئے دو تین دن کی مہلت مانگ
رہے ہو۔'' میں نے کہا۔

''مجھے کیا ضرورت پڑی ہے کہ میں اتنی اچھی ملازمت اور بیوی کو چھوڑ کر بھاگ
جاؤں؟ تم بلاوجہ مجھ پر شک کر رہے ہو۔''

''اس لئے کہ تم پہلے سے شادی شدہ ہو.... تم نے ایک سال سے شاداں سے تعلقات
استوار کر رکھے ہیں۔ اب چونکہ تمہارا جی شاداں سے بھر چکا ہے۔ رنگے ہاتھوں پکڑے
جانے پر بھاگنے کا سوچ رہے ہو۔ پکڑے نہ جاتے تو تم......''

''یہ تم کیا الزام لگا رہے ہو کہ میں شادی شدہ ہوں؟'' وہ درمیان میں میری بات
تیزی سے کاٹ کر بولا۔

''تم نہ صرف شادی شدہ ہو بلکہ دو بچوں کے باپ بھی ہو۔ اس لئے تم نے اب تک
شاداں سے شادی نہیں کی۔''

وہ بھونچکا سا ہو گیا۔ اُس کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔ اگلے ہی لمحے وہ سنبھل کر بولا۔

''یہ جھوٹ ہے۔ تمہارے پاس کیا ثبوت ہے؟''

''اس کا ثبوت تو تمہارے صندوق میں موجود ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''اس میں

تمہاری شادی کی اور بچوں کی تصویریں بھی ہیں۔ تمہاری بیوی کا نام نوراں ہے۔ اُس کی
عمر اٹھائیس برس ہے۔ تمہاری پہلی اولاد ایک لڑکی ہے۔ اُس کی عمر چھ برس کی ہے۔ اُس کا
نام صاعقہ ہے۔ دوسرا لڑکا ہے اُس کا نام منور ہے...... وہ تمہاری ماں کے ساتھ جڑانوالہ
میں رہتے ہیں۔

وہ اس طرح سن ہو گیا جیسے اس پر بجلی آ گری ہو۔ ساکت و جامد کھڑا میری شکل دیکھنے
لگا۔ اُس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ اُس نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔ ''تم
جھوٹ بول رہے ہو تاکہ شاداں کو مجھ سے چھین سکو۔ اسے مجھ سے بدظن کر سکو۔''

''میں ایک بدچلن لڑکی سے کیوں اور کس لئے شادی کرنے لگا؟ تم نے بھی اس سے
کہاں شادی کی ہے؟'' میں نے کہا۔ ''تم نے سامنے والے بنگلے میں کام کرنے والی لڑکی
ثروت سے بھی تعلقات قائم کر رکھے ہیں جو سترہ برس کی ہے۔ تم نے اُس کے ساتھ
بھاگنے کا منصوبہ بنایا ہوا ہے۔ اُسے ساتھ بھگا کر لے جانے کے لئے تم نے شاداں کے
ساتھ مل کر بیگم صاحبہ کے ہاں ڈاکہ مارنے کا منصوبہ بنایا اور اسے جھانسہ دے رہے ہو کہ
ڈکیتی کی واردات کرنے کے بعد شادی کر لو گے۔''

''ظریف! میں کیا سن رہی ہوں......؟'' شاداں جو حیران و پریشان کھڑی تھی، ایک
دم سے تنک کر بولی۔

''یہ شخص سراسر جھوٹ بول رہا ہے۔ اس کی ایک بات بھی سچ نہیں ہے۔'' ظریف نے
صفائی پیش کی۔

''ہم ابھی اور اسی وقت اس کے ساتھ اس کے کوارٹر چلتے ہیں تاکہ اس کے صندوق کی
تلاشی لیں۔ اس میں سے شادی کی تصویریں برآمد ہوں گی...... پھر تمہیں میرے جھوٹ اور
سچ کا پتہ چل جائے گا۔'' میں نے کہا۔

''خبردار...... جو تم دونوں نے میرے ساتھ چلنے کی کوشش کی۔'' ظریف ایک دم سے
بپھر گیا۔ ''میں اس سالے کو کل دیکھوں گا۔''

''مجھے اِن کی ایک بات بھی غلط معلوم نہیں ہو رہی ہے۔'' شاداں نے ظریف سے کہا۔
''میں نے دو تین مرتبہ تمہیں ثروت کے ساتھ بازار جاتے دیکھا ہے۔ تم اُس سے ہنس
ہنس کر باتیں بھی کرتے ہو۔ میں نے شک کا اظہار کیا تو تم نے مجھ سے کہا تھا کہ...... میں

اُسے اپنی بہن کی طرح سمجھتا ہوں۔ کیا تم بہنوں سے بھی تعلقات استوار کرتے ہو ذلیل انسان؟'' شاداں کا پارہ چڑھ گیا۔

''تمہیں میری بات کا یقین نہیں آ رہا ہے؟ تم کس ذلیل شخص کی باتوں میں آ رہی ہو؟'' ظریف بری طرح جھنجھلا گیا۔

''نہیں......'' شاداں نے سر ہلایا۔ ''اب تم میرے لئے قابل اعتبار نہیں رہے ہو اب مجھے تم پر بھروسہ نہیں رہا ہے۔''

''وہ کس لئے؟ کیا اس ذلیل شخص کی باتوں میں آ کر تم مجھے اس جیسا سمجھ رہی ہو؟'' اُس نے ہذیانی لہجے میں کہا۔

''اس لئے کہ تم ساتھ لے جا کر اپنے صندوق کی تلاشی دینے کے لئے تیار نہیں ہو...... اگر تم سچے ہو تو ابھی چل کر تلاشی دے دو۔''

''تم کل صبح دس بجے آ کر تلاشی لے لینا...... میں اُس وقت اپنا صندوق کھول کر دکھا دُوں گا۔'' اُس نے کہا۔

''میں کوئی بچی نہیں ہوں۔'' شاداں زہر خند سے بولی۔ ''تم ابھی اور اسی وقت جا کر وہ تصویریں چھپا دو گے...... میں کل ثروت سے مل کر معلوم کرلوں گی کہ تم اُس کے ساتھ کب سے کھیل رہے ہو......؟ ثروت کی گوٹ میرے ہاتھ میں ہے۔ وہ مجھ سے کوئی بات نہیں چھپاتی ہے۔ میں اُسے تمہاری اصل، کالی اور مکروہ صورت دکھا دُوں گی۔ اُس کی ماں سے تمہارا کچا چٹھا کھول دُوں گی۔ تم جانتے ہو وہ کیسی عورت ہے۔ ثروت کو ایک بار کھوکھر صاحب کے نوکر نے میری جان کہہ کر چھیڑا تو اُس کی ماں نے اُس کمینے کی ہڈیاں توڑ ڈالی تھیں۔ جب وہ سنے گی کہ تم نے اُس کی بیٹی کی عزت پر ہاتھ ڈالا ہے تو پھر وہ تمہارا خون پی جائے گی۔''

ظریف یہ سنتے ہی تیزی سے کمرے سے نکلا۔ پھر وہ اپنی چھت پر پہنچا اور زینے پر بدحواسی سے قدم رکھا تو اُس کا پیر پھسل گیا۔ پھر وہ نیچے والے زینے تک پھسلتا چلا گیا اور بے ہوش ہو گیا۔ دوسرے دن پتہ چلا کہ اُس کے ایک ہاتھ اور پیر کی ہڈیاں، ٹوٹ گئیں۔ ناک اور ایک جبڑا بھی ٹوٹ گیا۔ اُسے سرکاری ہسپتال میں لے جا کر داخل کرا دیا گیا۔

میں نے شاداں کی طرف دیکھا جو مجرم کی طرح سر جھکائے کھڑی تھی۔ پھر وہ پھوٹ

پھوٹ کر رونے لگی اور دوپٹہ منہ پر رکھ لیا۔

''اب رونے دھونے سے تمہاری کھوئی ہوئی عزت ملنے سے رہی۔ اب تم جا کر سو جاؤ۔'' میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔

''آپ مجھے معاف کر دیں......'' وہ سسکیوں کے درمیان بولی۔ ''میں نے آپ کو غلط سمجھا...... وہ بڑا ذلیل شخص تھا۔''

''میں نے تمہیں پہلے ہی معاف کر دیا تھا۔ لیکن تم اپنے آپ کو کیسے معاف کرو گی؟ اُس شخص کی محبت کے فریب میں آ کر تم نے اپنا سب کچھ کھو دیا۔ اب تمہارے پاس عزت و آبرو نام کی کوئی چیز نہیں رہی ہے۔ اب تم ایک خالی برتن کی طرح ہو کر رہ گئی ہو۔''

''یہ آپ کو کیسے اور کیونکر معلوم ہوا کہ وہ شادی شدہ اور دو بچوں کا باپ ہے؟'' اُس نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے پوچھا۔

''اُس کا ایک دوست اللہ دِتا ہے۔ اُس نے مجھے ظریف کے بارے میں بتایا تھا۔ یہ اُس وقت کی بات ہے جب میں خریداری کرنے بازار جا رہا تھا۔ اللہ دِتا بھی میرے ساتھ بازار تک آیا تھا۔ اُس نے مجھے یہ بھی بتایا کہ تمہارے اُس سے تعلقات ہیں۔ وہ تم سے دل بہلا رہا ہے۔'' میں نے جھوٹ بولا تھا۔ اس کے سوا چارہ بھی نہیں تھا۔ شاداں کو اس لئے بھی یقین ہو گیا کہ اللہ دِتا بھی اُس بنگلے میں ملازم تھا۔

''ثروت سے اُس کے جو تعلقات ہیں اس کے بارے میں کیا اللہ دِتا نے بتایا تھا؟'' شاداں دل گرفتہ لہجے میں بولی۔

''ہاں......'' میں نے سر ہلایا۔ ''ظریف کا کام یہی ہے کہ لڑکیوں کو سبز باغ دکھا کر اُن کی زندگی خراب کرے۔ وہ اب تک دو تین لڑکیوں کو بھگا کر لے گیا ہے۔ اُن کے ساتھ وقت گزار کر اُنہیں وڈیروں کے ہاتھوں بیچ آیا ہے۔ وہ ثروت کے ساتھ بھی ایسا کرنا چاہتا تھا۔''

''اچھا...... میں جا رہی ہوں۔'' وہ بولی۔ ''میں اور میرے ماں باپ نے آپ کو غلط آدمی سمجھا تھا۔ لیکن آپ بہت اچھے آدمی نکلے۔ آپ نے مجھے اور میرے گھر والوں کو بچالیا۔ وہ کتا، حرام زادہ ڈاکہ مار کر بیگم صاحبہ کی رقم اور زیورات لے جاتا تو ہماری خیر نہ ہوتی...... اُس نے آپ کو پھنسانے کا بھی سوچ رکھا تھا۔ آپ کا بہت بہت شکریہ جی......

آپ نے مجھ پر بڑا احسان کیا ہے۔''

وہ کمرے سے نکل گئی۔ میں نے کمرے کی روشنی گل کی اور تھوڑی دیر کے بعد ا
کمرے میں آ گیا۔ میں سوچنے لگا کہ یہ لڑکیاں بھی کیسے کیسے خواب دیکھتی ہیں، ان خوابو
کے پیچھے بھاگنے سے ان کے منہ پر کالک لگ جاتی ہے، کالی لکیریں پڑ جاتی ہیں۔ شادا
نے کیا پایا؟ اُس لڑکی ثروت نے کیا پایا......؟ ایک درندے نے انہیں محبت کے نام
فریب دیا، سبز باغ دکھائے۔

میں نے اور شاداں نے ظریف کی ایک دل خراش چیخ سنی تھی۔ وہ زینے پر پھسل گ
تھا۔ شاداں کو اب اس بات کی کوئی فکر اور پرواہ نہیں رہی تھی کہ اُس کا کیا حشر ہوا۔ کیونکہ
ظریف نے اُس کی زندگی جو کالی کر دی تھی، اُس نے محبت کو نفرت میں بدل دیا تھا۔ اُ
کا بس چلتا تو وہ ظریف کا خون کر کے سینے میں بھڑکتی انتقام کی آگ سرد کر لیتی۔

صبح ناشتے کی میز پر بیگم شاہد میری منتظر تھی۔ شاداں کی بجائے اُس کی ماں نے آ
ناشتہ بنایا تھا کیونکہ شاداں کو تیز بخار چڑھا ہوا تھا۔ وہ صبح تک اپنی بربادی پر روتی رہی تھی
پچھتاتی رہی تھی کہ اُس کی نادانی نے اُسے کتنی بڑی سزا دی۔ اُس کی ماں کی طبیعت بھ
ٹھیک نہیں تھی لیکن وہ پھر بھی ناشتہ تیار کرنے آ گئی تھی۔ اُس کی طبیعت کل کے مقابلے میں
قدرے بہتر تھی۔

گیارہ بجے بیگم شاہد نے مجھے گاڑی کی چابی دیتے ہوئے کہا۔ ''گاڑی تم چلاؤ گے...
ڈیفنس سوسائٹی چلو!''

مجھے نہیں معلوم تھا کہ میں گاڑی چلانا جانتا ہوں۔ لیکن جب میں نے اگنیشن میں چابی
ڈال کر اُس کا انجن سٹارٹ کیا تو اس بات کا علم ہوا کہ مجھے گاڑی چلانی آتی ہے۔ میں
گاڑی سڑک پر لے آیا۔ کوئی بیس منٹ کی مسافت کے بعد ایک عمارت کے سامنے بیگم
شاہد نے گاڑی رُکوائی جس میں لگژری فلیٹ تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ فلیٹ نمبر بیس کی
اطلاعی گھنٹی بجا رہی تھی جو دوسری منزل پر تھا۔ چند لمحوں کے بعد دروازہ کھلا۔ ایک بیس برس
کی بہت ہی حسین و جمیل اور سرو قد عورت نے دروازہ کھولا۔ پھر اُس نے ایک طرف ہٹ
کر اندر آنے کا راستہ دیا۔ اندر داخل ہوتے ہوئے میں اُس کے قریب سے گزرا تو وہ کسی
پھول کی طرح مہک رہی تھی۔ اُس کا لباس فاخرانہ تھا۔ اس عمارت اور اس کے فلیٹوں سے

ہی اندازہ ہوتا تھا کہ اس میں بے حد دولت مند لوگوں کی اقامت ہے۔ اس کے پارکنگ
لاٹ میں ایک سے ایک نئی اور شاندار گاڑی کھڑی تھی۔

جب وہ دروازہ بند کر کے مُڑی تو بیگم شاہد نے اُس سے میرا تعارف کرایا۔ ''مسٹر
سالار۔ یہ میرے سیکرٹری ہیں۔''

اُس عورت نے اپنا خوبصورت اور نرم و نازک ہاتھ مصافحے کے لئے بڑھایا۔ ''مسز
فریدہ چودھری۔ آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔''

اُس کے ہاتھ میں ایک عجیب سی نرمی اور گداز تھا۔ اُس کا لمس بھی بڑا لطیف سا محسوس
ہوا۔ اُس نے بڑی گرم جوشی سے مصافحہ کیا تھا۔ پھر ہم نشست گاہ میں آئے تو اُس نے
پوچھا۔ ''آپ کیا پینا پسند کریں گے؟''

''میرے لئے شیمپئن اور مسٹر سالار کے لئے اورنج اسکواش لے آؤ۔'' بیگم شاہد نے
جواب دیا۔

وہ مستانہ خرامی سے کچن کی طرف بڑھ گئی۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ اس فلیٹ میں ایک
بھی ملازمہ نظر نہ آئی اور نہ ہی کوئی مرد دکھائی دیا۔ کچھ دیر کے بعد وہ ایک ٹرے میں ایک
پیگ شیمپئن کا اور دو گلاس اورنج اسکواش لے آئی۔

''چودھری صاحب کی آج کل کیا مصروفیات ہیں؟'' بیگم شاہد نے پوچھا۔ ''وہ یورپ
یا امریکہ تو نہیں جا رہے ہیں؟''

''فی الحال تو اُن کا کوئی پروگرام نہیں ہے۔'' فریدہ چودھری نے جواب دیا۔ ''یوں بھی
اُن کے پروگرام اچانک ہی بنتے ہیں۔''

''حمیرا چنا بتا رہی تھی کہ چار دن کے بعد وہ پچاسویں سالگرہ بہت دُھوم دھام سے
منانے والے ہیں؟''

''جی ہاں۔'' فریدہ چودھری نے اپنا خوشنما سر ہلایا۔ ''اُنہوں نے ابھی سے ہوٹل
ٹریٹن میں بکنگ کروالی ہے۔ دعوت نامے اتفاق سے پوری طرح تقسیم نہ ہو سکے۔ آج
شام تک آپ کو اور شہناز بٹ کو دعوت نامے مل جائیں گے۔''

''سالگرہ والے دن تم کون سا لباس پہنو گی؟ تم نے لباس خرید تو لیا ہوگا۔'' بیگم شاہد
نے سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھا۔

''میں نے ریڈی میڈ لباس ہی خریدا ہے جو چالیس ہزار کی مالیت کا ہے۔'' فرید
چودھری نے بتایا۔ ''یہ لباس میری نہیں، چودھری صاحب کی پسند کا ہے۔ گلابی رنگ
لباس ہے۔ شرارہ سوٹ ہے۔''

''تمہارا کیا ہے......؟ تم بہت ہی معمولی قسم کا لباس بھی پہن لو تو رانی کی طرح لگ
گی۔ تمہارا حسن کسی لباس کا محتاج نہیں ہے۔ ہاں، اُس روز زیورات کون سے پہنوگی
کیا چودھری صاحب نے زیورات بھی خرید کر دیئے ہیں؟''

''وہ گلوبند پہنوں گی جس میں ہیرے جڑے ہوئے ہیں۔'' وہ بولی۔ ''وہ گلوبند
آپ نے دیکھا ہوا ہے۔''

''تم شاید اُس گلوبند کی بات کر رہی ہو جو اسمگلر ناظم سے خریدا گیا تھا، جس کی مالیت
سات لاکھ روپے ہیں۔''

''جی ہاں......'' فریدہ چودھری نے سر ہلایا۔ ''چودھری صاحب کہہ رہے تھے کہ میں
چاہوں تو کوئی بھی نیا زیور خرید لوں۔ لیکن میں نے انکار کر دیا۔ اس لئے کہ تقریباً پچیس
لاکھ کی مالیت کے زیورات گھر پر رکھے ہوئے ہیں، مزید خرید کر کیا کروں گی؟''

''تمہیں اپنے شوہر کی دولت کی بڑی فکر ہے...... خیر چھوڑو ان باتوں کو۔ ان کی پہلی
بیوی نسیم جہاں جو اچانک پراسرار طور پر لاپتہ ہوگئی تھی اُس کا کچھ پتہ چلا کہ وہ کیوں اور
کس طرح اچانک غائب ہوگئی؟''

''جی نہیں......'' فریدہ چودھری نے سر ہلایا۔ ''حمیرا چنا اور میرے شوہر بھی بڑی
سرگرمی سے اُسے تلاش کر رہے ہیں۔''

''کہیں ایسا تو نہیں کہ تمہارے شوہر نامدار نے پیشہ ور قاتلوں کی خدمات حاصل کر
اُسے ٹھکانے لگا دیا ہو اور اُس کی لاش کہیں دفن کرا دی ہو؟''

''نہیں آنٹی!'' فریدہ چودھری نے کہا۔ ''اُنہیں ایسا کرنے کی کیا ضرورت پڑی
کیونکہ وہ اُسے اپنی مرضی اور خوشی سے کلفٹن والی کوٹھی جس کی مالیت دس کروڑ روپے
اور پچاس لاکھ روپے نقد طلاق کے ساتھ دینے والے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک مرسڈ
گاڑی بھی......''

''تم نے اُن کی بے جا فراخ دلی پر اعتراض نہیں کیا......؟ وہ کس لئے حاتم طائی

رہے ہیں؟'' بیگم شاہد نے جز بز ہو کر کہا۔

''میں کون ہوتی ہوں اعتراض کرنے والی...... یہ اُن کا ذاتی معاملہ ہے۔'' وہ بولی۔
''اتنا کچھ دینے کے بعد بھی اُن کے اثاثے میں کوئی کمی نہیں آئے گی۔ دو کوٹھیاں، سلطان
چیمبرز جس میں بیس دفاتر کرائے پر اُٹھے ہوئے ہیں، تین کروڑ کے حصص، بارہ گاڑیاں،
تین لگژری اپارٹمنٹ، کے ڈی اے سکیم نمبر ایک میں چھ ہزار گز کی کوٹھی...... اور جانے کیا
کچھ ہے جو بیوہ ہونے کے بعد میں اس کی......'' اُسے اچانک میری موجودگی کا احساس
ہوا تو وہ چپ ہوگئی۔

اگلے لمحے بیگم شاہد اُٹھ کھڑی ہوئی۔ پھر اُسے لے کر سامنے والے بیڈ روم میں چلی گئی
اور دروازہ بند کر لیا۔

کوئی بیس منٹ کے بعد دونوں بیڈ روم سے باہر آئیں۔ اس بیس منٹ کے عرصے
میں، میں نے کارنس پر رکھی ہوئی فریدہ چودھری اور اُس کے شوہر چودھری کی شادی کی
تصویر دیکھی۔ چودھری نہ صرف موٹا، بھدا اور پستہ قد تھا بلکہ بدصورت بھی تھا۔ پچاس
برس کی عمر میں اُس کے چہرے پر خباثت برس رہی تھی۔ اُس کی آنکھوں سے کینہ جھانک
رہا تھا۔ فریدہ سے اُس کا کوئی جوڑ نہیں تھا۔ وہ حور کے پہلو میں لنگور تھا۔ لیکن دولت ہر
عیب کو چھپا لیتی ہے۔ بے جوڑ کو ایک خوبصورت جوڑ بنا دیتی ہے۔ بیگم شاہد کے ذہن نے
چودھری کے بارے میں بتایا کہ وہ چھ سات برس پہلے کے ای ایس سی کے میٹر ڈیپارٹمنٹ
میں ریڈر تھا۔ وہ کلفٹن کے علاقے میں میٹر ریڈنگ کرتا تھا۔ اس علاقے کے دولت
مندوں کو کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ وہ لاکھوں میں کھیلتے تھے لیکن بجلی چوری کرتے تھے۔ تیس
سے چالیس ہزار کی بجلی ہر ماہ استعمال کرتے تھے لیکن ان کے بنگلوں اور کوٹھیوں کے بل دو
تین ہزار روپے سے زیادہ نہیں آتے تھے۔ دس ہزار کی رقم ہر ماہ فی گھر اُس کی جیب میں
جاتی تھی۔ جب اُس کی جیب میں لاکھوں کی رقم آ گئی تو پھر وہ اُونچے خواب دیکھنے لگا۔
دولت کو دولت کھینچتی ہے۔ پھر اُس نے ایک دوست کے ساتھ مل کر ہیروئن لندن اسمگل کی
جس میں اُسے دو کروڑ کا فائدہ ہوا۔ پھر اُس نے دو تین ٹرپ اور کئے تو دولت اُس کے گھر
کی لونڈی بن گئی۔ پھر اُس نے ایک چلتی ہوئی انڈسٹری، ایک کمرشل بلڈنگ اور جائیداد
خرید لی۔ اُس کی پانچوں اُنگلیاں گھی میں اور سر کڑاہی میں ہو گیا۔ دولت میں مزید

اضافے کے لئے اُس نے کالے دھندے بھی شروع کر دیئے۔

حرام دولت کے درخت کی شاخوں میں شباب اور شراب کی بھی شاخیں ہوتی ہیں
اُس کی پہلی بیوی جس سے اُس کی کوئی اولاد نہ تھی وہ بڑی صابر و شاکر عورت تھی۔ اُ
نے تنگ دستی میں بھی اپنے شوہر کا ساتھ دیا۔ دولت اُسے عیاشی کی طرف لے گئی۔
عورت اور شراب کا رسیا بن گیا۔ عورت اُس کی بہت بڑی کمزوری بن گئی۔ فریدہ
چودھری سے شادی کرانے میں بیگم شاہد اور شہناز بٹ کی کوششوں کا بڑا دخل تھا۔ وا
چودھری شادی کا قائل نہ تھا لیکن فریدہ کے حسن و شباب نے اُسے فریدہ کا اسیر بنا دیا تھا

بیگم شاہد نے حمیرا اچنا کو اُس کی پرائیویٹ سیکرٹری رکھوا دیا تھا تا کہ وہ چودھری اور فر
کی مخبری کرتی رہے۔ اُس نے چونکہ فریدہ کی شادی چودھری سے کروائی تھی اس لئے
میاں بیوی پر کڑی نظر رکھنا چاہتی تھی۔ حمیرا اچنا سے چھوٹی چھوٹی باتوں تک کی خبر لیتی تھ
حمیرا اچنا اُس کی اس لئے بھی احسان مند تھی کہ اُس کی تنخواہ عام پرائیویٹ سیکرٹریوں
مقابلے میں دُگنی تھی۔ اور پھر چودھری اپنی سیکرٹری سے بھی منہ کا ذائقہ بدلتا رہتا تھا
لئے اس پر وہ نوازشات کی بارش کرتا رہتا تھا۔

رات آٹھ بجے بیگم شاہد مجھے اور شہناز بٹ کو ایک ہوٹل میں ڈنر کے لئے لے کر پہنچ
وہاں حمیرا اچنا بھی موجود تھی۔ بیگم شاہد نے اُسے ڈنر پر مدعو کیا ہوا تھا۔ حمیرا اچنا بھی بلا کی حس
اور طرح دار لڑکی تھی۔ وہ ایک ایسی لڑکی تھی جو اپنے مفاد کے لئے مہربان ہو جاتی اور بڑ
فیاضی سے پیش آتی تھی۔ بیگم شاہد نے اُسے کچھ معلومات حاصل کرنے کے لئے بلایا ہوا تھ

''نسیم جہاں کا کچھ پتہ چلا؟'' شہناز بٹ نے اُس سے دریافت کیا۔ ''کہیں ایسا
نہیں کہ دولت بچانے کے لئے چودھری نے اُس کا پتا صاف کروا دیا ہو......؟''

''میرا خیال تو یہ ہے کہ وہ خود ہی دانستہ طور پر پراسرار انداز سے غائب ہو گئی ہے''
حمیرا اچنا نے کہا۔

''اُسے کیا ضرورت پڑی تھی کہ وہ خود بخود غائب ہو جائے......'' بیگم شاہد نے متعج
لہجے میں کہا۔ ''ایسی حرکت کوئی پاگل عورت ہی کر سکتی ہے۔ جبکہ وہ ایسی بیوقوف نہیں
کہ اس قسم کی حرکت کرے اور اتنی بڑی دولت سے کنارہ کش ہو جائے، اپنے پیروں
کلہاڑی مار لے...... مجھے تو کوئی اور ہی چکر معلوم ہوتا ہے۔''

''اُسے فریدہ چودھری نے ہی غائب کروایا اور پیشہ ور بدمعاشوں کے ہاتھوں ٹھکانے
لگا دیا ہو گا تا کہ چودھری دولت اور گاڑیاں اُس کے نام نہ کر دے۔ فریدہ ایسی نہیں ہے
جیسی دکھائی دیتی ہے۔'' شہناز بٹ نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

نسیم جہاں اُس روز سے غائب ہے جب چودھری صاحب نے اُسے دفتر بلا کر کہا کہ
وہ اُسے طلاق دینا چاہتا ہے۔ اُس نے کہا کہ مجھے طلاق کی ضرورت نہیں ہے۔ تب
چودھری نے کہا کہ طلاق کے عوض اُسے کلفٹن والی کوٹھی، پچاس لاکھ روپے اور دو گاڑیاں
دے گا۔ تب اُس نے اپنے شوہر سے کہا کہ وہ سوچ کر جواب دے گی۔ یہ میرے سامنے
کی بات ہے۔'' حمیرا اچنا بولی۔

''چودھری اُسے تمہارے سامنے طلاق دے دیتا تو بات وہیں ختم ہو جاتی۔ اُس نے
طلاق کس لئے نہیں دی؟'' بیگم شاہد نے کہا۔ ''وہ تمہارے اور دفتر کے کسی بھی شخص کے
سامنے طلاق دے کر انہیں گواہ بنا لیتا اور مہر کی رقم دے کر ٹرخا دیتا۔''

''چودھری نے اس لئے نسیم جہاں کو اب تک طلاق نہیں دی کہ چودھری کی گوٹ اُس
کے ہاتھ میں ہے۔'' حمیرا اچنا بولی۔

''کیسی گوٹ......؟'' شہناز بٹ کے چہرے پر گہرا استعجاب چھا گیا۔ اُس نے اپنی
پلکیں جھپکائیں۔

''یہ تو میں نہیں جانتی لیکن میں نے محسوس کیا کہ جب بھی اُس کے سامنے نسیم جہاں آئی
وہ اُس کے سامنے دبا دبا سا دکھائی دیا۔ کچھ خائف سا ہو جاتا ہے۔ اسی لئے تو وہ اُسے دو
کروڑ سے زیادہ حصہ دے رہا تھا۔'' حمیرا اچنا بولی۔

''حیرت کی بات ہے کہ تم نے ابھی تک یہ پتہ نہیں چلایا کہ نسیم جہاں کے ہاتھ میں
اس کی کون سی گوٹ دبی ہوئی ہے؟'' بیگم شاہد نے تیز لہجے میں کہا۔ ''اب تم جب اُس
کے پاس جاؤ گی تو اُسے خواب شراب پلا دینا۔ جب اُس پر نشہ طاری ہو جائے، اُس سے
معلوم کر لینا۔ پھر وہ تمہیں ایک ایک بات بتا دے گا...... نشاط انگیز لمحات میں تم اُس سے
بہت کچھ اُگلوا سکتی ہو۔''

''لیکن یہ معلوم کر کے ہمیں کرنا کیا ہے؟'' حمیرا اچنا نے تکرار کی۔ ''ہمیں صرف اور
صرف چودھری سے سروکار ہے۔''

''میں جو تم سے کہہ رہی ہوں اس پر عمل کرو۔'' بیگم شاہد بگڑ کر برہمی سے بولی۔ ''تمہیں سوال و جواب کرنے کی ضرورت نہیں۔''

بیگم شاہد کی ڈانٹ سن کر حمیرا چنا کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ وہ پھنسی پھنسی آواز میں بولی۔ ''کل شام وہ مجھے ساحل سمندر لے جا رہا ہے تاکہ وہاں اُس کا جو ہٹ ہے اُسے آراستہ پیراستہ کیا جا سکے۔ وہ اپنی سالگرہ کے دوسرے دن یہاں اپنے قریبی دوستوں کو شراب پارٹی دینے والا ہے۔ شاید ہم دونوں رات رُک جائیں۔ میں معلوم کرلوں گی۔''

○

جس روز چودھری کی سالگرہ تھی اُس روز صبح دس بجے شہناز بٹ اور بیگم شاہد باہر سے آئیں۔ اُس وقت میں گہری نیند سو رہا تھا۔ شہناز بٹ نے میرے کمرے میں آ کر مجھے جگایا اور کہا کہ میں جلدی سے تیار ہو کر آؤں۔

جب میں تیار ہو کر نشست گاہ میں آیا تو بیگم شاہد نے میری طرف فلیٹ کی چابی بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''تم ابھی اور اسی وقت فریدہ کے فلیٹ پر جاؤ۔ وہ ایک پیکٹ دے گی، وہ لیتے آنا۔''

میں نے بیگم شاہد کے ہاتھ سے چابی نہیں لی۔ ''اس کی کیا ضرورت ہے؟ میں اطلاعی گھنٹی بجادوں گا۔''

''وہ رات بھر کی جاگی ہوئی ہے۔ گہری نیند میں ہوگی۔ اطلاعی گھنٹی بجانے سے اُس کی نیند خراب ہوگی۔'' بیگم شاہد نے کہا۔

''لیکن وہ پیکٹ لینے کے لئے بھی اُسے جگانا تو ہوگا۔ میں اطلاعی گھنٹی بجا کر ہی جگا لوں گا۔'' میں نے کہا۔

''تم بحث و تکرار کیوں کر رہے ہو؟'' شہناز بٹ کو غصہ آ گیا۔ ''بیگم شاہد جو کہہ رہی ہیں اس پر عمل کرو۔ جلدی سے چابی لے کر روانہ ہو جاؤ...... کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ بیدار ہو کر کہیں چلی جائے۔ اس پیکٹ کا لانا بہت ضروری ہے۔''

''میں تو اب کسی بھی قیمت پر نہیں جاؤں گا۔'' میں نے بے پرواہی سے کہا۔ ''آپ کسی اور کو وہاں بھیج دیں۔ یا پھر چوکیدار کو بھیج دیں۔''

''تم کیوں نہیں جاؤ گے؟'' بیگم شاہد نے مجھے قہر آلود نظروں سے گھورا۔ ''یہ میرا حکم ہے۔

تمہیں جانا ہوگا۔ میری گاڑی لے جاؤ!''

''میں اس لئے وہاں نہیں جاؤں گا کہ اُس فلیٹ میں فریدہ نہیں ہے بلکہ چودھری صاحب کی لاش پڑی ہوئی ہے۔ آپ مجھے اُس کے قتل کے کیس میں پھنسا دینا چاہتی ہیں۔ آپ نے اسی دن کے لئے تو مجھے یہ ملازمت دی ہے۔''

بیگم شاہد اور شہناز بٹ خوفزدہ ہو کر ایک دوسرے کی شکل دیکھنے لگیں۔ وہ بھونچکی سی ہو گئی تھیں۔ بیگم شاہد نے تحیر زدہ لہجے میں کہا۔ ''تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے کیا......؟ تم سے کس نے کہہ دیا کہ وہاں چودھری صاحب کی لاش پڑی ہے؟''

''آپ دونوں کے متوحش چہرے بتا رہے ہیں کہ چودھری صاحب کو قتل کر دیا گیا ہے۔ اُن کی لاش بیڈ رُوم میں پڑی ہے۔''

''تم نے خواب دیکھا ہوگا۔'' شہناز بٹ بولی تو اُس کی آواز ویران، کھوکھلی اور بہت دُور سے آتی سنائی دی۔ ''اُنہیں بھلا کون قتل کر سکتا ہے...... اُنہیں قتل کرنے کی ضرورت بھی کیا ہے...... اُن کا کوئی دشمن نہیں ہے جو اُنہیں قتل کر دے۔''

''آپ دونوں نے مل کر چودھری صاحب کو صبح ٹھیک نو بجے قتل کیا ہے......!'' میں نے اُن کی طرف باری باری دیکھا۔

''کیا......؟'' بیگم شاہد اس طرح اُچھلی جیسے اُسے برقی جھٹکا لگا ہو۔ شہناز بٹ کا چہرہ بھی متغیر ہو گیا۔

''یہ تم کیا ہانک رہے ہو......؟'' شہناز بٹ نے خود پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''تم پاگل تو نہیں ہو گئے ہو......؟''

''میں ہانک نہیں رہا ہوں بلکہ بہ ہوش و حواس عرض کر رہا ہوں کہ آپ دونوں نے مل کر چودھری صاحب کو قتل کر دیا ہے۔'' میں نے تکرار کی۔

''ہمیں چودھری صاحب کو قتل کرنے کی کیا ضرورت پڑی ہے......؟'' بیگم شاہد کی آواز حلق میں اٹک رہی تھی۔ ''یو ڈیم فول......!''

''چودھری صاحب کی دولت، جائیداد اور اثاثے کے حصول کے لئے اُنہیں ایک منصوبے کے تحت قتل کیا گیا ہے۔'' میں نے کہا۔

''اُن کے قتل سے ہمیں اُن کے اثاثے کیسے مل سکتے ہیں؟ جبکہ اُن سے ہمارا کوئی تعلق

نہیں ہے، نہ رشتہ دار ہیں۔''

''آپ دراصل دولت کی پجاری ہیں۔ اور آپ نے متعدد گھناؤنے جرم کئے ہیں۔'' میں کہنے لگا۔ ''آپ ایک جرائم پیشہ عورت ہیں۔ آپ نے سب سے پہلے اپنے شوہر کو قتل کیا۔ آپ اتفاقاً قانون کے ہاتھوں سے بچ گئیں۔ لیکن میں چاہوں تو آج بھی آپ کو اپنی گواہی سے شوہر کے قتل کے الزام میں گرفتار کرواسکتا ہوں۔ لیکن میں ایسا نہیں کروں گا کیونکہ آپ دونوں چودھری صاحب کے الزام میں قانون کے شکنجے میں کسنے والی ہیں۔ آپ نے چودھری صاحب کی دولت حاصل کرنے کے لئے ایک بساط بچھائی اور شاطرانہ چال چلی۔ فریدہ کو آلہ کار بنایا۔ فریدہ...... ایک ایسی لڑکی ہے جس میں خواب ناک راحتوں کا زہر سرایت کیا ہوا ہے۔ وہ ہر قیمت پر امریکہ جانا چاہتی تھی تا کہ اپنا مستقبل تابناک کر سکے۔ ایک روز شہناز بٹ اُسے آپ کے ہاں لے آئی۔ اُس کا حسن و شباب دیکھ کر آپ بھڑک اُٹھیں۔ بہت دنوں سے آپ کی نظر چودھری صاحب پر تھی کہ اُس کی دولت کیسے حاصل کی جائے۔ آپ اُسے مہرہ بنانا چاہتی تھیں۔ آپ نے فریدہ سے کہا۔

''سنو...... تم امریکہ جانا چاہتی ہو...... اس کے لئے نہ صرف دولت بلکہ اثر ورسوخ کی بھی ضرورت ہے۔ تمہارے پاس یہ دونوں چیزیں نہیں ہیں۔ لہٰذا تم کسی قیمت پر امریکہ نہیں جاسکتی ہو...... صرف امریکہ کے خواب دیکھ سکتی ہو۔''

''اگر آپ مجھے اپنے اثر ورسوخ سے امریکہ بھیج دیں تو میں اس احسان کو کبھی بھلا نہیں سکوں گی۔'' فریدہ نے کہا۔

''لیکن اثر ورسوخ سے زیادہ دولت کی ضرورت ہے۔ تم ایثار و قربانی سے کام لو اور دولت خرچ کرو تو امریکہ جاسکتی ہو۔''

''میرے پاس دولت کہاں ہے؟'' وہ بولی۔ ''اگر ہوتی تو ایجنٹ کو دو لاکھ روپے دے کر امریکہ نہ چلی جاتی؟''

''تم بذاتِ خود دولت ہو...... عورت کا حسن و شباب ایک کرنسی کی طرح ہوتا ہے۔ کیش ہوسکتی ہو۔''

''وہ کیسے؟'' فریدہ نے حیرت و تجسس سے پلکیں جھپکائیں۔ ''میں کیش کہاں سے ہوں''

''تم اپنے کپڑے اُتار دو۔ میں بتاتی ہوں کہ تم کتنی بڑی دولت ہو...... تمہیں کیا

مل سکتا ہے۔'' فریدہ جھجک گئی تو آپ نے اُس سے کہا تھا۔ ''میں تمہارا بدن دیکھے بغیر تمہاری کوئی مدد نہیں کرسکتی۔ میں تمہارا بدن دیکھ کر ہی فیصلہ کروں گی کہ تمہیں کس طرح سے امریکہ بھیجا جاسکتا ہے۔ شرمانے کی ضرورت نہیں، کیونکہ یہ تمہارا جسمانی انٹرویو ہے۔''

پھر فریدہ بے نیام تلوار کی طرح آپ دونوں کے سامنے کھڑی ہوگئی۔ آپ دونوں نے اُسے باری باری اس طرح دیکھا جس طرح قربانی کا جانور دیکھا جاتا ہے۔ جب تلوار نیام میں چلی تب آپ نے فریدہ سے کہا۔ ''تم واقعی بلا کی حسین ہو۔ تم کشش کے ایسے خزانوں کی مالک ہو جو بہت کم لڑکیوں کے پاس ہوتے ہیں۔ تمہیں ہم بلندیوں پر پہنچانا چاہتی ہیں۔ تمہیں ایک ایسے خزانے کی مالک بنا سکتی ہیں کہ ساری زندگی عیش کرو گی۔ صرف امریکہ کیا، پورے امریکہ اور یورپ کی سیر بھی کرسکتی ہو۔ تم راتوں رات کروڑ پتی بن سکتی ہو۔''

''وہ کیسے......؟'' فریدہ نے حیرت اور تجسس سے پوچھا۔ اُس کا چہرہ انجانے خیال سے دمک اُٹھا تھا۔

''کس طرح اور کیسے؟ میں بتاتی ہوں۔'' شہناز بٹ نے جواب دیا۔ ''لیکن تمہیں اس دولت اور اثاثے میں سے ہمیں نصف دینا ہوگا۔''

فریدہ کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ وہ دل میں جتنی حیران تھی، خوش تھی اُتنا یہ سوچ سوچ کر اُس کا دماغ چکرا رہا تھا کہ وہ راتوں رات ایک کروڑ پتی عورت کیسے بن سکتی ہے؟ اُس نے ہر طرح سے سوچا۔ پھر یکلخت اُسے خیال آیا، کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ اس کے ذریعے سے ہیروئن سمگل کرانا چاہتی ہوں۔ امریکہ اور یورپ میں ہیروئن کی بڑی مانگ ہے۔ اس میں لاکھوں کا نہیں، کروڑوں کا فائدہ ہوتا ہے۔ اُس نے پوچھا۔ ''کیا مجھے ہیروئن امریکہ لے جانا ہوگی......؟''

''ہیروئن نہیں لے جاؤ گی بلکہ ہم جس دولت مند شخص سے شادی کرنے کے لئے کہیں گی، اُس سے شادی کرو گی۔'' شہناز بٹ نے کہا۔

''اُس شخص سے شادی کرنے کے بعد میں کس طرح سے اُس کی دولت میں سے آپ کو حصہ دے سکتی ہوں؟'' فریدہ نے حیرت سے پوچھا۔

''بیوہ ہونے کے بعد......'' شہناز بٹ نے کہا۔ ''تم اُس دولت مند شخص سے شادی

کرنے کے چار پانچ ماہ کے بعد بیوہ ہو جاؤ گی۔''

''کیا وہ شخص دل کا مریض ہے؟ کیا وہ کسی ایسے مرض میں مبتلا ہے کہ زیادہ دنوں تک زندہ نہ رہ سکے؟'' فریدہ نے پوچھا۔

''نہیں...... وہ مریض نہیں ہے۔ اُس کا ایک دشمن ہے۔ اُس نے اپنے دشمن کی بہن سے شادی کرنے کے بعد اُسے طلاق دے دی۔ اس وجہ سے اُس لڑکی کا بھائی اُس کا دشمن بن گیا۔ ایک مرتبہ اُس پر قاتلانہ حملہ کیا جس میں وہ بچ گیا۔ وہ آج کل جیل میں ہے۔ دو تین مہینے کے بعد رہا ہونے والا ہے۔ وہ رہا ہوتے ہی اُسے موت کی نیند سلا دے گا۔ اس طرح تم بیوہ اور اُس کے اثاثوں کی مالک بن جاؤ گی۔ پھر تم ہمیں اُس میں سے نصف حصہ دو گی......؟'' اُس سے یہ سب کچھ جھوٹ کہا گیا۔

فریدہ نے چند ثانیوں تک سوچنے کے بعد کہا۔ ''مجھے یہ سودا منظور ہے۔'' میں تمام اثاثوں میں سے نصف حصہ آپ کو دے دُوں گی۔''

آپ دونوں کو مردوں سے سخت نفرت ہے۔ اس لئے آپ دونوں آپس میں گہری سہیلیاں اور ایک دوسرے کی تنہائی کی بہترین ساتھی ہیں۔ انہی تنہائیوں کو حسین اور رنگین بنانے کے بعد نوجوان اور حسین لڑکیوں سے دوستی کرتی ہیں۔ فریدہ تین تین دن باری باری آپ دونوں کی تنہائی کی بہترین رفیقہ بنی رہی۔ یہ سب کچھ اُس کے لئے نیا اور حیرت ناک تھا۔ لیکن وہ اس لئے آپ دونوں کے رحم وکرم پر رہی کہ آپ دونوں نے اُس کے تابناک مستقبل کی ضمانت دی تھی اور وہ اپنے خوابوں کو پانے کے لئے بہت دُور تک جانے کے لئے تیار بھی تھی۔ پھر اُسے شراب کا بھی عادی بنا دیا گیا۔ وہ آپ دونوں کے لئے ایک بہترین اور پُر جوش ساتھی تھی۔ ایک روز آپ نے اُسے وی سی آر پر ایک فلم دکھائی تو وہ بھونچکی سی رہ گئی۔ اُسے اپنی نظروں پر یقین نہیں آیا۔ اُس نے پہلے تو اسے خواب سمجھا، لیکن یہ خواب نہیں حقیقت تھی۔ وہ رنگ دار فلم تھی۔ تین اوباش مردوں پر باری باری وہ فیاضی کا مظاہرہ خود سپردگی اور پُر جوش انداز سے کر رہی تھی۔ وہ پوری طوائف بنی ہوئی تھی۔ آپ دونوں نے شراب میں اُسے بے ہوشی کی دوا ملا کر پلا دی، پھر اُسے ایک ایسا انجکشن دیا گیا جس سے وہ ہوش میں آ گئی لیکن اپنی یادداشت سے محروم رہی۔ پھر اُسے تین شکاریوں کے آگے ڈال دیا گیا۔ یہ سب کچھ ایک منصوبے کے تحت کیا گیا۔ فریدہ کے

بارے میں پہلی بار یہ گھناؤنی حرکت نہیں کی گئی تھی۔ آپ دونوں دولت کے حصول کے لئے کتنی ہی لڑکیوں کو اسی طرح شکار کر کے اُنہیں بلیک میل کر کے دولت کھا رہی ہیں۔ ان غلاظتوں کی اور آپ دونوں کی گھناؤنی حرکتوں کی ویڈیو فلمیں اس گھر کی الماریوں میں موجود ہیں جس سے اُن بدنصیب لڑکیوں کو بلیک میل کیا جاتا ہے۔ آپ دونوں کالی دنیا کی باسی ہیں...... آپ دونوں کا چہرہ کالی لکیروں سے سجا ہوا ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ دونوں اب قدرت کے قانون سے بچ نہیں سکتی ہیں۔ جتنے قتل کئے ہیں، اُن کی سزا ملنے والی ہے۔ آپ جلد ہی کیفر کردار کو پہنچ جائیں گی۔''

شہناز بٹ اور بیگم شاہد میری باتیں غور سے سنتیں بھی جا رہی تھیں اور حیرت اور خوف سے ایک دوسرے کی شکل بھی دیکھتی جا رہی تھیں۔ میں اُن کا کچا چٹھا کھولتا جا رہا تھا۔ وہ دونوں اپنے اپنے دل میں حیران، پریشان اور ہراساں تھیں کہ یہ سب کچھ میرے علم میں کیسے اور کیونکر آ گیا ہے۔ کیونکہ ان میں سے ایک بات بھی غلط نہ تھی۔ یہ کڑوا اور زہرناک سچ تھا جس کا نگلنا اُن کے بس کی بات نہیں تھی۔ چند لمحوں تک فضا پر گہرا سکوت چھایا رہا۔ وہ بُت بنی کھڑی تھیں۔ میری ان باتوں اور انکشاف نے اُن پر جیسے بجلی گرا دی تھی۔

''تم بہت ہی خطرناک اور شاطر آدمی ہو۔'' بیگم شاہد نے اپنے پرس سے ریوالور نکال کر مجھ پر تان لیا۔ اُس کی نال پر سائلنسر نصب تھا۔ ''سچ سچ بتاؤ کہ تمہیں یہ ساری باتیں کیسے معلوم ہوئیں...؟ کس نے بتائیں؟ تم تو مار آستین ہو۔'' بیگم شاہد کا لہجہ نفرت انگیز تھا۔

جھوٹ بولنے کے سوا چارہ نہیں تھا اس لئے میں نے کہا۔ ''فریدہ اور حمیرا چنا نے مجھے بتایا تھا۔ کچھ باتیں میں نے اپنے اندازے سے بیان کی ہیں۔''

''تم اُن دونوں کو کب سے اور کیسے جانتے ہو؟'' بیگم شاہد پھنکاری۔ ''تم جھوٹ بول رہے ہو۔ مجھے بیوقوف بنا رہے ہو۔''

''میں اُن دونوں کو دو ایک برس سے جانتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''آپ سے ملاقات ہونے سے کچھ دن پہلے اُن دنوں نے مل کر مجھے آپ دونوں کے بارے میں بتایا تھا۔ ایک اتفاق تھا کہ آپ سے حادثاتی طور پر ملاقات ہو گئی۔ آپ مجھے اپنے گھر لے آئیں۔ پھر آپ کو اچانک خیال آیا کہ کیوں نہ مجھے چودھری کے قتل میں پھنسا دیا جائے؟ میں نے چودھری صاحب کو ٹیلی فون پر خبردار کیا تھا کہ ہوشیار رہیں۔ آپ کو قتل کرنے کی سازش کی

جا رہی ہے۔ لیکن اُنہوں نے میری بات کو مذاق میں اُڑا دیا۔''

''لیکن تم نے تو مجھ سے کہا تھا کہ لاہور سے آ رہے ہو۔ تمہارا سامان سفر میں چوری ہو گیا۔ تم یہاں کسی دولت کو تلاش کر رہے تھے۔'' بیگم شاہد نے کہا۔ ''اب مجھ سے کہہ رہے ہو کہ تم فریدہ اور حمیرا چنا کو جانتے ہو......؟'' تمہاری کون سی بات صحیح ہے؟''

''ان باتوں کو چھوڑیں...... لیکن یہ سوچیں کہ میں نے جو کچھ کہا ہے کیا وہ غلط ہے؟'' میں نے کہا۔

''یہ تم سے کس نے کہہ دیا کہ ہم دونوں نے مل کر چودھری کو قتل کیا ہے؟ تمہارا اندازہ بالکل غلط ہے۔'' شہناز بٹ نے کہا۔

''آپ دونوں کا منصوبہ مجھے حمیرا چنا نے بتایا تھا۔'' میں نے جھوٹا تیر پھر چلایا۔ میں اُنہیں بتانا نہیں چاہتا تھا کہ میں یہ ساری باتیں اُن کے ذہن سے معلوم کر رہا ہوں۔ ''آپ نے اُسے اعتماد میں لے کر اپنی زندگی کی سب سے بڑی غلطی کی ہے۔''

''اُس حرام زادی، کمینی اور حرافہ نے ہمارا کیا منصوبہ تمہیں بتایا؟'' بیگم شاہد نے کہا۔ ''وہ ایسا ہرگز نہیں کر سکتی ہے۔''

''حمیرا چنا نے مجھے بتایا کہ آپ نے چودھری صاحب کو لاہور کی ایک مشہور و معروف اداکارہ اروما کا جھانسہ دیا کہ آپ دونوں اُسے فلیٹ پر لے کر صبح نو بجے پہنچ رہی ہیں، لہٰذا فریدہ چودھری کو رات کہیں اور بھیج دیں۔ چودھری صاحب آپ کے فریب میں آ گئے۔ آپ دونوں چودھری صاحب کے فلیٹ میں برقعے میں پہنچیں تاکہ دربان پہچان نہ سکے۔ چودھری صاحب کو بیڈ رُوم میں اسی ریوالور سے نشانہ بنایا۔ آپ نے ابھی صرف ایک فائر کیا تھا کہ چودھری صاحب ریوالور پر جھپٹے تو ریوالور فرش پر گر گیا جسے شہناز بٹ نے اُٹھا لیا، پھر پے در پے تین فائر کئے۔ ایک گولی سینے کے آر پار ہو گئی۔ دو گولیوں نے کھوپڑی میں سوراخ کر دیا۔ پھر آپ نے اُن کی الماری سے ایک لاکھ روپے نکال لئے۔''

وہ دونوں ششدر رہ گئیں۔ شہناز بٹ نے اپنی زبان خشک ہونٹوں پر پھیرتے ہوئے کہا۔ ''کیا تم یہ سب کچھ چھپ کر دیکھ رہے تھے؟''

''جی ہاں......'' میں نے سر ہلایا۔ ''میں اُسی وقت آیا تھا۔ باہر کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ مجھے ٹریفک جام ہونے کی وجہ سے دیر ہو گئی تھی۔ میں نے جھری میں سے سب کچھ دیکھا۔

پھر میں اُلٹے قدموں واپس آ گیا۔ حمیرا چنا مجھے اپنی گاڑی میں لے کر آئی تھی۔ وہ چودھری صاحب کو بچانا چاہتی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ چودھری صاحب کو قتل کیا جائے۔ کیونکہ چودھری صاحب اُسے دل کھول کر نواز رہے تھے۔ وہ چودھری صاحب کی مخبر تھی۔''

''وہ بھی مار آستین نکلی......'' شہناز بٹ دانت پیستی ہوئی بولی۔ ''اُسے بھی شوٹ کر دینا چاہئے۔''

''میں ایک بات اور بتاؤں کہ اُس نے نسیم جہاں کو حیدرآباد بھیج دیا ہے تاکہ چودھری صاحب کے قتل ہونے کی صورت میں اُسے نصف حصہ ملے۔ نسیم جہاں نے اُس سے وعدہ کیا ہے کہ وہ اُسے پچیس لاکھ روپے دے گی۔ اُسے حیدرآباد بھیجنے میں فریدہ کا بھی ہاتھ ہے۔ دونوں سوکنوں نے مل کر آپس میں ایک سمجھوتہ کر لیا ہے کہ کسی طرح آپ دونوں کا پتا کاٹا جائے۔''

''یہ سب کیا کھیل ہو رہا ہے راشدہ؟'' شہناز بٹ نے بیگم شاہد سے کہا۔ ''ساری بازی اُلٹ ہو گئی ہے۔''

''مجھے اب ایسا لگ رہا ہے کہ یہ سارا چکر اُس حرام زادی حمیرا چنا کا چلایا ہوا ہے۔'' بیگم شاہد پھنکاری۔ ''اُس نے اپنے مفاد کے لئے ہمارے احسانات کو بھی فراموش کر دیا۔ نمک حرام...ذلیل...کمینی۔ اُس نے ڈبل کراس کیا ہے۔ مجھے اُس سے ایسی اُمید نہ تھی۔''

''میں نے تم سے کئی بار کہا تھا کہ حمیرا چنا پر اندھا اعتماد مت کرو۔ لیکن تم نے میری ایک بات نہیں سنی۔'' شہناز بٹ بولی۔

''حمیرا چنا نے مجھے آپ دونوں کے بارے میں یہ بھی کہا ہے کہ آپ دونوں چڑیلیں ہیں۔ اذیت پسند ہیں۔ آپ دونوں نے اُسے مہینوں اس بری طرح نشانہ بنایا جیسے وہ انسان نہیں، کوئی حیوان ہو۔ طوائف زادی ہو۔ اُس نے اپنی زندگی میں آپ جیسی ظالم، سنگدل، خبیث، بدکردار عورتیں نہیں دیکھیں۔ آپ دونوں نے چڑیلوں کی طرح اُس کا خون چوسا۔ اُس کا بس نہیں چلا ورنہ آپ دونوں کو شوٹ کر دیتی...... آپ دونوں نے اُسے جو اذیتیں دی ہیں وہ آج بھی اُس کے لئے رُوح فرسا ہیں۔'' میں نے اتنا کچھ کہہ کر جیسے جلتی پر تیل گرا دیا تھا۔

''اچھا...... تو اُس طوائف کی اولاد نے ہمارے بارے میں یہ کہا؟ اُس کنجری نے

ہمارے خلاف غلط بیانی سے کام لیا......'' بیگم شاہد کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

''اب تم کیا کرو گی......؟ حمیرا چنا ہم سے بدلہ لینے کی پوری کوشش کرے گی۔ سانپ ہے سانپ...... اُس کا سر کچلنا ضروری ہو گیا ہے۔ تم نے سر نہیں کچلا تو وہ ڈس لے گی۔ پولیس کے پاس چلی جائے گی۔ ہمیں پھنسا دے گی۔'' شہناز بٹ بوکھلا کر بولی۔

''میں ابھی اور اسی وقت اُس کے پاس جا رہی ہوں تا کہ اُسے کسی نہ کسی طرح اع میں لے کر اُسے فریب دُوں، لالچ دُوں پوری طرح ورغلا لوں۔ پھر نسیم جہاں کو بلا لوں پھر دونوں کو قتل کر دُوں۔ زہر دے کر ہلاک کر دُوں تا کہ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری......

''لیکن تم فریدہ کا کیا کرو گی؟ وہ، حمیرا اور نسیم جہاں ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔'' شہناز بٹ نے کہا۔

''فریدہ ہمارے خلاف کوئی قدم نہیں اُٹھا سکتی کیونکہ ہمارے پاس اُس کی وڈیو فل ہے۔'' بیگم شاہد نے حقارت سے کہا۔

''اِس موذی کا کیا کرنا ہے جو اُن سب سے زیادہ خطرناک ہے؟ اِسے تو رتی ر بات کی خبر ہو چکی ہے۔'' شہناز بٹ تشویش سے بولی۔

بیگم شاہد نے اُس کے ہاتھ میں ریوالور تھما دیا۔ ''اسے تم نشانے کی زد میں رکھو، م دوسرا ریوالور لیتی آؤں۔''

شہناز بٹ نے ریوالور کا رُخ میری طرف کر لیا۔ میں بڑے اطمینان و سکون سے بڑے صوفے پر بیٹھ گیا۔ شہناز بٹ نے چونک کر حیرت سے میری شکل دیکھی کہ م موت سے بالکل بھی خوفزدہ نہیں ہوں۔ میرے اس سکون نے اُسے اور خوفزدہ کر دیا۔

چند لمحوں کے بعد بیگم شاہد اپنے کمرے سے نکل کر آئی تو اُس کے ہاتھ میں ایک ریوالور تھا جس کی نال پر سائلنسر لگا ہوا تھا۔ وہ اُسے اپنے پرس میں رکھتی ہوئی شہناز بٹ سے بولی۔ ''میں حمیرا چنا کے پاس جا رہی ہوں۔ چوکیدار کو ایک کام سے دو تین گھنٹے کے لئے بھیج رہی ہوں۔ اُس کی بیٹی اور بیوی رات سے گئی ہوئی ہیں، وہ شام کو آئیں گی۔ اسے......'' پھر وہ شہناز بٹ کے پاس جا کر اُس کے کان میں بولی۔ ''اسے تم کسی بہانے سے سرونٹ کوارٹر لے جاؤ اور ختم کر دو۔''

شہناز بٹ نے حیرت سے اُس کی شکل دیکھی۔ ''کیا اس کی لاش وہیں پڑی ر

گی؟'' اُس نے بیگم شاہد کے کان میں کہا۔ ''اسے قتل کرنا آسان ہے لیکن اس کی لاش ٹھکانے لگانا مشکل ہے۔ یہ کام کیسے ہو گا؟''

''تم اس کی پرواہ نہ کرو۔'' بیگم شاہد نے اُس کے کان میں سرگوشی کی۔ ''میں اُس کمینی سے نمٹ کر آ جاؤں، پھر ہم دونوں اس کی لاش ڈگی میں ڈال کر لے جائیں گی اور کسی ویرانے میں پھینک دیں گی۔ کراچی میں ویرانوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔ اسے ختم کر دینا ضروری ہے ورنہ یہ حرام زادہ ہمیں پھنسا دے گا۔ اس کی کسی بات کا اعتبار نہ کرنا۔''

''ٹھیک ہے...... جاؤ اور جلدی واپس آنے کی کوشش کرنا۔ میں اسے عالم بالا کی سیر کے لئے بھیج دُوں گی۔'' شہناز بٹ نے اُس کے کان میں کہا۔ ''ہم اس کی لاش جتنا جلد ٹھکانے لگا دیں اتنا ہی ہمارے حق میں اچھا ہو گا۔''

پھر بیگم شاہد تیزی سے باہر نکل گئی۔ میں انجان بنا بیٹھا رہا جیسے کچھ سنا ہی نہ ہو۔ تھوڑی دیر کے بعد گاڑی کے باہر نکلنے اور گیٹ کے بند ہونے کی آواز سنائی دی۔ شہناز بٹ نے دوپٹہ درست کرتے ہوئے اسے فرش پر گرا دیا، پھر اُسے اُٹھانے کے لئے جھکی۔ اُسے اس بات کا خوف نہیں تھا کہ میں اس موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے اُس کے ہاتھ سے ریوالور جھپٹ لوں گا۔ کیونکہ ہمارے درمیان نہ صرف چھ سات قدموں کا فاصلہ تھا بلکہ درمیان میں صوفے اور کرسیاں بھی تھیں۔ اُس نے دانستہ یہ حرکت کی تھی۔ اُسے اپنے بے حد کھلے گریبان کی نمائش کرنا تھی تا کہ میں اس ہیجان خیز نظارے کا اسیر بن جاؤں، پھر وہ مجھے فریب دے کر ختم کر دے۔

شہناز بٹ کی عمر گو تیس برس کی تھی۔ میں نے کبھی اُسے تنقیدی نظروں سے نہیں دیکھا تھا لیکن اب میری تنقیدی نظریں اُس کے چہرے اور سراپا کا جائزہ لینے پر مجبور تھیں۔ اس حرکت نے میرے جذبات میں ایک ہلچل سی مچا دی تھی۔ وہ بے حد سرخ و سفید رنگت کی ایک بھرپور عورت تھی۔ اُس میں اس قدر جنسی کشش تھی کہ وہ ایک زاہد کو بھی بہکا سکتی تھی۔ میں زاہد نہ تھا۔ رخشندہ پہلی عورت تھی جس نے مجھے اس دشت کی سیاحی پر مجبور کیا تھا۔ جب ایک مرتبہ پیر پھسل جاتا ہے اور آدمی غلاظت کے دلدل میں گر جاتا ہے تو پھر وہ اس میں سے نہیں نکل سکتا۔ کیونکہ جتنا نکلنے کی کوشش کرتا ہے اُتنا ہی دھنستا چلا جاتا ہے۔

میرے خیالات پراگندہ ہو رہے تھے۔ لیکن میں یہ جانتا تھا کہ یہ سراب ہے۔ اگر میں

ذہن پڑھنے کا علم نہ جانتا ہوتا تو شاید پھر غلاظت کے دلدل میں جا گرتا۔ میں نے عورت کو اپنی کمزوری نہیں بنایا تھا ورنہ میں رخشندہ اور اُس کے شوہر یگانہ کی پیشکش قبول کر کے اپنی راتیں رنگین کرتا رہتا، پھر شاداں کی کمزوری سے بھی فائدہ اُٹھا سکتا تھا۔ شہناز بٹ ایسی بھرپور عورت تھی کہ مرد بہک جائے۔ مگر یہ عجیب سی بات تھی کہ وہ اور بیگم شاہد مردوں کی بجائے نوجوان لڑکیوں کو ترجیح دیتی تھیں۔

شہناز بٹ نے مجھے خود سپردگی کی نظروں سے دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں خمار چھا گیا تھا، اُن میں جادو بھر گیا تھا۔ اُس کے سرخ گداز ہونٹ انجانی دعوت دے رہے تھے۔ وہ دوپٹہ سینے اور شانے پر درست کرتی ہوئی رسیلی آواز میں بولی۔ ''سالار! سرونٹ کوارٹر میں چلو......''

''وہ کس لئے؟'' میں نے انجان بن کر پوچھا اور اُس کی آنکھوں میں جھانکنے لگا۔ پھر میں جیسے ڈوب گیا۔

''اس لئے کہ ہم وہاں چل کر دو ایک گھڑی کے لئے کھو جائیں۔ ایک دوسرے میں ضم ہو جائیں۔ اُس نے لگاوٹ سے کہا۔

''لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے......؟'' میں نے اُس کے چہرے پر اپنی نگاہیں مرکوز کر دیں۔ ''یہ ایک ناممکن سی بات ہے۔''

''کیوں نہیں ہو سکتا......؟'' شہناز بٹ نے مصنوعی حیرت سے کہا۔ ''ہماری راہ میں ایسی کوئی رُکاوٹ نہیں ہے جو ناممکن ہو۔''

''آپ کی سہیلی تو آپ کے ہاتھ میں موت کا پروانہ تھما کر گئی ہیں کہ مجھے قتل کر دیا جائے۔ آپ دونوں کے نزدیک میں ایک موذی اور بے حد خطرناک شخص ہوں۔ یہ اچانک تبدیلی کیسی؟ آپ نے اپنا ارادہ کس لئے بدل دیا؟''

''بات یہ ہے کہ مجھے تمہاری جوانی پر رحم آ گیا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ تمہارے ساتھ دو ایک گھڑی گزار لوں، پھر تمہیں یہاں سے جانے دُوں۔''

''لیکن آپ کی فطرت اور ہے۔ آپ کو مردوں سے سخت نفرت ہے۔ آپ کی دوستی اور محبت حسین لڑکیوں تک محدود ہے۔''

''لیکن میں نے سوچا ہے کہ ایک عورت کا اصل دوست مرد ہی ہو سکتا ہے، عورت

نہیں۔ اب میرا دل لڑکیوں سے بھر گیا ہے۔''

''لیکن مجھے عورتوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ نہ میں انجانے راستے پر چلنا چاہتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''تم نے شاید یہ دنیا ابھی تک نہیں دیکھی ہے اس لئے ایسی باتیں کر رہے ہو۔ یہ دنیا ایسی حسین ہے کہ اس میں ایک بار جو داخل ہو جاتا ہے وہ اس میں سے نکل نہیں پاتا۔ چلو آؤ...... میں تمہیں اُس دنیا کی سیر کراؤں۔ اس سے آشنا کراؤں۔'' وہ وارفتگی سے بولی۔

''اگر ایسی بات ہے تو پھر بیگم صاحبہ کے بیڈ رُوم میں چلیں جو خصوصی طور پر آراستہ و پیراستہ ہے۔'' میں نے کہا۔

''سرونٹ کوارٹر زیادہ محفوظ ہے۔ کیونکہ یہاں راشدہ یا اُس کا کوئی ملاقاتی آ سکتا ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ راشدہ ہم دونوں کو ساتھ دیکھ لے۔''

''آپ صاف صاف یہ کیوں نہیں کہتی ہیں کہ میں تمہیں مقتل میں لے جانا چاہتی ہوں۔'' میں نے صاف گوئی سے کہا۔

''مقتل......؟'' وہ چونکی۔ اُس کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ پھر سنبھل کر بولی۔ ''یہ تم نے کیسے اندازہ کر لیا کہ وہ مقتل ہے؟ وہ عشرت کدہ ہے۔''

''سنئے محترمہ!'' میں نے تلخی سے کہا۔ ''کیا آپ مجھے بیوقوف سمجھ رہی ہیں جو میں آپ کے جسم کی نمائش اور باتوں اور فریب میں آ جاؤں؟ آپ کا منصوبہ یہ ہے کہ سرونٹ کوارٹر میں لے جا کر مجھے قتل کر دیں۔ پھر بیگم صاحبہ کے آنے کے بعد میری لاش ڈگی میں ڈال کر کسی ویرانے میں پھینک آئیں۔ میں نے آپ دونوں کی کانا پوسی کا ایک ایک لفظ سن لیا ہے۔ آپ دونوں مجھے اس لئے قتل کرنا چاہتی ہیں کہ کہیں میں آپ دونوں کے خلاف پولیس میں رپورٹ نہ کر دُوں۔ جبکہ اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ کیونکہ پولیس کو آپ دونوں کے خلاف جائے وقوعہ پر بہت بڑا ثبوت ملے گا۔ اس کے کارن آپ دونوں اندر ہو جائیں گی۔ عمر قید با مشقت یا پھانسی کی سزا ملے گی۔''

''کیسا ثبوت......؟ کون سا ثبوت......؟'' شہناز بٹ کی زبان لڑکھڑائی۔ ''ہم نے وہاں کوئی ثبوت نہیں چھوڑا۔ ایک تو ہم دونوں برقعے میں تھیں۔ پھر اتفاق سے اُس وقت چوکیدار مہتر سے اُلجھ رہا تھا اس لئے اُس نے ہم سے نہیں پوچھا کہ ہم کس سے ملنے جا رہی

ہیں۔ اس بلاک کے زینے اور لفٹ پر بھی کوئی موجود نہیں تھا۔ اور پھر ہم دونوں نے
اُس چیز پر سے اپنی اُنگلیوں کے نشانات مٹا دیئے جنہیں چھوا گیا تھا۔ لہٰذا ہمارے خلاف
پولیس کو کوئی ثبوت مل ہی نہیں سکتا۔''

''وہ کیا ثبوت ہے، بعد میں بتاؤں گا۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن میں ایک ایسی بات آپ
کو بتانا چاہتا ہوں جس کے بارے میں آپ نے وہم و گمان میں بھی نہیں سوچا ہوگا، وہ
بھی نہیں سکتی ہیں۔ جب آپ کو علم ہوگا تو آپ اس کا یقین نہیں کریں گی۔''

''وہ کون سی ایسی بات ہے؟'' شہناز بٹ بری طرح چونکی۔ اُس کے چہرے پر حیرت
چھا گئی۔

''وہ یہ کہ حمیرا چنا، نسیم جہاں، بیگم صاحبہ اور فریدہ چودھری آپس میں ملی ہوئی ہیں۔ بیگم
شاہد نے آپ کا پتا کاٹنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔''

''یہ جھوٹ ہے...... تم مجھے بیگم شاہد کے خلاف بدظن کر رہے ہو۔ لیکن میں تمہاری
باتوں میں آنے والی نہیں ہوں۔''

''یہ حقیقت ہے کہ ایک ماہ سے بیگم صاحبہ آپ سے نفرت کرنے لگی ہیں۔ دوستی نفرت
میں بدل گئی ہے۔'' میں نے کہا۔

''تم میرے دل میں اُس کے لئے بدگمانی پیدا کرنے کی حماقت نہ کرو۔ ہم دونوں
کے درمیان نفرت پیدا ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' شہناز بٹ نے ریوالور لہراتے
ہوئے کہا۔ ''تم اپنی جان بچانے کے لئے بکواس کر رہے ہو۔ تمہاری یہ کوشش فضول
ہے۔ ایسی کوئی بات ہم دونوں کے درمیان نہیں ہوئی جس سے ہماری دوستی اور محبت پر
حرف آئے۔''

آپ نے ایک لڑکی نادیہ سے دوستی کی تھی جو پندرہ برس کی تھی۔ وہ لندن سے آئی
ہوئی تھی۔ اُس سے آپ کی ملاقات ایک تقریب میں ہوئی تھی۔ آپ نے اُسے رات کے
کھانے پر اپنے فلیٹ پر مدعو کیا تھا۔ وہ بڑی بھرپور اور حسین لڑکی تھی۔ بیگم صاحبہ اُسے دیکھ
کر بھڑک اُٹھی تھیں۔ بیگم صاحبہ بھی اُس ڈنر پر مدعو تھیں۔ آپ نے بیگم صاحبہ سے کہا
یہ میرا شکار ہے۔ پہلے میں اسے شیشے میں اُتار لوں، پھر تمہاری اس سے دوستی کرادوں گی۔
چھ سات دن تک آپ دونوں ایک دوسرے پر مہربان رہیں۔ آٹھویں دن وہ اچانک لندن

چلی گئی جس کا آپ کو بہت دُکھ ہوا۔ آپ سے زیادہ دکھ تو بیگم صاحبہ کو ہوا۔ آپ نے ایک
دن کے لئے بھی اُسے بیگم صاحبہ سے نہیں ملایا۔ انہیں آپ سے اس خودغرضی کی ذرہ برابر
بھی اُمید نہیں تھی۔ آپ نے اُن کا دل توڑ دیا۔ آپ دونوں کی محبت جو آئینے کی طرح
صاف وشفاف تھی اس میں بال آ گیا۔ وہ لڑکی اُن کے دل و دماغ پر چھا گئی تھی۔ اور پھر
آپ نے اُن سے جو بیس ہزار کی رقم قرض لی وہ لوٹائی نہیں۔ اور پھر اس لئے بھی وہ آپ
کا پتا کاٹنا چاہتی ہیں کہ آپ پورے بیس لاکھ کا حصہ مانگ رہی ہیں۔ اس لئے بیگم شاہد
نے آپ کو قتل کے الزام میں پھنسانے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ وہ حمیرا چنا کو ختم کرنے نہیں بلکہ
آپ کے خلاف سازش کرنے گئی ہیں۔'' میں نے کہا۔

''مجھے تمہاری باتوں پر اعتبار نہیں۔ تم جھوٹ بول رہے ہو۔ اندھیرے میں تیر چلا
رہے ہو۔'' شہناز بٹ زہرخند سے بولی۔

''کیا نادیہ نامی لڑکی سے آپ کے چھ سات دن تعلقات نہیں رہے؟ کیا وہ ایک
مہربان لڑکی ثابت نہیں ہوئی تھی؟''

''تمہیں نادیہ کے بارے میں کس نے بتایا...... ؟ ہاں یہ بات تو بالکل سچ ہے۔ میں
خودغرض بن گئی تھی۔ کیونکہ ایسی لڑکیاں بار بار ہاتھ نہیں لگتی ہیں۔ وہ بڑی فیاض قسم کی لڑکی
تھی۔ میں اُسے کبھی نہیں بھول سکتی۔'' اُس نے سرد آہ بھری۔

''بیگم صاحبہ نے کل رات مجھے آپ کے بارے میں بتایا تھا۔ وہ میرے کمرے میں آ
گئی تھیں اور رات کے آخری پہر تک رہی تھیں۔ اُنہوں نے شراب کے نشے میں آپ کے
بارے میں بہت کچھ بتایا۔ اُنہوں نے یہ بھی بتایا کہ آپ دو مرتبہ جیل کی ہوا کھا چکی ہیں،
کیونکہ آپ نے ایک جنرل سٹور کے مالک کو لڑکی کا جھانسہ دے کر اُس سے ایک لاکھ
روپے ہتھیا لئے تھے۔ دوسری مرتبہ اس لئے جیل گئی تھیں کہ آپ نے ایک یونیورسٹی کی
طالبہ کو ایذائیں پہنچائی تھیں۔ اُس پر تشدد کر کے من مانی کی تھی۔''

میری یہ باتیں غلط نہ تھیں اور نہ بیگم شاہد نے کہی تھیں۔ یہ باتیں میں نے اپنے ذہن
کی رسائی اُس کے ذہن سے کر کے کہی تھیں۔

''حیرت کی بات ہے کہ راشدہ نشے کی حالت میں بہک گئی...... خیر، کوئی بات نہیں۔
میں صفائی پیش کر کے اُسے منالوں گی۔ میرے خلاف اُس کے دل میں جو نفرت اور

کثافت بھر گئی ہے اُسے اپنے پیار سے دھوڈالوں گی۔'' شہناز بٹ نے کہا۔

''بہت مشکل ہے۔ آپ اُسے جانتی ہیں کہ وہ کس فطرت اور قماش کی عورت ہے۔ میں نے اُسے بھڑکایا۔'' وہ اب آپ کی سخت جانی دشمن بن گئی ہے۔ اور ایک ثبوت کی رو سے وہ آپ کو چودھری کے قتل کیس میں پھنسارہی ہے۔''

''وہ کیا ثبوت ہے؟ جلدی سے مجھے اس کے بارے میں بتاؤ!'' شہناز بٹ نے بیتابی سے پوچھا۔

''وہ ثبوت آپ کا پرس ہے جس میں آپ کا شناختی کارڈ، ڈرائیونگ لائسنس، سات ہزار کی رقم اور ایک نوٹ بک بھی ہے جس میں جرائم پیشہ افراد کے ٹیلی فون نمبر لکھے ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ اس میں ایک چھوٹا سا آٹومیٹک پستول ہے جس کا لائسنس نہیں ہے۔ میں نے اُس کے چہرے پر نگاہیں مرکوز کر کے جواب دیا۔

''لیکن میرا پرس تو راشدہ کے پاس ہے۔ بھلا یہ کیا ثبوت ہوا؟'' شہناز بٹ نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''تم نے میرا پرس چیک کیا تھا کیا؟''

''آپ کا پرس جائے واردات پر ہے، راشدہ کے پاس نہیں...... آپ کی سہیلی آپ کی نظریں بچا کر پرس کو تپائی پر رکھ دیا تھا تاکہ آپ کا دھیان اس کی طرف نہ جاسکے آپ چودھری صاحب کو شوٹ کرنے کے بعد بدحواس ہوگئی تھیں۔ آپ کو اپنے پرس کا خیال بھی نہیں رہا تھا۔ اور پھر بیگم صاحبہ جلدی سے آپ کو وہاں سے لے کر نکل گئی تھیں۔''

''اُس نے یہ حرکت کیوں اور کس لئے کی......؟'' شہناز بٹ اُلجھ کر بولی۔ ''میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آرہا ہے۔''

''اس لئے کہ آپ کو میرے اور چودھری صاحب کے قتل کے الزام میں پھنسا سکے۔'' میں نے کہا۔

''نہیں...... وہ ایسا نہیں کر سکتی۔'' وہ ہذیانی لہجے میں بولی۔ ''قتل کرنے میں وہ بھی شامل ہے۔ پہلی گولی اُسی نے چلائی تھی۔''

''کچھ دیر کے بعد پولیس یہاں آنے والی ہے تاکہ آپ کو قتل کے کیس میں آلۂ قتل سمیت پھنسا دے۔ اس ریوالور سے چودھری صاحب کو قتل کیا گیا...... اب اس ریوالور پر بیگم صاحبہ کے نہیں، آپ کی اُنگلیوں کے نشانات ہیں۔'' میں نے کہا۔

''راشدہ ایسی حماقت نہیں کر سکتی کہ وہ پولیس کو یہاں بھیج دے۔ کیونکہ یہ اس کا گھر ہے اور وہ بھی قاتلہ ہے۔ اس جرم میں برابر کی شریک ہے۔ اگر اُس نے مجھے پھنسانے کی کوشش کی تو میں اُسے بخشوں گی تھوڑی......'' وہ زہرخند بولی۔

''پولیس زبانی نہیں بلکہ ٹھوس ثبوت پر بھروسہ کرتی ہے۔ آپ کے خلاف ایسے شواہد ہیں کہ آپ انہیں جھٹلا نہیں سکتی ہیں۔ یہ آلۂ قتل ہے۔ یہ ایک ایسا ثبوت ہے کہ جس پر آپ کو پھانسی کی سزا ہوسکتی ہے، بیگم صاحبہ کا بال تک بیکا نہیں ہوگا۔ بیگم صاحبہ نے آپ کے خلاف بڑی شاطرانہ چال چلی ہے۔''

شہناز بٹ کا چہرہ فق ہوگیا۔ اُس نے دہشت زدہ ہو کر ریوالور فرش پر پھینک دیا۔ اس لمحے وہ نہ صرف بہت بری طرح اُلجھ گئی بلکہ ہراساں اور پریشان ہوگئی تھی۔ اُس کا ذہن ماؤف ہوگیا تھا۔ اُسے میری بات کا یقین آگیا تھا۔ یہ سچ تھا کہ بیگم شاہد نے اُس کا پرس تپائی پر رکھ دیا تھا تاکہ وہ اُس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر نہ جائے۔ لیکن نکلتے وقت چونکہ وہ سراسیمہ سی تھی اس لئے پرس لینا بھول گئی۔ اُس نے دانستہ پرس وہاں نہیں چھوڑا تھا۔ میں نے جو تیر چلایا تھا وہ ٹھیک نشانے پر جالگا تھا۔ وہ بدحواس سی ہو کر دروازے کی طرف بڑھی تو میں نے کہا۔ ''آپ مجھے قتل کئے بغیر جارہی ہیں؟''

''میں بیوقوف نہیں ہوں جو تمہیں قتل کر کے پھنس جاؤں...... میں اُس کمینی سے نمٹنے جارہی ہوں۔ اس سے پہلے کہ وہ پولیس میں جا کر میرے خلاف رپورٹ درج کرائے میں اُسے ختم کر کے فرار ہو جاؤں گی۔ لاؤ...... یہ ریوالور مجھے دے دو تاکہ اس ریوالور سے اُس کی جان لے لوں۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ کمینی اس وقت کہاں ہوگی؟'' وہ نفرت بھرے لہجے میں بولی۔

میں نے فرش سے ریوالور اُٹھا کر اُس کی طرف اُچھال دیا جو اُس نے فوراً ہی فضا میں پکڑ لیا۔ وہ ریوالور لے کر بیڈ رُوم میں چلی گئی۔ چند لمحوں کے بعد باہر نکلی تو اُس نے ریوالور تولیے میں لپیٹا ہوا تھا۔ پھر وہ باہر کی طرف لپک گئی۔ چند لمحوں کے بعد گاڑی کے اسٹارٹ ہونے کی آواز سنائی دی، پھر ایک دم سناٹا سا چھا گیا۔ میں نے برآمدے میں جا کر دیکھا، گیٹ پورا کھلا ہوا تھا۔ سراسیمگی میں وہ گیٹ کھلا چھوڑ گئی تھی۔ میں نے جا کر گیٹ بند کیا، پھر اندر آ گیا۔

بیگم شاہد کسی بھی لمحے میری لاش ڈگی میں ڈال کر لے جانے کے لئے آسکتی تھی۔ لیکن میں نے تو یہاں نقشہ ہی پلٹ کر رکھ دیا تھا۔ اُس کی ساری بساط اُلٹ دی تھی۔ شہناز بٹ کو اس کے خلاف اُکسا اور بہکا دیا تھا۔ اُس کے دل میں بیگم شاہد کے خلاف ایسی بدگمانی پیدا کر دی تھی کہ وہ نفرت زہر کی طرح اُس کی رگ رگ میں سرایت کر گئی تھی۔ ایسی غلط فہمی کی دیوار کھڑی کر دی تھی جو دشمنی کی صورت اختیار کر گئی تھی۔ اب تو محبت کی رمق بھی اُس کے دل میں نہیں رہی تھی۔

اگر میں شہناز بٹ کو اُلجھاتا اور ہراساں نہیں کرتا تو وہ مجھے قتل کر دیتی۔ وہ مجھے اپنی ہیجان خیزی کا فریب دے کر سرونٹ کوارٹر میں لے جا رہی تھی۔ جبکہ بیگم شاہد نے اُس سے اور میرے سامنے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ میں ایک خطرناک شخص ہوں۔ میری زندگی ان کے لئے پریشانی کا باعث ہے۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ میں شہناز بٹ کے فریب میں آ جاتا؟

اب میرے لئے یہاں رُکنا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ میرے لئے ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔ لیکن میں جانے سے پہلے گندگی اور غلاظت کو صاف کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اُس الماری کی چابی سنگھار میز میں رکھی ہوئی کریم کی شیشی میں سے نکالی جس میں بیگم شاہد نے ویڈیو فلم کیسٹ رکھے ہوئے تھے۔ جن سے وہ فریدہ چودھری اور دوسری لڑکیوں کو بلیک میل کر رہی تھی۔ میں نے الماری کا خفیہ خانہ کھولا۔ اُس میں کوئی پندرہ عدد ویڈیو کیسٹ تھے۔ ایک لفافہ بھی تھا جس میں تصویریں اور اُن کے نیگیٹوز تھے۔ بیس ہزار کی رقم بھی تھی اُس نے زیورات وغیرہ لاکرز میں رکھ دیئے تھے ورنہ وہ بھی ہاتھ لگ جاتے۔ میں نے رقم جیب میں رکھ لی، وہ لفافہ اور کیسٹ لے کر اپنے کمرے میں آیا، اُنہیں سوٹ کیس میں رکھا، پھر کچھ دیر بعد بنگلے سے باہر آیا۔ اتفاق سے ایک خالی ٹیکسی گزر رہی تھی، اُسے روک کر اُس میں سوار ہو گیا۔ جس وقت ٹیکسی گلی سے نکل رہی تھی، مخالف سمت سے بڑی تیزی سے بیگم شاہد کی گاڑی داخل ہوئی اور ٹیکسی کے پاس سے گزر گئی۔ اُس نے مجھے نہیں دیکھا وہ متوحش اور ہونق سی لگ رہی تھی۔ حمیرا اچنا، نسیم جہاں اور فریدہ چودھری میں سے کسی سے اُس کی ملاقات نہ ہو سکی تھی جس کی وجہ سے وہ سخت پریشان اور ہراساں ہو رہی تھی۔

میں نے کینٹ اسٹیشن آ کر ایک درمیانہ درجے کے صاف ستھرے ہوٹل میں ایک کمرہ کرایہ پر لیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک ایک کیسٹ سے فلم نکال کر چھوٹی قینچی سے ان کے

چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر دیئے۔ پھر میں نے وہ ساری تصویریں بھی پرزے پرزے کر دیں جو شرمناک تھیں۔ پھر ان کے نیگیٹوز کے ساتھ بھی یہی حشر کیا۔ سہ پہر کے وقت انہیں ایک بڑے شاپنگ بیگ میں رکھ کر ہوٹل کے باہر جو کوڑے کرکٹ کا ڈھیر تھا اُس میں ڈال آیا۔

دوسرے دن صبح کا اخبار خریدا۔ اُس میں نثار چودھری کے قتل اور بیگم شاہد اور شہناز بٹ کی گرفتاری کی سنسنی خیز خبر تھی۔ ان دونوں کی تصویروں کے علاوہ مقتول، نسیم جہاں اور فریدہ چودھری کی تصویریں بھی چھپی ہوئی تھیں۔ مجھے خوشی ہوئی کہ بیگم شاہد اور شہناز بٹ گرفتار ہو گئیں۔

میں ناشتہ کر کے اُس اخبار کے دفتر پہنچا جس میں، میں نے اپنا اشتہار شائع کرایا تھا۔ مجھے بڑی اُمید تھی کہ کسی نہ کسی نے خط لکھا ہوگا۔ لیکن ایک خط بھی میرے نام نہیں آیا تھا میں دُکھی سا ہو کر ایک قریبی ہوٹل میں جا کر بیٹھ گیا۔ چائے پیتے ہوئے اپنے بارے میں سوچنے لگا آخر میں ہوں کون......؟ کیا ہوں......؟ میں اپنی یادداشت سے کیسے اور کیونکر محروم ہو گیا؟ کتنی عجیب، ناقابل یقین اور حیرت انگیز بات ہے کہ میرا ذہن کسی کے بھی ذہن کی رسائی اور اُس کی ساری یادداشت حاصل کر لیتا ہے لیکن میری یادداشت کیوں میرے ذہن کی دسترس سے باہر ہے؟ وہ خانہ کیوں بند ہے جو باوجود لاکھ کوشش اور جتن کے اپنی یادداشت نہ پا سکا۔

میں نے اس فکر اور سوچ بچار میں تین کپ چائے پی لی۔ پھر میں اُٹھا، بل ادا کر کے ہوٹل سے باہر آیا۔ یہ ڈیفنس کا علاقہ تھا۔ میں پیدل ہی چل پڑا۔ میں اُن بنگلوں اور کوٹھیوں کو دیکھتا جا رہا تھا جو محل نما تھیں۔ بہت ہی خوبصورت اور شاندار قسم کے مکانات تھے۔ ایسے مکانوں میں کروڑ پتی ہی رہ سکتے تھے۔ اور پھر ان کے اندر اور باہر جو گاڑیاں کھڑی تھیں، وہ لاکھوں سے کیا کم ہوں گی۔ بالکل نئی اور خوبصورت تھیں۔ ان مکانوں پر ریٹائرڈ فوجیوں کے ناموں کی تختیاں لگی ہوئی تھیں۔ کوئی کیپٹن تو کوئی بریگیڈیئر، میجر اور جرنل رہ چکا تھا۔ مجھے ان کی زندگی، گاڑیوں اور ان کے عالیشان مکانوں کو دیکھ کر بڑا رشک آیا۔ پھر میں دوسری گلی میں آ گیا۔ یہاں کچھ گھر غیر فوجیوں کے بھی تھے۔

میں چلتے چلتے ایک بہت ہی خوبصورت اور پُرشکوہ کوٹھی کے سامنے ٹھٹک کر رُک گیا۔ جس پر شہریار رضا نام کی تختی لگی ہوئی تھی۔ مجھے کچھ ایسا لگا کہ یہ نام کچھ مانوس سا ہے۔ میں

نے اپنی یادداشت پر زور ڈالا، لیکن وہ خانہ بند تھا۔ اندھیرا تھا۔ کچھ یاد نہیں آیا۔ اب ایک صورت رہ جاتی تھی کہ میں شہر یار رضا صاحب سے بالمشافہ ملوں۔ وہ مجھے دیکھ کر پہچا لیں، مجھے میرے بارے میں بتائیں یا میں ان کے ذہن کے توسط سے اپنے بارے م بہت کچھ معلوم بھی کر سکتا ہوں۔

میں سوچ رہا تھا کہ ان صاحب سے کیسے ملوں؟ کس طرح رابطہ کروں؟ ایک ن ماڈل کی ٹویوٹا کرولا گاڑی گیٹ پر آ کر رُکی۔ اُس میں سے ایک عورت اُتری۔ اُس گاڑ میں صرف وہی ایک تھی۔ میں نے اُسے تنقیدی نظروں سے دیکھا۔ وہ چھیالیس سینتالیس برس کی دراز قد عورت تھی۔ سفید ساڑھی اور بغیر آستینوں والے بلاؤز میں ملبوس تھی۔ ا عمر میں بھی اُس کے چہرے پر نوجوان لڑکیوں کی تازگی، دل کشی اور جاذبیت تھی۔ اُ کے بال گردن تک نفاست سے ترشے ہوئے تھے۔ اُس کے گلے میں سونے کی چین ت اور کانوں میں جڑاؤ آویزے جھلملا رہے تھے۔ اُس کی آنکھیں بڑی، سیاہ اور خوبصور تھیں۔ چہرے کے نقش و نگار میں تیکھا پن تھا۔ دراز قد کی وجہ سے اُس کے سڈول ا بھرے بھرے جسم کی کشش بڑھ گئی تھی۔ اُس میں ایک تمکنت بھی تھی۔

"کون ہو تم......؟" اُس عورت نے مجھے نیچے سے اُوپر تک مشکوک نظروں ۔ دیکھا۔ "یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"جی......جی......میں کام کی تلاش میں نکلا ہوں۔ مجھے کام چاہئے۔" میں گھبرا سا گ

"تمہیں کام چاہئے......؟" عورت نے ایک لمحے کے لئے سوچا۔ "ایک کام ہ شاید وہ تم کر لو۔"

"کیا کام ہے جی......؟" میں نے نوکروں کے انداز میں پوچھا۔

"تم اندر چلو......میں بتاتی ہوں۔" اُس نے جواب دیا۔ اس لمحے وہ عورت مجھے ب پراسراری لگی۔

OOO

میں اُس عورت کے ساتھ نشست گاہ میں پہنچا۔ نشست گاہ میں اُس کا بیٹا نوید جو بائیس برس کا ہوگا، ٹیلی فون پر کسی سے بات کر رہا تھا۔ اُس کی وضع قطع اور چہرہ مہرہ ہپیوں جیسا تھا۔ اُس کے لمبے بال گردن سے نیچے اُتر کر کندھوں کو چھو رہے تھے اور جھالروں کی طرح لٹک رہے تھے۔ اُس کی فرنچ کٹ داڑھی تھی۔ اُس کی مونچھیں، داڑھی میں ڈوبی ہوئی تھیں اور باہر نظر آتی تھیں۔ اُس کا لباس عجیب وغریب اور مضحکہ خیز تھا۔ جینز کی پتلون جس پر شکنوں کا جال تھا۔ اُس کی ٹی شرٹ پیلے رنگ اور ریشمی کپڑے کی تھی۔ ایسے شوخ رنگ کے کپڑے نوجوان لڑکیاں پہنتی ہیں، خصوصاً نچلے طبقے اور دیہات وغیرہ میں...... اُس پر کسی جنگلی کا دھوکہ ہوتا تھا۔ وہ انگریزی میں بات کر رہا تھا۔ اُسے گھر والے نومی کہہ کر پکارتے تھے۔

اس عورت کی لڑکی کا نام تو شگوفہ تھا لیکن اُسے بے بی کہتے تھے۔ بے بی اٹھارہ برس کی ہو چکی تھی لیکن وہ گھر والوں کی نظروں میں بے بی ہی تھی۔ اُس کی سہیلیاں، دوست لڑکے اور رشتہ دار اُسے بے بی ہی کہتے تھے۔ وہ ایک حسین وجمیل، نازک اندام اور بے حد پُرکشش سراپا کی مالک تھی۔ انگ انگ سے مستی اُبلی پڑتی تھی۔ جوانی کے خمار نے اُسے قیامت بنا دیا تھا۔ اُس کے جسم میں ایک بھرپور عورت کا سا رسیلا پن تھا۔ دودھیا رنگت تھی۔ ہاتھ پیر اور اُس کی مرمریں بانہیں جو بغیر آستینوں کی ٹی شرٹ میں بے نیام تھیں مکھن کی طرح لگ رہی تھیں۔ اُس کی ٹی شرٹ نے اُسے بے حجاب کر دیا تھا۔ گریبان خطرناک حد تک کھلا ہوا تھا۔ جسم کی نمائش ہو رہی ہے، اُسے اس کی پرواہ نہیں تھی۔ ماں اور جوان بھائی اور اُس کے باپ کو فکر اور پرواہ نہیں تھی۔ اُس نے بھی جینز پہن رکھی تھی۔ برگر فیملی میں بے حجابی بھائی بہنوں اور والدین کی نظروں میں کھٹکتی نہیں ہے۔ وہ بیویوں، بہنوں اور بیٹیوں کے جسمانی نشیب وفراز اور خطوط دیکھ کر خوش ہوتے ہیں کہ وہ کس قدر

اور بے پناہ پُرکشش ہیں۔

بے بی نے پہلے تو مجھے حیرت سے دیکھا، پھر اپنی ممی کی طرف سوالیہ نظروں سے اُس عورت نے جس کا نام مہرین تھا اُس نے مجھ سے پوچھا۔ ''تمہارا نام کیا ہے؟''

''میرا نام سالار ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''یہ بتاؤ کہ تم کیا کیا کام جانتے ہو......؟'' بیگم مہرین نے میرے چہرے پر نظر مرکوز کر دیں۔

''میں گاڑی چلا سکتا ہوں، سودا سلف لا سکتا ہوں۔'' میں نے بتایا۔

''پڑھے لکھے ہو......؟ کیا تم انگریزی اور اُردو لکھ پڑھ سکتے ہو......؟'' بیگم مہرین سوال کیا۔

''جی ہاں...... ساتویں جماعت تک پڑھا ہوں۔ انگریزی ہجے کر کے پڑھ سکتا ہوا بول نہیں سکتا نہ سمجھ سکتا ہوں۔ البتہ دیکھ کر لکھ سکتا ہوں۔ اُردو پڑھ سکتا ہوں۔ ساتو جماعت کی تعلیم کیا ہوتی ہے جی ...''

''تمہارے پاس ڈرائیونگ لائسنس ہے؟ شناختی کارڈ وغیرہ؟'' بیگم مہرین نے پوچھ

''میرے پاس دونوں چیزیں تھیں۔ تین دن پہلے میری جیب کٹ گئی۔ بٹوے میں دونوں چیزیں تھیں۔''

''چلو...... کوئی بات نہیں۔ میں تمہارا ڈرائیونگ لائسنس اور شناختی کارڈ بنوا دوں گی۔ بیگم مہرین نے کہا۔ ''میرے پاس ایک ڈرائیور کی جگہ خالی ہے، وہ تمہیں دے سکتی ہوں۔ وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

''آپ کا بہت بہت شکریہ...... مجھے یہ ملازمت منظور ہے۔'' میں نے خوشی کا اظہ کیا۔ ''تنخواہ کیا ہوگی؟''

''دو ہزار روپے ماہانہ...... تینوں وقت کا کھانا اور دو وقت چائے ملے گی۔'' وہ بولی۔

''مناسب ہے جی...... دو تین مہینے کے بعد بڑھا دیں۔'' میں نے کہا۔ ''اس مہنگا میں دو ہزار بہت کم ہیں۔''

''کیا تم شادی شدہ ہو......؟ تمہارے بیوی بچے کہاں ہیں......؟''

''شادی شدہ نہیں ہوں۔ مگر میرے گھر والے ہیں۔ میں اکیلا کمانے والا ہوں۔''

نے کہا۔

''لیکن پھر ایک شرط ہے۔ وہ تم مان لو تو اس صورت میں ملازمت مل سکتی ہے۔''

''مجھے آپ کی ہر شرط منظور ہے جی......'' میں نے کہا۔ ''آپ جو حکم دیں گی، وہ بجا لاؤں گا۔''

''میری شرط یہ ہے کہ تمہیں دن رات یہاں رہنا ہوگا۔'' بیگم مہرین نے کہا۔ ''چوبیس گھنٹے کی ڈیوٹی سمجھو...... صرف ایک دن چھٹی مہینے میں ایک بار ملے گی۔'' اُس کا لہجہ حاکمانہ سا تھا۔

''آپ میری رہائش کا معقول بندوبست کر دیں تو میں رہ لوں گا......'' میں نے کہا۔ ''جس وقت مجھ سے کہا جائے گا میں حکم بجا لاؤں گا۔ میں مہینے میں ایک دن کیا، ایک گھنٹے کی بھی چھٹی نہیں کیا کروں گا۔''

''چھت پر دو کمرے بنے ہوئے ہیں۔'' وہ کہنے لگیں۔ ''سرونٹ کوارٹر میں خانساماں، اس کی بیوی اور لڑکی رہتی ہے۔ اس لئے چھت والے کمروں میں ایک کمرہ تمہاری رہائش کے لئے ہوگا۔ چلو میں تمہیں کمرہ دکھا دوں۔ پہلے میں تم سے اپنے بچوں کا تعارف کرا دوں...... یہ میرا بیٹا نوید رضا ہے۔ ہم سب انہیں نومی کہہ کر پکارتے ہیں۔ تم انہیں چھوٹے صاحب کہو گے...... یہ میری شگوفہ ہے۔ ہم سب انہیں بے بی کہہ کر بلاتے ہیں۔ انہیں تم بے بی نہیں، چھوٹی بیگم صاحبہ کہو گے...... میرا نام مہرین رضا ہے۔ اب تمہارے بارے میں بچوں کو بتا دوں۔'' پھر اُس نے بچوں سے کہا۔ ''میں نے اسے شوفر رکھا ہے۔ اس کا نام سالار ہے جسے بھی اس کی ضرورت پڑے وہ لے جا سکتا ہے۔''

نومی اور بے بی نے مجھے غور سے دیکھا۔ نومی جو ٹیلی فون پر گفتگو کر رہا تھا، وہ منقطع ہو گیا تھا۔ وہ پھر سے نمبر ڈائل کرنے لگا۔ میں نے بے بی کی آنکھوں میں ایک انجانی خواہش کی چمک سی دیکھی۔ وہ دل میں کہہ رہی تھی...... تم شوفر نہیں، ہیرو معلوم ہوتے ہو۔ میری نگاہیں اُس سے چار ہوئیں اور میں نے اپنی نگاہیں اُس پر سے ہٹا لیں۔

''چلو میرے ساتھ......'' بیگم مہرین بولی۔ ''میں تمہیں تمہارا کمرہ دکھا دوں۔''

وہ مجھے اپنے ساتھ لے کر چھت پر پہنچیں۔ چھت پر ایک جانب دو کمرے بنے ہوئے تھے۔ ان میں ملحق غسل خانے بھی تھے۔ ان میں ایک کمرہ بہت کشادہ اور نہایت آراستہ و

پیراستہ تھا۔ فرش پر لمبے بالوں والا سرخ قالین بچھا ہوا تھا۔ ایک کونے میں ڈبل بیڈ تھا۔ بستر نہایت صاف ستھرا اور بے حد آرام دہ...... دروازے کھڑکیوں پر ہلکے رنگ کے پرنٹڈ ریشمی پردے...... اس کمرے میں ایک اے سی بھی لگا ہوا تھا۔ ایک بہت بڑی الماری دیوار میں نصب تھی۔ ایک بہت بڑی سنگھار میز اس زاویئے سے رکھی ہوئی تھی کہ اُس کے بڑے آئینے میں پورا بیڈ نظر آ رہا تھا۔ ایک تیس انچ کا رنگین ٹیلی ویژن بھی تھا۔ ٹرالی میں وی سی آر اور فلموں کے درجنوں ویڈیو کیسٹ بھی رکھے ہوئے تھے۔ بیگم مہرین نے بتایا کہ یہ کمرہ مہمانوں کے لئے ہے۔ کبھی کبھی بے بی اور اس کی سہیلیاں بھی آ جاتی ہیں۔ اس کمرے میں صرف ایک صوفہ سیٹ تھا۔

پھر وہ مجھے دوسرے کمرے میں لے گئیں جو مجھے رہائش کے لئے دیا جا رہا تھا۔ اُس کمرے اور اس کمرے میں بھی انٹرکام لگا ہوا تھا۔ یہ کمرہ مہمان والے کمرے سے قدرے چھوٹا تھا۔ اس میں صرف ایک پلنگ اور الماری تھی۔ فرش پر نہ تو قالین بچھا ہوا تھا اور نہ ہی سنگھار میز تھی، نہ ٹی وی اور نہ ہی اے سی...... البتہ بستر صاف ستھرا تھا، بے حد گداز اور آرام دہ بھی...... ایک کونے میں میز اور ایک کرسی تھی۔

اس وسیع و عریض پُرشکوہ کوٹھی میں چھت پر جو دو کمرے تھے اُنہیں چھوڑ کر نیچے اور پہلی منزل پر کل نو عدد بیڈ رُومز تھے جو تمام کے تمام ایئر کنڈیشنڈ تھے۔ اس کے علاوہ ٹی وی لاؤنج، ڈرائنگ اور ڈائننگ رُوم بھی ایئر کنڈیشنڈ تھے۔ اس کے علاوہ الیکٹرونکس کی اشیاء رات دن استعمال ہوتی تھیں۔ دو فل سائز کے ڈیپ فریزر اور دو سولہ فٹ کے فریج بھی تھے۔ جب میں دوسرے دن یوٹیلیٹی بل بھرنے گیا تو بجلی کا بل صرف سات سو روپے تھا۔

تمام کمروں کی تزئین و آرائش اور سجاوٹ پر پیسہ پانی کی طرح بہایا گیا تھا۔ ایک ایک کمرے پر شاہی محل کے کمرے کا دھوکہ ہوتا تھا۔ یوں بھی یہ کوٹھی کسی شاہی محل سے کم نہیں تھی۔ اس گھر اور ان کی زندگی پر لوگوں کو یقیناً رشک آتا ہوگا۔

اس گھر کے صرف دو افراد کے پاس ذاتی استعمال کے لئے ایک ایک گاڑی تھی، نوی اور بے بی کے پاس...... صاحب اور بیگم مہرین کی دو دو گاڑیاں تھیں۔ اُن میں ہنڈا، مرسڈیز، ٹویوٹا کرولا اور ٹویوٹا کراؤن تھی۔ اس کے علاوہ ایک ہائی روف بھی تھی جو سودا سلف لانے اور باہر کے چھوٹے موٹے کاموں کے لئے تھی۔ اس گھر میں صرف ایک میں ڈرائیور تھا۔

نیچے آ کر بیگم مہرین نے خانساماں، اُس کی بیوی سرداراں اور بیٹی شمسہ کو بلایا۔ خانساماں کی عمر ساٹھ برس کی ہوگی۔ وہ دراز قد تھا۔ اس عمر میں بھی صحت مند، توانا بدن اور جوانوں کی طرح چاق و چوبند تھا۔ چہرے پر بڑی تازگی اور سرخی تھی۔ مرغن اور عمدہ غذاؤں نے اُسے پوری طرح صحت مند رکھا ہوا تھا۔

اُس کی بیوی سرداراں چھتیس برس کی عمر کی تھی۔ یہ خانساماں کی دوسری بیوی تھی۔ ان کی شادی کو بیس برس کا عرصہ ہو گیا تھا۔ سرداراں گٹھے ہوئے جسم کی تھی۔ اُس کی رنگت سانولی تھی۔ وہ ایک ایسی پُرکشش عورت تھی جس کی تمنا مرد کرتے ہیں۔ اُس کا جسم چھریرا اور متناسب تھا۔ وہ مجھے گہری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ وہ اپنے شوہر کی طرح دراز قد نہ تھی لیکن اُس کی قامت متناسب بدن کی وجہ سے کم نہیں لگتی تھی۔

خانساماں کی بیٹی کا نام شمسہ تھا جو اٹھارہ برس کی تھی لیکن ایک بھرپور عورت کی سی تھی۔ اُس کے ہاتھ پیر سڈول اور بہت خوبصورت تھے۔ اُس میں جو دلکشی اور جاذبیت تھی وہ دل میں اُتر جانے والی تھی۔ چونکہ وہ اپنے باپ کی طرح دراز قد تھی اس لئے اُس کا سراپا بڑا دلفریب اور پُرشکوہ لگ رہا تھا۔ اُس کی رنگت سرخ و سفید تھی جبکہ ماں باپ میں سے کسی کی ایسی رنگت نہ تھی۔ وہ ان سے یکسر مختلف تھی۔ وہ ان کی بیٹی لگتی ہی نہیں تھی۔ خدوخال سبک تھے۔ آنکھیں بھی بہت بڑی بڑی، خوبصورت، چمکیلی اور بے حد سیاہ تھیں۔ ان کالی آنکھوں میں جوانی کا خمار چھلک رہا تھا۔ اُس نے بھڑکیلا لباس پہن رکھا تھا جس نے اُس کے حسن و شباب کی کرشمہ سازیوں کو اُجاگر کر دیا تھا۔ بال بھی لمبے اور سیاہ چمکیلے تھے۔ وہ اپنی وضع قطع اور چہرے مہرے سے ملازمہ نہیں بلکہ اس گھر کی فرد دکھائی دے رہی تھی۔ اس میں بڑا ناز و غرور تھا جو اُس کے بشرے اور آنکھوں سے ظاہر تھا۔

میں ہوٹل سے اپنا سامان لے آیا تھا۔ بیگم مہرین نے مجھ سے کہا تھا کہ میں اپنے کمرے میں جا کر آرام کروں۔ جس وقت اُنہیں یا کسی کو میری ضرورت پیش آئے گی، وہ انٹرکام پر رابطہ کر لے گا۔ میں بستر پر دراز ہو کر اس گھر کے بارے میں سوچ رہا تھا جو بہت خوبصورت اور عالیشان تھا۔ یہ ہائی سوسائٹی تھی۔ برگر فیملی تھی لیکن اس گھر میں ایسی غلاظت بھری ہوئی تھی کہ کوئی خواب و خیال میں بھی نہیں سوچ سکتا تھا۔ مغرب کی بگڑی ہوئی تہذیب کا عکس اس گھر کے سارے افراد اور ماحول پر نمایاں تھا۔

کوئی ایک گھنٹے کے بعد سرداراں میرے کمرے میں ایک ٹرے اُٹھائے داخل ہوئی
اس میں کھانا تھا جو وہ میرے لئے لے کر آئی تھی۔ اُس نے مجھے جن نگاہوں سے دیکھا
اُس نے میرے بدن میں سنسنی دوڑا دی۔ میں نے نظریں چرالیں۔ وہ میز پر ٹرے رکھ کر
گھومی۔ دوپٹہ درست کرنے کے لئے اُس نے گلے سے نکالا تو وہ اُس کے ہاتھ سے
چھوٹ کر فرش پر گرا۔ اُس نے نہایت اطمینان سے جھک کر اُٹھایا۔ اُس کی قمیض کا گلا
خاصا کشادہ تھا۔ میں میز کی طرف گھوم گیا۔ وہ مجھے جس نظارے سے محظوظ کرنا چاہتی تھی
میں نے اسے نظر انداز کر دیا تھا جس پر وہ دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا گئی تھی۔
اُس نے میری طرف تیکھی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں کسی چیز کی ضرورت
ہو تو انٹر کام کا سات نمبر کا بٹن دبا دینا۔''
میں نے کھانے کی ٹرے پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ''کھانا بہت ہے۔ کسی چیز کی
ضرورت نہیں ہے۔ جب کھانے کا وقت ہو تو مجھے انٹر کام پر بتا دیا کرنا۔ میں خود آ کر کھانا
لے جایا کروں گا...... تا کہ تمہیں زحمت نہ ہو۔''
''اس میں زحمت کی کیا بات ہے؟ کھانا پہنچانا میری ذمہ داری ہے۔ میں خود ہی کھانا
لے کر آیا کروں گی۔'' وہ بولی۔
''اس بات کی تہہ میں کون سا جذبہ کارفرما ہے، میں سمجھ گیا۔ وہ مجھ سے بے تکلف ہو
اور فاصلے کم کرنا چاہتی تھی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اُس کی میری عمر میں بڑا فرق ہے۔ اور
پھر وہ ایک شادی شدہ عورت اور نوجوان لڑکی کی ماں ہے۔ محبت اور جنگ میں ہر چیز جائز
تھی۔ اُس کی آنکھوں میں حسرتیں اور احساسِ محرومی بھی تھا۔
میں نے اِس گھر میں قدم رکھ کر سانس بھی نہیں لیا تھا کہ وہ زہریلی ناگن کی طرح مجھے
ڈسنے آ گئی تھی۔ یہاں تنہائی تھی۔ اس وقت اُس کا شوہر کھانا پکا کر سرونٹ کوارٹر میں جا چکا
تھا اور اُس کی بیٹی شمسہ بھی سرونٹ کوارٹر میں جا کر کھانا کھا رہی تھی۔ اس وقت کوٹھی میں کوئی
نہ تھا۔ بیگم مہرین اور اُس کے دونوں بچے اپنی اپنی مصروفیت میں شہر گئے ہوئے تھے۔
جب اُس نے یہ دیکھا اور محسوس کیا کہ اس تنہائی میں اُس کے پرشباب گداز بدن اور
اس ہیجان خیز نظارے کے وار ناکام رہے ہیں تو وہ مجھے ایک شریف اور شرمیلا لڑکا سمجھ کر
دل میں مسکراتی اور یہ سوچتی ہوئی چلی کہ وہ اس کے جادو سے کب تک اپنے آپ کو بچائے

رہے گا؟ عورت کے جادو سے زاہد بھی نہیں بچ سکتا۔
شام کے وقت نومی نے مجھ سے کہا کہ میں اُس کی گاڑی نکالوں۔ میں اُس کی گاڑی
چلاتا ہوا ایک بنگلے پر پہنچا۔ اس بنگلے کے باہر کوئی چھ سات گاڑیاں پارک تھیں۔ اس گاڑی
میں نومی کے ساتھ بے بی بھی تھی۔ وہ دونوں سارا راستہ انگریزی میں موسیقی کے موضوع پر
گفتگو کرتے رہے تھے۔ اسی وقت دو گاڑیاں اور آ کر رُکیں۔ اُن میں سے دو لڑکے اور دو
لڑکیاں اُتریں۔ یہ بھی بھائی بہن تھے۔ اُن لوگوں نے ایک دوسرے سے ہاتھ ملایا۔ نہ
صرف لڑکیوں نے لڑکیوں کے گالوں کو کس کیا، بلکہ لڑکیوں کو بھی اور لڑکوں نے بھی۔
بھائیوں کے سامنے غیر لڑکیوں نے ان لڑکوں کو کس کرنے دیا۔ اس حرکت کا برا نہیں منایا۔
میں بھی گاڑی پارک کر کے بنگلے کے اندر چلا گیا۔ یہ لڑکے لڑکیاں اپنی اپنی گاڑیاں
خود چلاتے ہوئے آئے تھے۔ یہ کلب تھا۔ اس کلب کا نام ایک خوبصورت بورڈ پر لکھا ہوا
تھا۔ اس کلب کا نام کیزی میوزیکل کلب تھا۔ لان کے ایک کونے میں تین چار کرسیاں
اور ایک میز تھی۔ ایک میز پر صرف ایک باوردی ڈرائیور بیٹھا ہوا تھا۔ اُس کی عمر پچاس
باون برس کی ہو گی۔ اُس نے میرا بڑی گرمجوشی سے استقبال کیا۔ اپنا تعارف کرایا۔ اُس کا
نام رحمت خان تھا۔
لڑکے، لڑکیوں کی کمروں میں ہاتھ ڈال کر برآمدے سے ہوتے ہوئے اندر چلے
گئے۔ میں اور رحمت خان رسمی باتیں کرنے لگے۔ دن ڈوبنے تک کچھ لڑکیاں اور لڑکے
اور بھی آ گئے مگر اُن کے ساتھ کوئی ڈرائیور نہ تھا۔ اس کلب کے چوکیدار نے جو ایک معمر
شخص تھا دو بوتلیں ٹھنڈے مشروب کی لا کر رکھ دیں۔
جب اندھیرا گہرا ہو گیا تب بنگلے کے اندر سے موسیقی اور گانے کی آوازیں سنائی دینے
لگیں۔ مغربی موسیقی کی دُھن تھی۔ کوئی بے ہنگم انداز سے گا رہا تھا۔ رحمت خان نے کہا۔
''اب ان کی ریہرسل شروع ہو گئی ہے۔''
''یہ سلسلہ کب تک چلے گا؟'' میں نے بوتل منہ کو لگاتے ہوئے پوچھا۔
''کوئی رات کے دس گیارہ بجے تک......'' رحمت خان نے مشروب حلق سے اُتارتے
ہوئے جواب دیا۔ ''اس وقت دراصل سٹیج شو میں گانے اور ٹی وی کے لئے عکس بندی کے
لئے ریہرسل ہو رہی ہے۔ ایک گھنٹہ تک ریہرسل جاری رہے گی...... پھر اس کے بعد کچھ

پینے پلانے کا سلسلہ چلے گا...... پھر اس کے بعد جوڑے موسیقی کی دھن پر ناچیں گے، تھرکیں گے...... کچھ جو ناچ میں حصہ نہیں لیں گے اور کمروں میں جا کر اپنی محبت کی تجدید کریں گے۔''

''میں نے یہ دیکھا ہے کہ بھائی اور بہن اکٹھے اس کلب میں آئے ہیں۔ میں بھی بھائی بہن کو لے کر آیا ہوں۔''

''آپ نے ٹھیک دیکھا اور سمجھا......'' رحمت خان نے کہا۔ ''اس میں حیرت اور تعجب کی کوئی بات نہیں ہے۔''

''کیوں نہیں ہے......؟'' میں نے تکرار کے انداز میں کہا۔ ''کیا جوان بہنیں اپنے بھائیوں کی موجودگی میں ناچتی اور گاتی ہیں؟ پینے پلانے کا شغل کرتی ہیں اور دوست لڑکوں کے ساتھ کمروں میں چلی جاتی ہیں؟ مجھے یقین نہیں آ رہا ہے۔''

''لگتا ہے کہ آپ نے پہلی بار کسی اُونچے گھرانے میں ملازمت کی ہے۔'' رحمت خان مسکرایا۔

''جی ہاں......'' میں نے سر ہلایا۔ ''آپ کا اندازہ سو فیصد درست ہے۔''

''اس لئے آپ کو میری باتوں کا یقین نہیں آ رہا ہے۔'' رحمت خان نے کہا۔ ''کیا آپ اپنی آنکھوں سے وہ سب کچھ دیکھنا چاہتے ہیں جو میں نے بیان کیا ہے؟''

''ہاں......'' میں نے سر ہلایا۔ ''آپ کی باتوں سے ایسا لگ رہا ہے کہ یہ ملک پاکستان نہیں، امریکہ ہے۔''

''گزشتہ بیس برسوں سے ہماری تہذیب، سوچ، رہن سہن اور نظریات میں بڑا فرق آیا ہے۔ پہلے ہم جسمانی غلام تھے اور اب ذہنی غلام ہیں۔ ہمارے ملک میں تین طبقے ہیں۔ دولت مندوں کا طبقہ اور ان کی دنیا سب سے مختلف اور الگ ہے۔ جب حرام کی آمدنی آتی ہے تو گھر سے شرافت، نیکی، سکون، پارسائی، غیرت اور حجاب رخصت ہو جاتے ہیں کیونکہ خون میں اس کا زہر سرایت کر جاتا ہے۔ اصل تو خون ہی ہوتا ہے۔ خون ہی سفید پڑ جائے اور زہر آلود ہو جائے تو پھر کیا رہ جاتا ہے؟ ان کے دل نہ صرف میلے ہو جاتے ہیں بلکہ بدن بھی...... ان کی راتیں کالی گزرتی ہیں۔ کیونکہ کالا دھن ہر چیز کو کالا کر دیتا ہے۔''

''کیا سارے دولت مندوں کے پاس حرام کی دولت ہوتی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''جی نہیں......'' اُس نے سر ہلایا۔ ''جن کے پاس محنت اور حلال کی دولت ہوتی ہے وہ اسے یوں نہیں لٹاتے، نہ اُن کی اولاد بے راہ روی کا شکار ہوتی ہے۔ وہ سکون اور شرافت کی دولت سے مالا مال ہوتے ہیں۔''

''کیا آپ کو حرام اور حلال کمانے والوں سے واسطہ پڑا ہے؟'' میں نے اُس کے چہرے پر نظریں مرکوز کر دیں۔

''میں بیس برس سے ڈرائیوری کے پیشے سے وابستہ ہوں۔'' وہ کہنے لگا۔ ''میں نے بڑے نشیب و فراز دیکھے ہیں۔ میں نے ہر قسم کے لوگوں کے پاس برسوں ملازمت کی ہے۔ اندرونی خانہ سے ایک ڈرائیور جتنا واقف ہوتا ہے اتنا شاید ہی کوئی ملازم ہوتا ہو گا۔ وہ لوگ جو مغربی تہذیب میں ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں، مغرب میں اُن کی پیدائش ہوتی ہے، وہاں کے ماحول میں پلنے بڑھنے والوں کے نزدیک ایک آزاد زندگی ہی قابل عمل ہوتی ہے، خوبصورت اور پُرکشش ہوتی ہے۔ ڈنمارک اور ناروے کی بگڑی ہوئی تہذیب اُونچے گھرانوں میں رچ بس گئی ہے۔ آؤ چلو...... آج تمہیں ان بے غیرت دولت مندوں کی زندگی کا ایک رُخ دکھاؤں۔ ہر تصویر کے دو رُخ ہوتے ہیں۔ لیکن ان کے بہت سارے رُخ ہوتے ہیں۔''

رحمت خان مجھے عمارت کے عقبی حصے کی طرف لے گیا۔ ادھر اندھیرا خاصا گہرا تھا۔ ہم جس کھڑکی کے پاس کھڑے تھے اس کے تین قدم پر ایک درخت تھا۔ کھڑکی کا پردہ ہٹا ہوا تھا اور اس کے پٹ بھی کھلے ہوئے تھے۔ اندر کا منظر صاف نظر آ رہا تھا۔ یہ ایک گروپ تھا۔ یہ گلوکار اور موسیقار بھی تھے۔ ایک گانے کی ریہرسل ہو رہی تھی۔ ایک نوجوان لڑکا گانا گا رہا تھا۔ وہ لڑکوں اور لڑکیوں کے درمیان کسی بندر کی طرح اُچھلتے کودتے ہوئے گلا پھاڑ رہا تھا۔ ڈیک بہت زور سے بج رہا تھا۔ لڑکے اور گلوکار کی وضع قطع لچے لفنگوں، بھانڈ اور خواجہ سراؤں کی سی تھی۔ وہ اپنے لباس، وضع قطع سے بے نیاز اور بے فکر تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ آئینہ نہیں دیکھتے ہیں۔ انہیں گانے گانے کا جنون ہے۔ لڑکیوں کے لباس بھی اخلاقی حدوں سے گرے ہوئے تھے اور وہ رقص کے دوران اپنے جسموں کی نمائش کر رہی تھیں۔ لڑکے خواجہ سراؤں کی طرح ناچ رہے تھے۔

''اس وقت ملک میں یہ گروپ شاید سب سے بڑا اور مقبول گروپ مانا جاتا ہے۔''

رحمت خان نے میرے کان میں آہستگی سے سرگوشی کی۔ ''آپ نے ٹیلی ویژن پر ا
گروپ کے موسیقی کے پروگرام دیکھے ہوں گے۔''

''نہیں۔'' میں نے سر ہلایا۔ ''مجھے ان لوفروں سے، ان کے حلیوں سے اور گانے ک
انداز سے سخت چڑ ہے۔ میرا بس چلے تو انہیں سولی پر لٹکا دوں۔ میں نے دو ایک پروگرا
سرسری سے دیکھے ہیں۔ ایک ڈفر گا رہا ہوتا ہے، اُس کے ساتھ اور عقب میں بیس تی
لڑے بندروں اور خواجہ سراؤں کے انداز میں ناچ رہے ہوتے ہیں۔ گانے والا اس طر
سے تھرک اور مٹک رہا اور بل کھا رہا ہوتا ہے جیسے اس کے پیٹ میں سخت درد ہو رہا ہو۔''

''کیا بات ہے؟ آپ ان سے بہت جلے ہوئے اور متنفر کیوں ہیں؟'' رحمت خا
ہنس پڑا۔

''اس لئے کہ یہ نہ تو رقص ہے اور نہ ہی موسیقی...... یہ موسیقی کی توہین ہے۔'' میں ۔
جواب دیا۔ ''مجھے حیرت اور اس بات کا دکھ ہے کہ ایسے گروپس کو ٹی وی پر پروگرام پیش
کرنے دیا جاتا ہے۔''

''یہ ٹی وی پر پروگرام پیش کرنے کی کتنی بڑی رقم لیتے ہیں خ آپ سوچ بھی نہیں
سکتے۔'' اُس نے کہا۔ ''جب کسی ہوٹل وغیرہ میں ان کے شو ہوتے ہیں تو کلفٹن، ڈیفنس
سوسائٹی اور گلشن اقبال کی نئی نسل دیکھنے کے لئے پاگل ہو جاتی ہے۔ ہزار روپے کا ٹکٹ بھی
ہو تو خرید لیتی ہے۔ ان کے شو دیکھنے کے لئے مرجاتی ہے۔ لڑکوں سے زیادہ لڑکیاں پاگل
ہوتی ہیں۔ حکومت اور ٹیلی ویژن والے بھی ان کی پذیرائی کرتے ہیں۔ اس کی سب سے
بڑی وجہ یہ ہے کہ یہ سارے مغرب زدہ ہیں، بڑے گھرانوں کی اولاد ہیں۔''

جب ریہرسل ختم ہوگئی، تب دیوار کے ساتھ جو میزیں ایک قطار میں تھیں اس کے گرد
لڑکے اور لڑکیاں مل کر بیٹھ گئیں۔ دو ملازموں نے ٹرے میں مشروبات سرو کرنا شروع
کیا۔ ان میں بیئر اور شراب تھی۔ وہ پینے، باتیں کرنے، کسی بات پر ہنسنے اور قہقہے لگا
لگے۔ وہ حال کی بانہوں میں مست اور خوش تھے اور جیسے ہر دم خوش رہنے کی کوشش کر
تھے۔ میرے لئے حیرت کی بات یہ تھی کہ ایسے جنونی گروپ ٹی وی اور اسٹیج شو
پروگراموں میں ملی نغمے بندروں اور خواجہ سراؤں کی طرح اُچھل کود کر کیوں گاتے تھے
قومی نغموں کی جو تذلیل اور حشر ہو رہا تھا اس کی کسی کو پرواہ نہیں تھی، نہ حکومت کو اور نہ عوا

یہ جنونی گروپ کے لیڈر فخر سے سینہ تان کر کہتے تھے کہ وہ پاکستان کی نمائندگی کر
رہے ہیں۔ میں جذباتی سا ہو جاتا اور یہ سوچے بغیر نہیں رہتا کہ کیا پاکستان ایسی ہی ثقافت
اور ایسے ہی لوگوں کے لئے بنایا گیا ہے؟''

تھوڑی دیر کے بعد کسی نے مغربی ہیجان خیز موسیقی کا ریکارڈ لگا دیا۔ لڑکے اور لڑکیاں
اُٹھ اُٹھ کر جوڑے بنا بنا کر رقص کرنے لگے۔ لڑکیاں اور لڑکے تھرکنے لگے۔ بل کھا کھا کر
ناچنے لگے۔ نومی کی بانہوں میں کوئی اور لڑکی تھی اور بے بی کسی اور لڑکے کی بانہوں میں۔
اس وقت یہ لوگ بہن بھائی نہیں بلکہ لڑکے اور لڑکیاں تھیں۔ یہ سب سولہ سے لے کر اکیس
برس تک کے تھے۔ پھر ایک ایک جوڑا غیر محسوس انداز سے اس کمرے سے نکلتا چلا گیا۔
پھر کمرہ خالی ہو گیا۔

پھر میں اور رحمت خان واپس انہی کرسیوں پر آ کر براجمان ہو گئے۔ رحمت خان نے
بتایا کہ اندر، اُوپر اور چھت کے کمروں میں لڑکے لڑکیاں جا کر بند ہو جاتے ہیں۔ اس
وقت بھی کمروں میں بند ہو گئے ہیں۔ ایک گھنٹے کے بعد وہ اس طرح سے باہر نکل آئیں
گے جیسے بلوں سے کیڑے نکل آتے ہیں، چیونٹیاں نکلتی ہیں۔

کوئی ایک گھنٹے کے بعد لڑکے لڑکیاں عمارت سے باہر آنے لگیں تو میں اور رحمت خان
باہر آ کر اپنی اپنی گاڑیوں کے پاس کھڑے ہو گئے۔ پھر یہ لوگ باہر آ کر گروپس بنا کر
کھڑے ہو کر باتیں کرنے لگے۔ پھر وہ تھوڑی دیر بعد اپنی اپنی گاڑیوں کی طرف بڑھے۔
بے بی اور نومی بھی آ گئے۔ میں نے نومی اور بے بی کا ایک لمحے میں تنقیدی نظروں سے
جائزہ لے لیا۔ نومی کے بال بے ترتیب تھے اور اُس کے جوتوں کے تسمے ایسے کھلے ہوئے
تھے جیسے انہیں باندھنے کا ہوش ہی نہیں رہا ہو۔ بے بی کے بال بھی بے ترتیب تھے۔ وہ
انہیں اپنے ہاتھ سے درست کر رہی تھی۔ لباس پر شکنوں کا جال پھیلا ہوا تھا لیکن اُس کے
چہرے پر گزرے لمحات کا فسانہ لکھا ہوا تھا۔ اُس پر سرشاری سی چھائی ہوئی تھی۔

وہ دونوں پچھلی نشست پر بیٹھ گئے۔ یہ سارے لڑکے اور لڑکیاں کلفٹن، کے ڈی اے
سکیم نمبر ایک، ڈیفنس اور دوسرے پوش علاقوں کے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد گاڑی میں
چھائے ہوئے سکوت کو نومی نے توڑا۔ اُس نے انگریزی میں بے بی سے کہا۔

''میں نے تم سے دو دن پہلے بھی کہا تھا کہ تم وکی سے دوستی ختم کر دو۔ لیکن تم آج بھی

وکی کے ساتھ ہی رہی تھیں۔''

''میں کیوں وکی سے اپنی دوستی ختم کردوں......؟'' بے بی جو باہر جھانک رہی تھی، اُس نے چہرہ نومی کی طرف کرلیا۔

''اس لئے کہ میں نے اُسے کئی بار نمی کے ساتھ گاڑی میں جاتے ہوئے دیکھا ہے۔'' نومی نے ناگواری سے کہا۔

''تو کیا ہوا......؟'' بے بی نے تنک کر کہا۔''تم بھی تو شہلا کے ساتھ سیر سپاٹے کرتے پھرتے ہو، جبکہ نازیہ تمہاری فرینڈ ہے۔''

''میں کبھی کبھی اُسے کمپنی دیتا ہوں۔ وہ مجھے اپنا اچھا فرینڈ سمجھتی ہے۔ کسی بات سے انکار کرنا کیا آؤٹ آف ایٹی کیٹ نہیں ہے؟''

''آج نازیہ نہیں آئی تو تم نے سارا وقت شہلا کے ساتھ گزارا...... سلمان نہیں آیا تو وکی نے مجھے کمپنی دی تھی۔''

''بے بی!'' نومی نے تلخی سے کہا۔''میں وکی کو تم سے زیادہ سمجھتا ہوں۔ تم اُسے لفٹ نہیں دیا کرو۔''

''مجھے تم سے زیادہ اچھے اور برے کی تمیز ہے۔ تم وکی سے اس لئے خار کھاتے ہو کہ تمہاری فرینڈ شازیہ جو امریکہ چلی گئی ہے اُس سے وکی نے دوستی کر لی تھی۔ شازیہ نے تمہیں لفٹ دینا بند کر دیا تھا۔ یہ تو ہوتا رہتا ہے۔ تم بھی تو فرینڈ بدلتے رہتے ہو...... اس بات کا مجھے پورا پورا حق اور اختیار حاصل ہے کہ میں کسے دوست بناؤں، کس کے ساتھ اُٹھوں بیٹھوں۔''

''مجھے بڑے بھائی کی حیثیت سے اس بات کا حق حاصل ہے کہ میں تمہاری رہنمائی کروں، اچھے برے کی تمیز سکھاؤں۔''

''نومی! میں کوئی بچی نہیں ہوں۔ میں بالغ ہو چکی ہوں۔ تمہیں اس بات کا کوئی حق حاصل نہیں کہ میرے ذاتی معاملات میں دخل دو، جبکہ میں نے تمہیں کسی بات پر نہیں ٹوکا...... تم سے نجمہ کے بارے میں باز پرس نہیں کی کہ اُسے محبت کے نام پر شادی کا فریب دے کر اُسے بیوقوف بنایا۔ وہ غریب تم سے ناامید اور مایوس ہو کر یوکے چلی گئی۔''

''کیا تمہیں اس بات کا ذرہ برابر بھی احساس نہیں ہے کہ یہ شخص ہماری باتیں سن

رہے؟'' نومی نے موضوع بدلا۔ اُس نے سرگوشی میں آہستگی سے کہا۔''میں تم سے گھر چل کر بات کروں گا۔ ممی اور ڈیڈی سے تمہاری شکایت کروں گا۔''

''اس موضوع پر اب کوئی بات نہ ہوگی اور نہ تم میرے نگران ہو۔ اگر تم نے میری کوئی شکایت کی تو پھر میں تمہارے کرتوت بھی کہہ دوں گی...... لہٰذا تم مجھ سے اُلجھنا نہیں...... یہ شخص انگریزی بالکل نہیں جانتا۔'' بے بی تنک کر بولی۔

چونکہ گھر آ گیا تھا اس لئے اُن دونوں نے خاموشی اختیار کر لی۔ میں نے ہارن بجایا تو خانساماں نے چند لمحوں کے بعد دروازہ کھول دیا۔ خانساماں، چوکیدار کے فرائض بھی انجام دے رہا تھا کیونکہ چوکیدار کسی وجہ سے ملازمت چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ دوسرے چوکیدار کا بندوبست ہونے تک خانساماں کو چوکیدار کے فرائض انجام دینا تھے۔

جب میں نے گاڑی اندر لا کر پارک کی تو دونوں بہن بھائی آپس میں لڑتے جھگڑتے اندر چلے گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد میری اندر طلبی ہوئی کیونکہ شہزاد رضا گھر میں موجود تھا۔ وہ مجھ سے ملنا اور مجھے دیکھنا چاہتا تھا۔ میں خود بھی اُس سے ملنے کے لئے بے چین تھا کیونکہ اُس کا نام مجھے مانوس سا لگا تھا اور شاید مجھے جانتا ہو۔ اس طرح میں اپنے آپ کو پا سکتا تھا۔

میں نشست گاہ میں داخل ہوا تو شہزاد رضا اپنے اہل خانہ کے ساتھ موجود تھا۔ بے بی کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور نومی اندر ہی اندر کھول رہا تھا کیونکہ ان دونوں کے درمیان ماں باپ کے سامنے بڑی بحث اور تلخ کلامی ہوئی تھی۔ بیگم مہرین نے ان دونوں ہی کو بری طرح ڈانٹ ڈپٹ دیا تھا۔ بے بی نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ وہ اپنی مرضی کی مالک اور خود مختار ہے۔

میں نے شہزاد رضا کو دھڑکتے دل کے ساتھ دیکھا جو بڑے صوفے پر اپنی بیوی کے ساتھ بیٹھا سگار پی رہا تھا۔ وہ ایک دراز قد، صحت مند اور چاق و چوبند شخص تھا۔ وجیہہ تھا۔ اُس کے سر کے سیاہ بالوں میں سفید بال بھی جھانک رہے تھے۔ اُس کی عمر پچپن برس کے لگ بھگ ہوگی۔ اُس کی شخصیت بڑی متاثر کن تھی۔

میں نے شہزاد رضا کو سلام کیا اور ایک طرف کھڑے ہو کر ایک پل میں اُس کا ذہن پڑھ لیا۔ نہ تو اُس کی شکل میرے لئے مانوس تھی اور نہ ہی شہزاد رضا کے ذہن کے کسی گوشے میں میرے بارے میں کچھ معلوم تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے لئے اجنبی

تھے۔شہزاد رضا نے مجھ پر ایک سرسری سی نظر ڈالی۔ پھر اُس نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔

''یہ صاحب ہیں۔'' بیگم مہرین نے اپنے شوہر کا مجھ سے تعارف کرایا۔ پھر اپنے شوہر سے کہا۔''یہ ہے نیا ڈرائیور سالار...... میں تمہیں اسی کے بارے میں بتا رہی تھی۔ اسے ہماری شرائط منظور ہیں۔''

شہزاد رضا نے بے بی سے دریافت کیا۔''بے بی! تم نے اسے کیسا پایا؟ یہ گاڑی کیسی چلاتا ہے؟''

''یہ بہت اچھا ڈرائیور ہے۔'' بے بی نے جواب دیا۔''بہت ہی تجربہ کار لگتا ہے۔''

''تمہاری کیا رائے ہے نومی؟'' شہزاد رضا نے اپنے بیٹے کی طرف دیکھا۔

''یہ ایک پیشہ ور ڈرائیور ہے۔ ظاہر ہے گاڑی اچھی ہی چلائے گا۔'' نومی نے سرد مہری سے کہا۔

''ٹھیک ہے، تم جاؤ......'' شہزاد رضا نے مجھ سے کہا۔''ایک بات کا خیال رکھنا، ہماری گاڑیاں نہ صرف نئی بلکہ بے حد مہنگی بھی ہیں۔ یہ بات تم نے اچھی طرح سمجھ لی ہوگی۔ لہٰذا احتیاط سے چلانا۔''

''آپ بے فکر رہیں سر!'' میں نے کہا۔''یہ گاڑیاں آپ کی نہیں بلکہ میری ہیں۔ میں ان کا اچھی طرح سے خیال رکھوں گا۔''

پھر میں نے اپنے کمرے میں پہنچ کر کپڑے تبدیل کئے۔ اسی وقت شمسہ میرے لئے ٹرے میں کھانا لے کمرے میں داخل ہوئی۔ اس وقت اُس نے نیا جوڑا پہنا ہوا تھا۔ ہلکا سا میک اپ بھی کیا ہوا تھا۔ اُس کے لباس سے بھینی بھینی خوشبو پھوٹ رہی تھی۔ وہ کھانے کی ٹرے میز پر رکھ کر ناگواری کے انداز میں بولی۔''برتن کچھ دیر کے بعد یا پھر صبح ماں آکر لے جائے گی۔''

اتنا کہہ کر وہ ایک جھونکے کی طرح کمرے سے نکل گئی۔ لیکن کمرہ مہکا گئی تھی۔ مجھے اُس کے لباس، میک اپ، خوشبو اور یہ بدمزاجی سے یہ جاننے میں دیر نہیں لگی کہ وہ کس کی منظور نظر ہے۔ اُس کے اس گھر میں کسی کی منظور نظر ہونے کی وجہ سے اُس کی اہمیت اور حیثیت بھی تھی۔ سرونٹ کوارٹر میں دو کمرے تھے۔ ایک کمرہ شمسہ کو دیا ہوا تھا۔ اُس کے کمرے میں نہ صرف آرام دہ گداز بلکہ نہایت صاف ستھرا بستر تھا، فرش پر پرانا قالین بھی

بہت اچھی حالت تھی۔ اس کے علاوہ ایک سنگھار میز جو بے بی کی تھی، وہ اُس کے کمرے میں تھی۔ اس میز پر میک اپ کی لوازمات اور کسی قسم کے لوشن بھی تھے۔ اس کے علاوہ سینٹ کی شیشیاں بھی تھیں۔ الماری میں ایک سے ایک بڑھیا اور شوخ رنگ کے ملبوسات اور تین چار نائٹیز بھی تھیں۔ ان ملبوسات میں بے بی کی دی ہوئی ملبوسات تھیں۔ ایک سولہ انچ کا ٹی وی اور وی سی آر بھی تھا۔ فلموں کے کیسٹ کے علاوہ کیبل کا کنکشن بھی تھا۔ وہ ملازمہ ہوتے ہوئے ایک شہزادی کی طرح رہ رہی تھی۔ یہ سب کچھ میں نے اُس کے ذہن سے معلوم کر لیا تھا کیونکہ اُس کے ناز نخرے اُٹھائے جا رہے تھے اس لئے اس میں پندار حسن بھی تھا اور دماغ ساتویں آسمان پر رہتا تھا۔ اُس کے اپنے خیال میں بھی اس سے حسین عورت کوئی نہیں تھی۔

مجھے چونکہ بڑے زور کی بھوک لگ رہی تھی اس لئے میں نے جلد ہی کھانا کھا لیا اور برتن میز پر رکھ دیئے۔ پھر میں کمرے سے نکل کر چھت پر ٹہلنے لگا۔ تھوڑی دیر تک ٹہلنے کے بعد میں باہر پڑی ہوئی بید کی بنی ہوئی اکلوتی آرام دہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ پھر میں سوچنے لگا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہئے؟ میں نے یہاں صرف اس لئے ملازمت کر لی تھی کہ شہزاد رضا کے ذہن سے رابطہ کر کے اپنے بارے میں معلوم کروں۔ لیکن وہ تو مجھے جانتا ہی نہیں تھا۔ ہم دونوں نہ صرف اجنبی تھے بلکہ ایک دوسرے کو پہلی بار دیکھا تھا۔ بہت دیر تک سوچ بچار کرنے کے باوجود میں کسی فیصلے پر نہیں پہنچ سکا۔

پھر میں نے کمرے میں آکر روشنی گل کی اور پنکھا چلا کر سونے کے لئے بستر پر دراز ہو گیا۔ اس گھر کے سارے افراد کے علاوہ خانساماں، سرداراں اور شمسہ کے ذہن بھی میں پڑھ چکا تھا۔ پھر میں نے سوچا کہ یہاں کچھ دن رہ کر دوبارہ اپنی منزل کی تلاش میں نکل جاؤں۔ یہاں سے اُسی ہوٹل میں جا کر کمرہ کرائے پر لے لوں جس میں، میں نے پہلے کمرہ لیا ہوا تھا۔

نجانے کیوں مجھے یقین نہیں آیا کہ ہمارا معاشرہ غلاظت کے دلدل میں گر چکا ہے۔ خصوصاً ان دولت مندوں کا...... میں ان کے بارے میں سوچتے ہوئے گہری نیند سو گیا۔

میں نے گہری نیند میں اپنے ہونٹوں، رخساروں اور گردن پر جلن اور تپش سی محسوس کی پھر میرے نتھنوں میں بھینی بھینی خوشبو کی مہک بس گئی۔ میں نے اپنی آنکھیں کھول

دیں۔ کمرے میں نائٹ بلب کی روشنی پھیلی ہوئی تھی اور مجھ پر سرداراں جھکی ہوئی تھی
اُس کے چہرے کا طول وعرض میری نظروں کے سامنے آسمان کی طرح پھیلا ہوا تھا۔ اُس
کی سانسیں میرے چہرے کو جھلسا رہی تھیں۔

میں ہڑ بڑا کے اُٹھ بیٹھا۔ میری زبان سے بے ساختہ نکل گیا۔ ''سرداراں!......تم......
اس وقت......؟''

''مجھے نیند نہیں آرہی تھی تو تم سے ملنے اور باتیں کرنے چلی آئی۔'' سرداراں کے لبوں
پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن تمہارا شوہر اور بیٹی کیا سوچیں گے؟ اور پھر صاحب، بیگم صاحبہ
کو بھی معلوم ہوا تو میں اپنی نوکری سے گیا...... ہوسکتا ہے کہ وہ تمہیں بھی نوکری سے نکال
دیں۔'' میں نے کہا۔

''تم میرے شوہر اور بیٹی کی فکر نہ کرو......'' وہ کہنے لگی۔ ''میرا شوہر رات دس بجے نیند
کی گولیاں کھا کر سو جاتا ہے۔ شمسہ بھی جلد سو جاتی ہے تاکہ صبح جلد اُٹھ سکے...... اس وقت
صاحب اور بیگم صاحبہ اپنے کمرے میں مے نوشی کر رہے ہیں۔ ان میں سے کسی کو خبر
اور نہ وہ اپنے کمرے سے نکلتے ہیں۔''

''لیکن میں نے نومی اور بے بی کے کمروں سے روشنی باہر آتی ہوئی دیکھی ہے۔'' میں
نے کہا۔

''بے بی تو اس وقت اپنے کمرے کا دروازہ بند کئے وی سی آر پر فلم دیکھ رہی ہے۔ نومی
اپنی محبوبہ سے ٹیلی فون پر بات کر رہا ہے۔ رات دو تین بجے سے پہلے گفتگو کا یہ سلسلہ ختم
نہیں ہوگا۔'' سرداراں معنی خیز انداز سے مسکرائی۔

''تم نے مجھے گہری نیند سے کیوں جگایا......؟ مجھے نیند آرہی ہے۔ تم جاؤ! مجھے سونے
دو۔'' میں نے جماہی لیتے ہوئے کہا۔

''میں تھوڑی دیر بعد چلی جاؤں گی۔'' وہ بستر پر میرے پاس بیٹھ گئی۔ ''تم کچھ خیال
مت کرنا۔''

اُس کا قرب میرے لئے آتش فشاں سے کم نہیں تھا۔ ''تم اپنے کمرے میں بھی جا کر
بیٹھ سکتی ہو۔'' میں نے کہا۔

اُس نے میری آنکھوں میں بڑی سنجیدگی سے جھانکتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں مجھ پر رحم
نہیں آرہا ہے؟''

''رحم......؟'' میں نے متعجب نظروں سے اُس کی طرف دیکھا۔ میں انجان بن گیا۔
اس کی تہہ میں کون سا جذبہ کارفرما تھا اُس کے ذہن سے میرے علم میں آچکا تھا۔ ''میں
نے تم پر کون سا ایسا ظلم کیا ہے جو میں رحم کھاؤں؟''

''یہ ظلم نہیں تو اور کیا ہے کہ تم مجھ سے سیدھے منہ بات کرنا بھی پسند نہیں کرتے ہو۔
دوپہر کے وقت بھی تم نے ناگواری سے بات کی۔ تمہیں میرے جذبات اور احساسات کا
کوئی خیال نہیں۔ آخر ایسی بے رُخی کس لئے؟'' وہ بکھرے ہوئے لہجے میں بولی۔

''مجھے یہاں آئے ایک دن بھی نہیں ہوا، تم رات کے وقت تنہائی میں باتیں کرنے
چلی آئی ہو...... جبکہ میں تمہارے لئے نامحرم ہوں۔ ایک نوجوان مرد ہوں، کنوارا ہوں۔
جبکہ تم شادی شدہ عورت ہو، عمر میں مجھ سے بڑی ہو اور ایک نوجوان لڑکی کی ماں ہو۔ اور
پھر ہم دونوں ایک دوسرے کے لئے اجنبی بھی ہیں......'' میں ایک ہی سانس میں کہہ گیا۔

''مجھ سے بات کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ اس لئے میں ترس جاتی ہوں۔'' وہ کہنے
لگی۔ ''لیکن صرف ایک دن میں تم بہت اچھے لگے ہو، بہت پسند آئے ہو۔ مجھے تمہیں دیکھ
کر ایسا لگا جیسے تم یہاں برسوں سے ہو۔ ہم ایک دوسرے کو برسوں سے جانتے ہیں۔ کیا
شادی شدہ اور جوان بیٹی کی ماں ہونا کوئی جرم ہے؟ آخر تم اس قدر خائف اور پریشان
کیوں ہو رہے ہو؟''

''حیرت کی بات ہے کہ ایک عورت ہونے کے ناتے تمہیں بدنامی اور رُسوائی کا کوئی
ڈر اور خوف نہیں ہے؟''

''بات یہ ہے کہ میں ایک جوان عورت ہوں۔ میرا شوہر عمر میں مجھ سے پورے تیس
برس بڑا ہے۔ اُس نے میرے والدین کی غربت اور مفلسی سے فائدہ اُٹھا کر مجھ سے شادی
کر لی۔ اب اُسے میری ذات سے کوئی دلچسپی نہیں رہی، محبت بھی نہیں رہی۔ وہ کسی بجھے
ہوئے آتش فشاں کی طرح سرد پڑ چکا ہے۔ اُس کے جذبات میں بھی سرد مہری سی ہوتی
ہے۔ اب اُسے صرف پیسہ جمع کرنے اور کھانوں سے دلچسپی ہے۔ میرے دل میں بڑے
ارمان ہیں۔ میں یہ چاہتی ہوں کہ وہ مجھ سے محبت بھری باتیں کرے۔ کم از کم محبت کے دو

بول تو بول دے۔ لیکن اُسے میرے جذبات کی بالکل بھی فکر نہیں ہے، نہ احساس ہے۔"

"لیکن میرا خیال ہے کہ تم اپنے شوہر کے جذبات کا خیال نہیں کرتی ہو...... تم جیسی خوبصورت، جوان اور پُرکشش عورت سے اُس کا شوہر کیسے دُور رہ سکتا ہے۔ تمہارا والہانہ پن، محبت اور وارفتگی اور گرم جوشی اُسے تمہارا غلام بنا سکتی ہے۔ شاید تم اس لئے ایسا نہیں چاہتی ہو کہ تمہارا دل اُس سے بھر چکا ہے۔ اور پھر شاید اس بات کا بھی احساس تمہارے دل و دماغ پر چھایا ہوا ہے کہ وہ عمر میں تم سے تیس برس بڑا ہے۔" میں نے تیزی سے کہا۔

"میں برف کے تودے سے کیا اظہارِ محبت کروں......؟" سرداراں نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہا۔ "تمہیں کیا بتاؤں، میں تین برس سے کیسی آگ میں جل رہی ہوں...... میری کیا حالت ہو رہی ہے۔"

"ہماری عورتیں اپنے احساسات اور جذبات پر قابو پا کر زندگی گزارتی ہیں۔ تمہیں حالات سے سمجھوتہ کر لینا چاہئے۔"

"میں کیسے خود پر قابو پا لوں اور اپنے جذبات کو قابو میں رکھوں؟ تمہیں آج یہاں پہلا دن ہے۔ تم اس گھر کے ماحول سے واقف نہیں ہو۔ اس گھر کے ماحول نے میرے جذبات کو بھڑکا دیا ہے۔ اس کے علاوہ فلمیں بھی ہیں جو بے بی اپنے کمرے میں راتوں کو سہیلیوں کے ساتھ دیکھتی ہے اور نومی اپنے دوستوں کے ساتھ...... ان فلموں کی وجہ سے میں جیسے اپنے شوہر سے دُور ہوتی جا رہی ہوں۔ میں صرف اتنا چاہتی ہوں کہ کوئی مجھ سے گھڑی دو گھڑی باتیں ہی کر لے۔ میں اسی لئے آئی ہوں۔"

"تم مجھ سے صرف باتیں کرنے نہیں بلکہ مجھے بہکانے، ورغلانے اور اپنا اسیر بنانے کے لئے آئی ہو۔"

وہ میری بات سن کر چونکی۔ "کیا تم میری ذات پر الزام نہیں لگا رہے ہو؟ کس بناء پر تم یہ بات کہہ رہے ہو؟"

"اس وقت تم جس لباس میں ملبوس ہو کر آئی ہو، کیا وہ نامناسب نہیں ہے؟ دوپٹہ بھی تمہارے سینے پر نہیں ہے۔"

"اس گھر میں جو لباس پہنا جاتا ہے تم نے دیکھ لیا ہے...... یہ بیگم صاحبہ کا دیا ہوا لباس ہے۔" وہ بولی۔

"تم چلی جاؤ...... یہی ہم دونوں کے حق میں بہتر ہے۔ نومی یا بے بی...... یا صاحب آ گئے تو بہت برا ہو گا۔"

"اس گھر کا ماحول بہت آزادانہ ہے۔ کوئی کسی کے معاملے میں دخل نہیں دیتا ہے۔ تمہیں کیا بتاؤں...... بے بی کا کوئی دوست لڑکا آتا ہے تو وہ اُسے اپنے کمرے میں لے جا کر باتیں کرتی ہے۔ بیگم صاحبہ بھی اپنے شوہر کے دوست کے ساتھ اپنے کمرے میں مے نوشی کرتی ہیں۔ صاحب کسی کسی رات غائب ہوتے ہیں۔ کوئی مجھ پر اُنگلی نہیں اُٹھا سکتا۔"

خانساماں اور سرداراں کوئی پانچ برس سے اس گھر میں ملازمت کر رہے تھے۔ کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جو ناقابلِ یقین اور معیوب سی معلوم ہوتی ہیں۔ اُونچے اور مہذب لوگوں سے اس کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ لیکن دنیا میں کوئی بات ناممکن نہیں رہی۔ اخلاق سے گری ہوئی باتیں آ جاتی ہیں۔ آدمی جب اندھے جذبات کا غلام بن جاتا ہے تو وہ حیوان بن جاتا ہے۔ اُسے اچھے برے کی تمیز نہیں رہتی۔ جو غلاظت کے دلدل میں گرا ہوا ہوتا ہے، وہ دوسرے کو بھی کھینچ لیتا ہے۔

شہزاد رضا کا بہت بڑا کاروبار تھا، لاکھوں کروڑوں کا...... اُسے بل پاس کرانا ہوتا، قرض لینا ہوتا تو اس کے لئے سفارش کی ضرورت ہوتی تھی۔ حسین اور پُرکشش بیوی سے بڑی سفارش کوئی نہیں ہوتی ہے۔ پارٹیاں...... پُرفضا مقامات پر متعلقہ لوگوں کے سیر و تفریح اور ان کی جھولی میں گر جانے سے کام فوراً بن جاتے تھے۔ بیگم مہرین کو صرف اشارے کی دیر ہوتی تھی۔

پانچ برس قبل جب یہ میاں بیوی اپنی بیٹی کے ساتھ ملازمت کے لئے آئے تھے تب خانساماں اپنے دراز قد، چوڑے چکلے سینے اور فولادی بازوؤں اور صحت مند جسم کی وجہ سے کسی یونانی سپاہی کی طرح دکھائی دیتا تھا۔ یوں تو بیگم مہرین شہزاد رضا کی ترقی کے لئے بہت سارے بستروں کی زینت بنی تھی، اپنا وجود میلا کر چکی تھی لیکن خانساماں نے اُسے بہت متاثر کیا تھا۔ جب شہزاد رضا کسی کام سے امریکہ گیا تو اُس کی واپسی تک خانساماں نے اُس کی جگہ لے لی تھی۔

شہزاد رضا کی کمزوری بھی عورت تھی۔ جب اُس کی بیوی اور بچے یورپ کی سیر و سیاحت کے لئے گئے تو سرداراں اس کمی کو پورا کرتی رہی۔ وہ اپنے شوہر کے دُودھ،

چائے میں نیند کی گولیاں گھول دیتی تھی۔ اب دو برسوں سے شہزاد رضا نے سرداراں کی طرف دیکھنا بھی بند کر دیا تھا کیونکہ اُس کا جی اس سے بھر چکا تھا۔ اس دسترخوان سے اتنا سیر ہو چکا تھا کہ اب اس کے دل میں سرداراں کے لئے کوئی کشش اور دلچسپی نہیں رہی تھی۔

سرداراں اس بات سے واقف تھی کہ اُس کا شوہر بیگم صاحبہ کے اشاروں پر چل رہا ہے۔ اُس نے کبھی اس راہ میں حائل ہونے اور ٹوکنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ کیونکہ وہ جانتی تھی کہ یہ چار دن کی چاندنی ہے۔ دوسری طرف ان کی پانچوں گھی میں تھیں۔ دونوں میاں بیوی، صاحب اور بیگم صاحبہ کی کمزوریوں سے فائدہ اُٹھاتے رہتے تھے۔ خانساماں اور بیگم صاحبہ کی گاڑی زیادہ دن نہ چل سکی۔

سرداراں شباب کی آخری منزل پر تھی۔ شہزاد رضا اس کا شکار نہ کرتا تو شاید وہ تشنہ لب نہیں رہتی۔ جذبات کی آگ میں نہیں جلتی...... مجھ سے پہلے جو یہاں ڈرائیور تھے وہ معمر اور باریش تھے۔ میں ایک جوان ڈرائیور آیا تھا۔ اُس کے اندر جو عورت سوئی ہوئی تھی، جسے اُس نے تھپک تھپک کر سلا دیا تھا وہ مجھے دیکھ کر ہڑبڑا کے اُٹھ بیٹھی تھی۔ اس لئے سرداراں ایک ہی دن، ایک ہی وقت میں سارے فاصلے مٹا دینا چاہتی تھی۔ حجاب کے تمام پردے اُٹھانے کے لئے بے تاب ہو رہی تھی۔

وہ ایسی عورت نہیں تھی کہ مرد اُسے نظر انداز کر دے۔ میں کوئی فرشتہ یا زاہد نہ تھا لیکن میں اس پستی میں گرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس انجانے راستے پر چلنا نہیں چاہتا تھا۔ ایک طرف میرے دل میں یہ خواہش جنم لے رہی تھی کہ اس پکے پھل کو توڑ لوں، اس سے اپنی جھولی بھر لوں لیکن دوسری طرف میں یہ بھی دیکھ رہا تھا کہ ایک عورت، بیوی اور ماں کا وجود کیسے میلا کروں؟ میں بھی تو میلا ہو جاؤں گا۔

''کیا یہ لوگ واقعی ایسے ہیں جیسا تم بتا رہی ہو؟ کیا ایسا ممکن ہے؟'' میں نے انجان بن کر پوچھا۔ ''مجھے معلوم نہیں کیوں یقین نہیں آ رہا ہے کہ یہ اُونچے لوگ ایسے بھی ہو سکتے ہیں؟''

''یہ دنیا بہت کالی ہے سالار!'' وہ کہنے لگی۔ ''ایسی نہیں ہے جیسی نظر آتی ہے۔ دُور سے سب لوگ بہت اچھے اور شرفاء دکھائی دیتے ہیں۔ گھر بھی خوبصورت...... زندگی بھی خوشنما...... لیکن اندر کتنا اندھیرا ہے، ان لوگوں کے چہروں پر کتنی کالک ہے تم سوچ بھی

نہیں سکتے ہو۔ میں اس گھر کے بھید بتاؤں گی تو تم یقین نہیں کرو گے۔ دو سال پہلے بے بی حاملہ ہو گئی تھی۔ بیگم صاحبہ نے اسقاط پر ایک لاکھ روپے خرچ کئے...... نومی نے پڑوس کی چودہ برس کی ملازمہ لڑکی کو حاملہ کر دیا۔ اُس کی ماں کو پچیس ہزار روپے دے کر منہ بند کر دیا گیا...... کیا تمہیں بے بی اور نومی کے چہروں سے ایسا لگتا ہے؟ کیا یہ کالک نظر آتی ہے؟ دولت مندوں کے عیب چھپ جاتے ہیں، غریبوں کے ظاہر ہو جاتے ہیں کیونکہ ان کے پاس دولت نہیں ہوتی۔''

''ان کے چہروں پر جو کالی کالی لکیریں ہیں، میں ایک دن میں کیسے دیکھ سکتا ہوں؟'' میں نے کہا۔ ''مجھے تمہاری باتوں سے انکار نہیں ہے۔ لیکن تم کیوں اپنے چہرے پر کالی لکیریں سجانا چاہتی ہو؟ اپنا دامن آگ سے بچانے کی کوشش کرو۔''

''منہ زور جوانی اور شباب کی آندھی کے آگے میری حیثیت ایک تنکے کی سی ہے۔ کاش میں تمہیں سمجھا سکتی، بتا سکتی۔ میری مثال بے آب ماہی کی طرح ہے جو خشکی پر تڑپ رہی ہے۔ میں صرف اتنا چاہتی ہوں کہ مجھے اُٹھا کر پھر سے آب میں پھینک دو...'' وہ مجھے حسرت بھری نظروں سے دیکھنے لگی۔ اُس کے سینے میں سانسوں کا تلاطم ہچکولے کھانے لگا۔

''تم اپنے کوارٹر میں جاؤ۔'' میں نے ناصحانہ انداز میں کہا۔ ''اپنے آپ کو سمجھانے کی کوشش کرو۔ کیونکہ میں جوانی کے جنگل میں تمہارا ہمسفر نہیں بن سکتا...... میرا دامن پاک صاف ہے۔ خدا کے لئے اسے داغدار نہ کرو۔''

''تم کیسے احمق ترین مرد ہو جو ایک عورت کی مہربانی کو ٹھکرا رہے ہو......؟'' اُس نے مجھے عجیب نظروں سے دیکھا۔ ''میں ایک ایسی فیاض عورت ہوں جس کا تم تصور بھی نہیں کر سکتے ہو۔ مجھ جیسی فیاض عورت کبھی تمہاری زندگی میں نہیں آ سکتی۔''

''سرداراں!'' میں نے تیز لہجے میں کہا۔ ''میں ان مردوں میں سے نہیں ہوں جو فوراً ہی پھسل جاتے ہیں۔ میں تمہاری خواہش اور ارمان پورے نہیں کر سکتا...... میرے پاس تمہیں دینے کے لئے کچھ نہیں ہے۔ تم نے مجھے سمجھنے میں سخت غلطی کی ہے۔''

سرداراں نے دروازے کو بھیڑ دیا۔ پھر اُس نے چشم زدن میں لباس اُتار کر فرش پر پھینک دیا۔ پھر اُس نے مجھے تیکھی نظروں سے دیکھا۔ ''اب تم کیا کہتے ہو......؟ کیا میں خوبصورت، جوان اور پُرکشش نہیں ہوں......؟ کیا میں ایک ساٹھ برس کے بوڑھے کی

بیوی اور ایک نوجوان لڑکی کی ماں لگتی ہوں...... ؟ کیا میری مثال ایک دہکتے ہوئے آتش
فشاں کی سی نہیں ہے؟''

میں تیزی سے دروازے کی طرف بڑھا تاکہ اُس کے جسم کی کرشمہ سازیوں کے طلسم
سے نکل سکوں۔ اُس کا سراپا مجھے کسی زہریلی ناگن کی طرح ڈسنے لگا تھا۔ میں نے اُس
کے جسم پر سے نگاہ ہٹالی تھی۔ وہ تیزی سے میری راہ میں حائل ہوگئی۔

''سالار!'' اُس نے زہر خند کہا۔ ''میری تذلیل و توہین کر کے نہ جاؤ۔ میں ایک
عورت ہونے کے ناتے یہ سب کچھ برداشت نہیں کرسکتی۔''

''سرداراں!'' میں نے تیز لہجے میں کہا۔ ''میرے سامنے سے ہٹ جاؤ۔ مجھے جانے
دو...... تم مجھے پست نہ سمجھو۔''

''کہیں ایسا تو نہیں کہ تم میرے شوہر کی طرح عورت کے قابل نہیں رہے ہو......؟'' وہ
طنز آمیز لہجے میں بولی۔

''یہی سمجھ لو۔'' میں نے تلخی سے کہا۔ ''اسی لئے میں اپنا دامن بچانے کے لئے بھاگ
رہا ہوں۔''

میں نے اُسے ایک طرف ہٹا کر آگے بڑھنا چاہا تو اُس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ پھر
اُس نے چشم زدن میں میرا ہاتھ چھوڑ کر اپنی بانہیں میری گردن میں حمائل کر کے میرے
ہونٹوں میں اپنے ہونٹ پیوست کر دیئے۔ میں نے فوراً اپنے ہونٹ الگ کر کے پوری
قوت سے اُسے ایک طرف ہٹایا۔ وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکی اور فرش پر گرگئی۔ میں نے
باہر نکل کر دروازہ بھیڑا، پھر پانی کی ٹینکی کے عقب میں چھپ گیا۔ وہاں اندھیرا تھا۔ میں
نے اس اندھیرے میں پناہ لے لی تھی۔

تھوڑی کے بعد وہ باہر آئی اور کسی زہریلی ناگن کی طرح پھنکارتی ہوئی زینے کی
طرف لپکی۔ اُس کا چہرہ نفرت اور غصے سے لال ہو رہا تھا۔ اُس کے قدم زمین پر ٹھیک
سے نہیں پڑ رہے تھے۔ اگلے لمحے وہ نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

میں نے کمرے میں آ کر روشنی گل کی۔ دروازہ بند کر کے اندر سے چٹخنی لگادی۔ بستر پر
بیٹھ کر میں نے سکون و اطمینان کا سانس لیا کہ میں غلاظت کے دلدل میں گرنے سے بچ
گیا۔ اگر سرداراں نے اندر سے دروازے کی چٹخنی لگائی ہوتی، چند لمحوں تک وہ میرے

قریب رہتی تو میرے پیر کا پھسل جانا یقینی تھا۔ میرے جذبات قابو سے باہر ہو رہے تھے۔

O

صبح میرے لئے شمسہ ناشتہ لے کر آئی تھی۔ جب بھی میرا سرداراں سے سامنا ہوا تو
میں نے اُس کے چہرے اور آنکھوں میں نفرت، غصے اور انتقام کی آگ نہیں دیکھی لیکن
اُس کے دل و دماغ میں جو لاوا پک رہا تھا وہ زہریلا تھا، اسے میرے ذہن نے محسوس کر
لیا تھا۔ وہ ایک اداکارہ بھی تھی۔ اُس کا ظاہر اور تھا، باطن اور تھا۔ اُس نے دل میں عہد کیا
ہوا تھا کہ وہ ہر قیمت پر مجھے فتح کر کے رہے گی، میری پارسائی کی دھجیاں بکھیر دے گی۔

دو دن اور دو راتیں سکون و اطمینان اور ایک طرح سے خیر و عافیت سے ہی گزر گئی
تھیں۔ وہ اس موقعے کی تاک میں تھی کہ مجھے دبوچ لے۔ لیکن اُسے اس کا موقع نہ مل سکا
کیونکہ دو دن مجھے بے بی کسی کام سے یونیورسٹی لے گئی تھی۔ صبح دس بجے جا کر وہ سہ پہر
کے وقت لوٹی تھی۔ واپس ہوئی تو شام کے وقت مجھے بیگم مہرین اپنے ہمراہ لے گئی تھی۔

پہلے دن وہ دن ڈوبنے کے بعد مجھے ڈیفنس کے ہی ایک اعلیٰ درجے کے بیوٹی پارلر لے
کر پہنچی تھی۔ وہ ڈیڑھ گھنٹے کے بعد باہر آئی تو یکسر بدلی ہوئی کسی دُلہن کی طرح دکھائی دے
رہی تھی۔ گھر پہنچ کر وہ کپڑے بدل کر آئی تو اُس کا حسن و شباب دو آتشہ بن گیا۔ نامناسب
سے لباس میں وہ اور قیامت بن گئی تھی۔ اُس نے مجھے ساتھ لے لیا اور ایک فائیو اسٹار
ہوٹل پہنچی تو اس وقت رات کے نو بج رہے تھے۔ وہ رات تین بجے ہوٹل سے باہر آئی تھی۔

بیگم مہرین نے مجھ سے غلط بیانی کی تھی کہ اس ہوٹل میں ایک فنکشن ہے۔ رات کے دو
تین بھی بج سکتے ہیں۔ مجھے لاؤنج میں بیٹھ کر انتظار کرنے کے لئے کہا۔ وہ فنکشن کیا تھا میں
جانتا تھا۔ ایک چھ کروڑ کا ٹینڈر تھا۔ شہزاد رضا کو اس ٹینڈر کی ضرورت تھی۔ وہ اسے ہر
قیمت پر حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس کے حصول کا بہترین ذریعہ اور سفارش اُس کی بیوی
تھی۔ شہزاد رضا کو وہ ٹینڈر مل گیا۔ کیونکہ عورت ایک بہت بڑا کیش بھی ہے۔

میں اُس ہوٹل کے لاؤنج میں کل چھ گھنٹے تک بیٹھا مردوں اور عورتوں کی آمد و رفت
دیکھتا رہا، اُن کے ذہنوں کو پڑھتا رہا۔ صرف دو ایک بوڑھے ایسے ہوں گے جن کا تعلق
کالی دنیا سے نہ تھا ورنہ یہاں جو لوگ آجا رہے تھے، کمروں میں رہائش پذیر تھے، اُن میں
منشیات فروش، اسمگلر، فراڈیئے، لٹیرے اور کالے دھندے کے لوگ تھے۔ عورتیں اور

نوجوان کنواری لڑکیاں اپنے آشناؤں کے ساتھ آ رہی تھیں۔ اکثر عورتیں بیگم مہرین کی طرح سفارش تھیں۔ اُن کے خوبصورت چہروں پر ان گنت کالی لکیریں سجی ہوئی تھیں۔ چونکہ یہ سب دولت مند تھے اس لئے ان کے عیب سات پردوں میں چھپ گئے تھے۔

دوسری رات کوئی دس بجے جس وقت وہ گاڑی میں بیٹھنے والی تھی، شہزادرضا کی گاڑی اندر داخل ہوئی۔ وہ آج بھی کل کی طرح سجی ہوئی تھی۔ شہزادرضا نے اُس سے پوچھا۔ ''خیریت تو ہے......؟ تم کہاں جا رہی ہو؟''

''ارشد محمود کے ہاں......'' بیگم مہرین نے رسمی انداز سے جواب دیا۔ ''اُس کی بیگم نے کھانے پر کچھ سہیلیوں کو بلایا ہوا ہے۔ رات مجھے اُس کے ہاں سے واپسی میں دیر ہو سکتی ہے۔''

''یار! اُس سے کہنا کہ میں نے جو تین کروڑ کے قرض کی درخواست دی ہوئی ہے وہ اُسے سینکشن تو کر دے۔''

''ہاں، میں کہہ دُوں گی......لیکن اُس نے کمیشن کے بارے میں پوچھا تو اُس سے کیا کہوں گی؟''

''دو فیصد......'' شہزادرضا نے کہا۔ ''اتنی بڑی رقم پر دو فیصد کمیشن خاصا ہوتا ہے۔''

''میرا خیال ہے کہ وہ دو فیصد پر تیار نہیں ہوگا۔'' بیگم مہرین نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

''تمہارے کہنے پر شاید تیار ہو جائے......تم اُس سے کہنا کہ میں تین فیصد سے کم ہوں کیا؟'' شہزادرضا مسکرایا۔

شہزادرضا کے علم میں یہ بات تھی کہ ارشد محمود کی بیوی اور بچے سیر و تفریح کے لئے سوات گئے ہوئے ہیں۔ بیگم مہرین کو اس بات کا احساس تھا کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو دھوکہ دے رہے تھے۔ شہزادرضا جانتا تھا کہ وہ ارشد محمود کے پاس وقت گزاری کے لئے جا رہی ہے۔ وہ اُسے روک نہیں سکتا تھا۔ وہاں جانے سے باز نہیں رکھ سکتا تھا۔ کیونکہ بیگم سے جو کام نکلتے تھے وہ لاکھ روپے خرچ کرنے سے بھی نہیں نکل سکتے تھے۔

میں ڈیفنس سوسائٹی کی گلیوں سے گزرتا ہوا عالیشان، وسیع و عریض اور جدید طرز کے بنگلوں کو دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ اس علاقے میں سارے مکان کیا کالی دنیا کی آبادی ہے؟ کروڑوں کی مالیت کے بنگلے اور کوٹھیاں......ان میں لاکھوں کا آرائش و زیبائش کا

ساز و سامان......نئی اور قیمتی گاڑیاں......کیا یہ سب رزق حلال کی کمائی سے آ سکتی ہیں؟ سرداراں ایک اچھی عورت نہ تھی لیکن اُس نے یہ بات بالکل سچ کہی تھی کہ...... یہ کالی دنیا ہے۔ یہاں رہنے والوں کے چہروں پر کالک لگی ہوئی ہے، کالی لکیریں کھنچی ہوئی ہیں۔

ارشد محمود کے بنگلے کے باہر ایک گاڑی بھی پارک نہ تھی، نہ اُس کے برآمدے میں زندگی کے آثار تھے۔ برآمدے میں ایک بلب روشن تھا اور اندر کے دو کمروں کی کھڑکیوں پر جو پردے پڑے تھے اُن میں سے روشنی چھن رہی تھی۔ میں نے گاڑی سے اُتر کے مؤدبانہ انداز میں دروازہ کھولا تو بیگم مہرین اپنا پرس سنبھالتی ہوئی سراپا سمیٹ کر گاڑی سے اُتری۔ اُس نے ساڑھی کا پلو درست کرنے کے بعد پرس میں سے سو روپے کا نوٹ نکال کر میری طرف بڑھایا۔

''سالار! تم کھانا کھا آؤ۔ گاڑی میں ہی بیٹھے رہنا۔ شاید رات کے ایک دو بج جائیں۔''

بیگم مہرین نے اطلاعی گھنٹی کا بٹن دبایا تو تھوڑی دیر کے بعد دروازہ کھلا اور ایک وجیہہ شخص باہر آیا جس کی عمر چالیس برس کی ہوگی۔ پھر وہ بیگم مہرین کو دزدیدہ نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''آج تم بڑا غضب ڈھا رہی ہو۔''

میں تین بجے تک بیگم مہرین کے انتظار میں جاگتا رہا۔ میرے ذہن نے ان دونوں کے ذہنوں سے رابطہ کر لیا تھا۔ بیگم مہرین کو بھی دولت کی افادیت ضرورت اور اہمیت کا احساس تھا۔ اُس کے نزدیک بھی دولت ہی سب کچھ تھی۔ امریکہ اور یورپ کی سیر و سیاحت اور تفریح ہو جاتی تھی۔ دنیا کے بہترین ہوٹلوں میں قیام...... وہاں کی رنگینیوں سے محظوظ ہونے کا سنہری موقع ملتا تھا۔ اور پھر یہاں ایک خوابناک زندگی تھی۔ یہ سب کچھ دولت کے طفیل تھا۔ سوسائٹی میں ایک حیثیت تھی، عزت تھی۔ حمام میں سبھی ننگے تھے۔ وہ سب یہ جانتے تھے کہ کالا دھن کیسے آتا ہے......؟ اس کے لئے بہت کچھ کالا کرنا پڑتا ہے۔ بدن، راتیں، وجود...... بے ضمیر ہونے سے یہ سب کچھ ملتا ہے۔ صرف یہی ایک نہیں......صرف بیوی ہی نہیں، بیٹی اور بہن بھی ترقی کا ایک زینہ ہوتی تھی۔ اُس کے شوہر نے کاروبار اور صنعتوں کے قیام کے بہانے جو کروڑوں کا قرض لیا ہوا تھا، وہ واپس کرنے کے لئے نہیں لیا تھا۔

بیگم مہرین، ارشد محمود کی بیوی نازنین کی سہیلی تھی۔ نازنین بہت حسین نہ تھی اور نہ ہی

بے حد پُرکشش...... لیکن اُس کا باپ نہ صرف دولت مند بلکہ بہت ہی با اثر اور بارسوخ
تھا۔ نازنین سے شادی کرنے سے اُس کا مستقبل درخشاں بن سکتا تھا اس لئے اُس نے
نازنین سے شادی کر لی۔ آج وہ اس مقام پر تھا کہ دولت مند لوگ اپنی بیویوں، بیٹیوں
اور بہنوں کو اُس کے صرف ایک اشارے پر بستر کی زینت بنانے کے لئے پیش پیش رہتے
تھے۔ کیونکہ اس طرح اُن کی دولت، حیثیت اور عزت میں اضافہ ہوتا تھا اور وہ ایک
خوابناک زندگی گزار سکتے تھے۔

ارشد محمود اس پر ریشہ خطمی ہو چکا تھا۔ گو وہ اُس سے غیر محسوس انداز سے خاصا بے
تکلف سا ہو گیا تھا۔ اپنی بیوی کی غیر موجودگی میں کھل کر باتیں کرتا۔ شوخ لہجے میں بہت
ساری باتیں کہہ جاتا۔ اُس کی زندگی میں جو لڑکیاں آ رہی تھیں اُن میں سب حسین ہوتی
تھیں۔ جو اپنی بیوی، بیٹی اور بہن کا نذرانہ پیش نہ کرتا وہ کسی ماڈل گرل کو یا اداکارہ کو ارنج
کر دیتا۔ ارشد محمود کی پسند اور ذائقہ تیس اور چالیس برس کی عورت تھی۔ وہ عورت میں
صرف حسن نہیں دیکھتا تھا، اُس کے نزدیک اصل حسن اور کشش اس کے سراپا اور پُرشباب
بدن کا گداز ہوتا تھا۔ بیگم مہرین جیسا سراپا اور گداز ہر عورت اور لڑکی میں نہیں ہوتا تھا۔ ایسا
گداز چھتیس برس کی عمر کے بعد ایک عورت میں پیدا ہوتا اور پچاس برس کی عمر تک موجود
رہتا۔ وہ جانتا تھا کہ شہزاد رضا اپنی بیوی کو کریڈٹ کارڈ کی طرح کہاں کہاں استعمال کرتا
ہے۔ لیکن یہ شکار آسان نہ تھا۔ شہزاد رضا نے جب تین کروڑ کے قرض کی درخواست دی تو
اس کی گوٹ پھنس گئی۔ اب اندھیرے میں اُمید کی کرن دکھائی دینے لگی۔

ادھر شہزاد رضا نے اپنی بیوی سے کہا تھا...... ارشد محمود سے مل کر اُس کا قرضہ منظور کرا
لے۔ اس جملے کی تہہ میں جو گہرائی تھی، جو جذبہ کارفرما تھا وہ اس کے لئے ایک اشارہ تھا۔
مزید وضاحت اور دُور جانے کی بات نہ تھی۔ دوسری طرف ارشد محمود نے اُس سے کہا تھا
کہ اُس کی بیوی اور بچے سوات گئے ہوئے ہیں۔ وہ کسی روز اُس کے غریب خانے پر
رات کا کھانا کھا لے۔

خواب گاہ کا دروازہ بند کرنے کے بعد ارشد محمود بستر پر بیٹھ گیا۔ اُس کے دل میں بیگم
مہرین سے انتقام لینے کی آرزو بھی تھی۔ کیونکہ بیگم مہرین نے دو ایک مواقع پر اُس کی حوصلہ
افزائی نہیں کی تھی، غیر محسوس انداز سے جھڑک دیا تھا۔ اُس نے اپنے جوتوں کی طرف اشارہ

کرتے ہوئے کہا۔ ''میری جان! میں یہ چاہتا ہوں کہ تم ایک روایتی عورت کی طرح اپنے
ان خوبصورت اور پیارے پیارے، گورے گورے اور سڈول ہاتھوں سے جوتے اُتار دو۔
نجانے کیوں مجھے وہ عورت بہت اچھی لگتی ہے جو شوہر کے پیروں سے جوتے اور موزے
اُتارتی ہے۔ میری بیوی نہ صرف جوتے، موزے اُتارتی ہے بلکہ پہناتی بھی ہے۔''

بیگم مہرین نے چونک کر حیرت سے اُس کی طرف دیکھا۔ کسی مرد نے کیا، کبھی اُس
کے شوہر نے بھی بھولے سے بھی اُس سے جوتے موزے اُتارنے کے لئے نہیں کہا تھا۔
وہ متعجب لہجے میں بولی۔ ''تم مذاق تو نہیں کر رہے ہو؟''

''نہیں...... یہ مذاق نہیں ہے......'' اُس نے کہا۔ ''تم نے مجھ سے کہا تھا کہ میں دُلہن
بن کر آؤں گی۔ یہ ہماری سہاگ کی پہلی رات کی طرح ہوگی۔ تم اس رات میری ہر بات
مانو گی چاہے وہ کتنی ہی غلط اور نامناسب کیوں نہ ہو۔ گو یہ درخواست تمہارے لئے
نامناسب سی ہے لیکن اس میں میری خوشی پوشیدہ ہے۔ پلیز! تم کچھ خیال مت کرنا۔''

بیگم مہرین کو خاموش اور متذبذب سا پا کر اُس نے کہا۔ ''کیا تم نے میری ہر بات
ماننے کا وعدہ نہیں کیا تھا؟''

''کیا تھا......!'' بیگم مہرین نے اپنی گردن ہلائی۔ ''مجھے اپنی بات یاد ہے۔'' وہ بہت
دھیمے لہجے میں بولی۔

''تو پھر اس نیک کام میں دیر کس بات کی...؟ یہ تذبذب کیسا...؟ جلدی کرو... کم آن..
کیونکہ میں ایک ایک پل کو یادگار اور ناقابل فراموش بنانا چاہتا ہوں۔''

اُس نے چٹکی بجا کر اپنے جوتوں کی طرف اشارہ کیا۔ ذلت کے احساس سے بیگم
مہرین کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اُسے تین کروڑ کا قرض حاصل کرنا تھا۔ وہ اسے اسی صورت میں
مل سکتا تھا کہ ارشد محمود کو خوش کر دے۔ پھر اور قرضوں کے لئے بھی راستہ کھل سکتا تھا۔
اسے یہ راستہ کھولنا پڑے گا۔ وہ ناچار اپنے قیمتی اور عروسی لباس کی پرواہ کئے بغیر اُس کے
قدموں میں بیٹھ گئی۔ جوتے اُتر جانے کے بعد ارشد محمود نے موزے اُتارنے کا اشارہ
کیا۔ ارشد محمود کے موزوں سے آتی ہوئی بو اُسے بے حد ناگوار گزر رہی تھی۔ مگر اب وہ
اُس کے قدموں میں بیٹھ چکی تھی۔ اور جب کوئی کسی کے قدموں میں بیٹھتا ہے تو اپنا اختیار
کھو بیٹھتا ہے۔ قدموں میں بیٹھنے کا مطلب اپنے حقوق سے دست برداری ہوتا ہے۔ وہ

بھی کچھ حاصل کرنے کے لئے کچھ گنوا رہی تھی۔ ایک پُرتعیش زندگی کے لئے اپنی انا کو روند رہی تھی۔ اُسے کبھی کسی مرد نے اس قدر ہلکا نہیں کیا تھا۔ لیکن مجبوری تھی۔ مجبوری سے بڑی ظالم شے کوئی نہیں ہوتی۔

ارشد محمود نے اُس کے سرخ چہرے اور ذلت کے احساس کی لکیروں کو فاتحانہ نظروں سے دیکھا جو صاف ظاہر ہو رہی تھیں۔ وہ اس صورت حال سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اُس نے اُس روز من مانی کرنا چاہی تھی تو بیگم مہرین کیسی بے رُخی سے پیش آئی تھی۔ آج اس عورت کی انا اور بے رُخی کہاں گئی؟ آج اس نے اپنے جوتوں سے اسے کس طرح مسل دیا، روند دیا۔

اس لمحہ مجھے ایک جھپکی سی آ گئی۔ میرے ذہن کا رابطہ منقطع سا ہو گیا تھا۔ پھر میں نے کچھ دیر بعد ایک سسکی سی لی۔ چشم تصور میں میں نے دیکھا اس بار کا منظر پہلے سے زیادہ انوکھا تھا۔ ارشد محمود کسی فرعون کے انداز میں بستر پر بیٹھا ہوا تھا۔ بیگم مہرین فطری حالت میں اُس کے سامنے کھڑی اپنا گال سہلا رہی تھی جو انگارے کی طرح سرخ ہو رہا تھا۔ پھر اُس نے یکایک ہاتھ بڑھا کر بیگم مہرین کی گداز کمر کو دبوچ لیا اور پھر اُس کی موٹی موٹی کھردری اُنگلیاں بیگم مہرین کے دوسرے گال میں پیوست ہو گئیں۔ اُس نے اتنے زور سے چٹکی لی کہ بیگم مہرین کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

بیگم مہرین نے احتجاج نہیں کیا۔ اُس کے اندر جو نفرت اور غصے کی لہر اُٹھی تھی اُسے اُس نے اندر ہی دبا لیا۔ وہ مردوں کی فطرت سے واقف تھی۔ اُن کے تشدد، اذیت، ایذا اور حیوانیت نئی بات نہیں تھی۔ وہ اس کی عادی ہو چکی تھی۔

پھر اُس نے ظاہری پیار بھرے لہجے میں کہا۔ ”تم اس قدر جنگلی اور ظالم ہو گے، میں نہیں جانتی تھی......“

”تمہارے گال پھولوں کی طرح ہیں۔“ ارشد محمود نے اُس کے گالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ”تم پھول سے بھی نازک ہو۔“

”اور تم کس قدر مضبوط ہو...... تمہارا یہ سینہ کس قدر چوڑا چکلا اور مضبوط ہے۔“ وہ اُس کے سینے کے کالے گھنے بالوں میں اپنی مخروطی اُنگلیاں پھیرنے لگی۔ لیکن اُسکے دل میں نفرت کا طوفان اُٹھ رہا تھا، کاش! وہ اس کے منہ پر تھپڑ مار سکے۔ پھر اُس نے اس خیال کے

تے ہی ارشد محمود کے چہرے پر محبت بھری نظریں مرکوز کر کے ایک زوردار تھپڑ رسید کر دیا۔

”میری جان! کچھ خیال نہ کرنا...... سہاگ کی پہلی رات میں یہ تھپڑ تمہاری محبت، گرمجوشی اور والہانہ پن کو اور بڑھا دے گا۔ میں نے دیکھا ہے کہ مرد تھپڑ کھا کر وحشی ہو جاتا ہے۔ مجھے ایک عورت ہونے کے ناتے مردوں کا وحشیانہ پن بہت بھاتا ہے۔“

بیگم مہرین نے اپنی بات پوری کر کے اُس کے دوسرے گال پر دوسرا تھپڑ رسید کر دیا۔

”اوہ......“ ارشد محمود نے خفت سے اپنا گال سہلایا۔ ”محبت کے بدلے محبت، تھپڑ کے بدلے چٹکی...... میں چاہتا ہوں کہ تم میرے سارے جسم پر، چہرے پر ان نازک اور خوب صورت ہاتھوں سے تھپڑ مارو۔ اور میں تمہارے گالوں اور جسم کے ایک ایک حصے کی چٹکیاں لوں...... یہ حسرت کسی دن ہم دونوں پوری کر لیں گے۔“

”ہاں......“ بیگم مہرین نے سر ہلایا۔ ”یہ کھیل بہت دلچسپ اور نشاط انگیز ہو گا...... تم نے ابھی تک سراپا دکھائی نہیں دی۔“

”دیکھو میری جان!“ ارشد محمود کہنے لگا۔ ”میں روایت سے ہٹ کر سہاگ رات منانے کا قائل ہوں۔ اس وقت ہم دونوں میاں بیوی، دُلہا دُلہن ہیں۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ تم اپنے وعدے کا پاس کرو۔ تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ تم میری ہر بات مانو گی۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ پہلے تم میرے پیروں کو بوسہ دو...... انہیں اپنی آنکھوں کا عنوان بناؤ...... پھر میں تمہیں سرپرائز دوں گا۔“

بیگم مہرین نے دل میں سوچا، کچھ پانے کے لئے کھونا پہلی شرط ہوتی ہے۔ تین کروڑ کا قرض، اس کے حصول کے لئے وہ پیروں کو چوم سکتی ہے، ایک کتیا کی طرح چاٹ بھی سکتی ہے۔ جب اُس نے ارشد محمود کی تمام شرائط مان لی ہیں تو پیر چومنے میں کیا حرج ہے۔ اُس کے شوہر نے کہا تھا کہ تین کروڑ کی رقم بطور قرض مل جائے تو اس میں سے وہ پچاس لاکھ امریکہ، یورپ ٹور کے لئے دے دے گا۔

پھر وہ دوزانو ہو کر فرش پر اور اُس کے قدموں میں بیٹھ گئی۔ اُس کا دایاں پیر اپنے ہاتھوں میں تھام لیا، پھر اس پر بوسے ثبت کرنے شروع کر دیئے۔ پھر ایک کتیا کی طرح اُس کے پیر چاٹنے لگی۔ ایک پیر چاٹ چکی تو ارشد محمود نے میز پر سے ایک لفافہ اُٹھایا، اس میں سے ایک کاغذ نکال کر اُس کی طرف بڑھایا۔

"میری جان! یہ سہاگ رات کی نشانی ہے۔ تمہارے سراپا کی منہ دکھائی...... قرض کا منظور نامہ......"

بیگم مہرین نے کاغذ لے کر دیکھا اور اُسے میز پر رکھ دیا۔ پھر وہ اُس کا بایاں پیر ہاتھوں سے تھام کر اُسے چاٹنے لگی۔

جب وہ اُس پیر کو خوب چوم اور چاٹ چکی تو ارشد محمود نے لفافے میں سے ایک چیک سلپ نکال کر اُس کی طرف بڑھائی۔ "یہ لو تین کروڑ کی رقم کا چیک...... اب تو خوش ہو نا......؟" وہ اُس کی آنکھوں میں جھانکنے لگا۔

بیگم مہرین نے لیٹر اور چیک سلپ لے کر اپنے پرس میں رکھ لی۔ پھر اُس نے ارشد محمود کے پاس جا کر اُس کے گلے میں اپنی مرمریں بانہیں حمائل کر کے اُس کے چہرے پر جھکنے لگی۔

اسی لمحے مجھے نیند کی پری نے اپنی آغوش میں لے لیا۔ میں گہری نیند سو گیا۔

جب میں بیدار ہوا تو دیکھا کہ بیگم مہرین تھکی تھکی سی آ رہی تھی۔ اُس کا لباس بے ترتیب ہو رہا تھا۔ اُس کی چال میں لغزش تھی جیسے اُس نے خوب چڑھا رکھی ہو۔ اُس کی آنکھیں بار بار بند ہوئی جا رہی تھیں۔ اُس کے چہرے پر درد اور اذیت کے آثار تھے جیسے اُسے تشدد کا نشانہ بنایا گیا ہو۔ ارشد محمود جیسے اذیت پسند شخص ہو۔ وہ حیوان فطرت کا تھا۔ اُس کی نزدیک ایک عورت حیوان اور کھلونا تھی۔

جب گاڑی چل پڑی تو بیگم مہرین نے پرس سے موبائل فون نکالا، پھر اُس نے شہزاد رضا سے رابطہ کیا۔ "میری جان! مبارک ہو.. تین کروڑ کا چیک مل گیا۔ قرضہ منظور ہو گیا۔"

دوسری طرف سے شہزاد رضا نے کہا۔ "اُس نے کیا واپسی کی مدت وغیرہ کے بارے میں کچھ کہا؟"

"کیسی واپسی....؟ کیسی مدت....؟ کیا قرض واپس لینے کے لئے دیا جاتا ہے؟ میں گھر آ رہی ہوں۔ پھر تم سے اس موضوع پر بات ہو گی.... سو مت جانا۔" وہ لگاوٹ سے بولی۔

موبائل فون آف کر کے اُس نے پرس میں رکھ لیا۔ پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اپنی تذلیل اور توہین پر...... ارشد محمود نے اُس کے ساتھ کچھ ایسی زیادتی کی تھی جو ایک شریف اور مہذب آدمی کو زیب نہیں دیتی تھی۔ اُسے کتیا بنا دیا تھا۔ اُسے اس قدر گرنا پڑا تھا

وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ وہ سسکیوں کے درمیان سوچتی بھی جا رہی تھی کہ غلاظت کے ل میں گرنے کے بعد کوئی بات ناروا نہیں رہتی...... ہر بات اور درد سہنا پڑتا ہے۔

○

دوسرے دن کوئی ایک بجے گھر کے سارے کام نمٹانے کے بعد سرداراں اپنی بیٹی شمسہ لے کر چلی گئی تھی۔ گھر میں صرف بے بی اور خانساماں رہ گئے تھے۔ بیگم مہرین امریکہ اور پ کے ٹور کا پروگرام بنانے کے لئے اپنی ایک سہیلی کے ہاں گئی ہوئی تھی۔ کوئی دو بجے بی کی چھ عدد سہیلیاں تین گاڑیوں میں اُس سے ملنے کے لئے آئی تھیں۔ اُن میں سے سہیلی فارینہ دو وڈیو کیسٹ لے کر آئی تھی۔ یہ سب بے بی کے کمرے میں گھس گئیں۔ بی نے دروازہ بند کر کے اندر سے چٹخنی لگا دی۔ پھر اُس نے وی سی آر پر ایک فلم لگا میں برآمدے میں بیٹھا اپنے ذہن سے اُن کے ذہنوں سے رابطہ کئے ہوئے تھا۔

وہ سب ممنوعہ فلم دیکھ کر خوش ہو رہی تھیں، چہک رہی تھیں اور محظوظ ہو رہی تھیں اور س میں نوک جھونک اور چھیڑ کر رہی تھیں۔ تبصرے بھی ہو رہے تھے...... جب ایک فلم ختم ئی تو بے بی نے دروازہ کھولا، پھر اُس نے مجھے آواز دی۔ جب میں گیا تو اُس نے کہا۔

"خانساماں سے کہہ کر فریش لیمن جوس بنا کر لے آؤ!"

کولڈ ڈرنکس اور لیمن جوس پینے کے بعد پھر سے دروازہ بند ہو گیا اور دوسری فلم شروع ئی۔ یہ بھی ممنوعہ فلم تھی۔ فلم ختم ہونے کے بعد فارینہ نے کہا۔ "یہ دونوں فلمیں کس قدر جواب تھیں۔ یہ کل ہی مارکیٹ میں آئی ہیں۔"

"اچھی فلمیں بہت مشکل سے ملتی ہیں۔" بے بی نے کہا۔ "میں دو دن پہلے جو فلمیں ئی تھی، وہ کوئی خاص نہ تھیں۔"

"اچھی فلموں کے لئے شہر کی خاک چھاننا پڑتی ہے۔" فیروزہ بولی۔ "میں ڈیفنس کی یو کی دکانوں سے منہ مانگا کرایہ دے کر فلمیں لاتی ہوں۔ اس کے علاوہ کلفٹن کی وڈیو نی پرانی فلمیں مل جاتی ہیں۔"

"ہر مہینے دس نئی فلمیں مارکیٹ میں آتی ہیں جو پورے شہر کی دکانوں پر ملنے لگتی ہیں۔" رینہ نے کہا۔ "اس وقت میرے پاس کل تین سو پچپن فلمیں ہیں جن میں ہندوستان کی ی فلمیں بھی شامل ہیں۔"

"مجھے تو ہندوستانی فلمیں ایک آنکھ نہیں بھاتی ہیں کیونکہ ان میں ڈائیلاگ نہیں ہوتے۔" بے بی نے کہا۔ "بیک گراؤنڈ میں موسیقی بجتی رہتی ہے۔ فوٹوگرافی بھی ناقص ہوتی ہے۔ انگلش فلموں کے مقابلے میں بڑی پھسپھسی ہوتی ہیں۔"

"ارے...... تمہیں ایک بہت ہی دلچسپ اور پُر لطف اور مزے دار خبر سناؤں؟" شہلا نے چہکتے ہوئے کہا۔

"کیوں نہیں؟" ساجدہ نے کہا۔ "ہم بہت دنوں سے کوئی نئی خبر سننے کو ترس گئی ہیں۔"

"میری ہم جماعت فریدہ ہے نا......" شہلا کہنے لگی۔ "تین دن پہلے کی بات ہے وہ مجھ سے ملنے اور نوٹس لینے آئی تھی۔ اُس کی گاڑی خراب ہوگئی تو میں نے بھائی جان سے کہا کہ اسے گھر چھوڑ آؤ...... وہ گلشن اقبال میں رہتی ہے۔ بھائی جان نے باتھ آئی لینڈ میں ایک نیا فلیٹ خریدا ہوا ہے اور اُسے کرائے پر دینے کے لئے ڈیکوریٹ کر رہے ہیں۔ وہ اُسے کسی بہانے وہاں لے گئے۔ بھائی جان کی نیت خراب ہوگئی۔ دوسرے دن اُس نے مجھے ٹیلی فون کیا اور رونے لگی کہ بھائی جان نے اس کی بے حرمتی کر دی...... میں نے اُس سے کہا کہ بیوقوف اس میں رونے کی کیا بات ہے؟ یہ خوشی کی بات ہے کہ تمہیں ایک خوبصورت مرد نے اس قابل جانا...... یہ عزت وزت کچھ نہیں ہوتی۔ یہ پرانے بڑے بوڑھوں کے ڈھکوسلے ہیں۔ دنیا کہاں سے کہاں جا رہی ہے۔ یہ موبائل فون اور انٹرنیٹ کا انقلابی دور ہے۔ امریکہ یورپ میں وہ لڑکی خوش نصیب مانی جاتی ہے جو کنواری نہیں رہ پاتی۔ اُس کی زندگی میں جتنے مرد اور لڑکے آئیں اُسے رشک بھری نظروں سے دیکھا جاتا ہے...... ڈیفنس، کلفٹن، باتھ آئی لینڈ، پی ای سی ایچ ایس، طارق روڈ، محمد علی سوسائٹی اور کے ڈی اے سکیم نمبر ایک میں بمشکل ایک فیصد لڑکیاں کنواری ملیں گی۔ ان علاقوں کی لڑکیاں ترستی ہیں کہ ان کی زندگی میں زیادہ سے زیادہ مرد آئیں۔ مجھے ہی دیکھ لو...... در لڑکے میری زندگی میں آچکے ہیں۔ میں نے اور میری سہیلیوں نے کبھی اخلاقیات کو ذہن اور اعصاب پر سوار نہیں کیا...... ہم ہر وقت خوش رہتی ہیں۔ مذہب اور تہذیب کے بندھنوں کو نہیں مانتی ہیں۔ اس لئے کہ جسم ہماری اپنی ملکیت ہے۔ ہماری مرضی...... تمہیں خوش ہونا چاہئے کہ میرے ہینڈسم بھائی جان نے تمہیں اپنے قابل پایا...... وہ ایسی ویسی اور عام قسم کی لڑکیوں کو گھاس نہیں ڈالتے۔ تم وقت کے ساتھ چلو...... عزت و آبرو کا خناس ذہن میں مت پالو۔"

"تمہاری اس مدلل اور ناصحانہ تقریر سن کر اُس نے کیا کہا؟ اُس کا ردِعمل کیا تھا؟" رینہ نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"وہ کہنے لگی کہ میں ایک شریف لڑکی ہوں۔ تم اب مجھے بھابھی بنا کر لے جاؤ۔" شہلا نے جواب میں بتایا۔

"فول......!" ساجدہ نے ایک قہقہہ لگایا۔ "اس طرح تو ہم میں سے تین کو بھی بھابھی بنانا ہوگا۔"

"یہ جو نچلا اور متوسط طبقہ ہوتا ہے ان کے ذہنوں میں مذہب کا بڑا خناس ہوتا ہے۔" بے بی کہنے لگی۔ "یہ لوگ لڑکی کی عزت و آبرو کو جان سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ ایک لڑکی اپنی آبرو بچانے کے لئے جان تک قربان کر دیتی ہے۔ گو پہلے ایسا بہت ہوتا تھا لیکن آج بھی ایسی احمق لڑکیوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔ یہ لوگ بڑے جذباتی ہوتے ہیں۔"

"جوانی ایک طرح سے چار دن کی چاندنی ہوتی ہے۔" نشاط جو اتنی دیر سے خاموش تھی اُس نے زبان کھولی۔ "یہ دقیانوسی اور بوڑھے لوگ چاہتے ہیں کہ لڑکیاں اپنے ارمانوں، اُمنگوں اور حسرتوں کو شادی تک تھپک تھپک کر سلاتی رہیں۔ کوئی ارمان پورا نہ کریں...... جوان لڑکیاں برف کا تودہ نہیں ہوتیں۔ جوانی اس لئے نہیں ہوتی کہ اس کا گلا گھونٹ دیا جائے۔ یہ ہمارا بنیادی حق ہے کہ ہم زندگی اپنی مرضی اور خوشی سے گزاریں۔ سیکس ہماری ضرورت ہے۔ ایک فرض کی طرح ہے۔ بلوغت کے بعد ہم جس انداز سے چاہیں پورا کر سکتی ہیں۔ مرد اور عورت کے درمیان جسم کا رشتہ اتنا ہی ضروری ہے جیسے کھانا...... یہ ایک فطری تقاضہ ہے۔ ہم فطرت سے لڑ نہیں سکتی ہیں۔ ایک مرد کتنی ہی لڑکیوں سے دل بہلا سکتا ہے تو ایک لڑکی ایسا کیوں نہیں کر سکتی...... اسے بھی مرد کی طرح آزادی حاصل ہونی چاہئے۔"

"ہیر...... ہیر...... ہیر......" دو ایک لڑکیوں نے پُرجوش انداز سے تالیاں بجائیں۔

"اس وقت ہمارے کلب میں کل تیس ایسی لڑکیاں ممبر شپ لے چکی ہیں جو ہماری ہم خیال ہیں۔" نشاط بولی۔ "میرا مشورہ تو یہ ہے کہ ڈیفنس، کلفٹن، کے ڈی اے سکیم نمبر ایک، طارق روڈ اور سوسائٹی کی لڑکیوں کے علاوہ کسی اور علاقے کی لڑکیوں کو ممبر نہ بنایا

جائے کیونکہ وہ ہماری طرح آزاد خیال نہیں ہیں۔ وہ مغرب سے مانوس تو ہیں لیکن فرز لائف اور سوسائٹی کی قائل نہیں ہیں۔ ہر لڑکی کے خیالات کو اچھی طرح پرکھ کر اسے ممبر بنا چاہئے۔''

''میں خود بھی یہی چاہتی ہوں۔'' بے بی نے تائیدی لہجے میں کہا۔ ''ہم خیال لڑکیاں ہوں تو پھر ہر قسم کے پروگراموں میں انہیں بھی شریک کر سکتی ہیں۔ اُنہیں کوئی جھجک، تذبذب اور تامل بالکل بھی نہیں ہوتا ہے۔ وہ لڑکیاں ہمارے لئے بہت سوٹ کرتی ہیں جو یورپ اور امریکہ میں پیدا ہوئیں، برسوں وہاں رہیں، جن کی آمد و رفت یہاں رہتی ہے اور جو فری سوسائٹی کی قائل ہیں اور کسی بھی قسم کی پابندی کو نہیں مانتی ہیں۔''

''میرا خیال ہے کہ ایسی ہی لڑکیاں ہمارے کلب کی ممبرز بھی ہیں۔'' شہلا بولی۔

''نسیم جہاں کے بارے میں کیا خیال ہے......؟ وہ صرف فلمیں دیکھتی ہے، ہماری سیکس پارٹی میں نہیں آتی ہے...... اُسے جب زیب نے رقص کے دوران گود میں اُٹھا لیا تو اُس نے اُس کی پٹائی کر دی تھی۔'' نشاط نے کہا۔

''نسیم جہاں بہت جلد راہ راست پر آ جائے گی...... اصل بات یہ ہے کہ اُس کے باپ کے پاس پہلی بار دولت آئی ہے۔ وہ ناظم آباد سے ڈیفنس آئی ہے۔ اُس کا ذہن پوری طرح کھلا نہیں ہے۔ وہ شراب سے بھی دُور بھاگتی ہے۔ اُسے اپنے ماں باپ کا خوف زیادہ ہے، لیکن اُس کی ممی میری ممی کی سہیلی بن گئی ہیں۔ میری ممی اُنہیں اپنے رنگ میں رنگ رہی ہیں۔ وہ خود بھی یہی چاہتی ہیں کہ یہاں کے ماحول میں اپنے آپ کو پوری طرح ڈھال لیں۔ وہ شیمپین پینے لگی ہیں، بس ذرا صبر کی ضرورت ہے۔ میں ایک مہینے میں اُسے کچھ کا کچھ بنا دُوں گی۔ تم لوگ دیکھنا، وہ ہم سب سے سبقت لے جائے گی۔'' فارینہ بولی۔ ''ضرورت اس بات کی ہے کہ اُسے روز وی سی آر پر فلمیں دکھائی جائیں۔ وہ چونکہ میری پڑوسی ہے، اُسے شیشے میں اُتارنا میرا کام ہے۔''

''بے بی! تمہارا یہ ڈرائیور جو ہے یہ کس کی دریافت ہے...... ممی، ڈیڈی یا تمہاری؟'' نشاط بولی۔

''ممی کی......'' بے بی نے جواب دیا۔ ''ممی اُسے کہیں سے لے کر آئی ہیں۔''

''تمہاری ممی کا ذوق بڑا اچھا ہے۔ اس انتخاب کی داد نہ دینا ناانصافی ہوگی۔ کیا یہ کچھ

ون کے لئے اُدھار مل سکتا ہے؟'' نشاط نے کہا۔ ''وہ کس قدر سویٹ اور ہینڈسم ہے۔ ہں تو اُسے دیکھتے ہی دل ہار بیٹھی ہوں۔''

''اتفاق سے اس قدر وجیہہ اور خوبصورت ڈرائیور ہمارے پاس پہلی بار آیا ہے۔ ورنہ ں سے پہلے ساٹھ ستر برس کی عمر کے بڈھے جن کی لمبی لمبی سفید داڑھیاں ہوتی تھیں اور اِنچ وقت کی نماز پڑھتے تھے، اُنہیں رکھا جاتا تھا۔ اب برسوں کے بعد چپکے سے ویرانے یں بہار آئی ہے۔ لیکن میں نے اس کے بارے میں سوچا نہیں اور نہ ہی ایسے کوئی ارادے یں۔ تم جانتی ہو، وکی اور میں دونوں ایک دوسرے کو کس قدر چاہتے ہیں۔'' بے بی نے کہا۔ ''اُسے اُدھار یوں نہیں دیا جا سکتا کہ ممی نے اُسے اپنا ڈرائیور رکھ لیا ہے۔ چونکہ وہ پنی کسی سہیلی کے ساتھ اُن کی گاڑی میں گئی ہیں اس لئے وہ گھر پر موجود ہے۔''

''تم ان نوکروں میں دلچسپی کیوں لیتی ہو؟'' شہلا نے کہا۔ ''یہ جاہل، اجڈ اور گنوار ہوتے ہیں۔ انہیں ذرا سر پر چڑھاؤ تو پھیلنے لگتے ہیں اور اپنی اوقات بھول جاتے ہیں۔ ہمیں اتنا بھی نہیں گرنا چاہئے۔ ان کے ہمارے درمیان جو فاصلہ ہے اسے برقرار رکھنا چاہئے۔ تم شاید دو ایک نوکروں کو شکار کر چکی ہو جو اٹھارہ بیس برس کے درمیان تھے۔''

''جب ہمارے گھروں کے مرد، ملازماؤں سے تعلقات استوار کر لیتے ہیں اور بیویوں کو دھوکہ دیتے ہیں تو عورتوں کو بھی اس بات کا حق ہے۔ ہم تم بہت اچھی طرح جانتی ہیں کہ کتنی بیگمات اس پستی میں گری ہوئی ہیں۔ کیونکہ اُن کے شوہر مہینوں باہر رہتے ہیں۔ نوکر یا دوست...... دراصل رشتہ نوکر یا باس کا نہیں بلکہ مرد اور عورت کا ہوتا ہے۔ اسے صاحبوں اور بیگمات کی ضرورت اور مجبوری سمجھ لو۔ پرائیویٹ سیکرٹری سے تعلقات ہوں یا ملازمہ سے...... بات ایک ہی ہے۔ امریکہ اور یورپ کیا، ہندوستان میں بھی اور عرب ممالک میں بھی ایسا ہوتا ہے۔ فلپائنی مرد اور عورتیں شیخوں کے ہاں ملازمت کرتی ہیں۔ شیخوں کو جب اُن کی بیویاں بے راہ روی کا شکار پاتی ہیں تو پھر وہ انتقاماً اس راستے پر چل پڑتی ہیں۔ طبقے کو نہیں دیکھا جاتا۔ مرد عورت کو دیکھتا ہے اور عورت مرد کو...... ہمارے دوست چونکہ بڑے گھرانوں سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے ان سے تعلقات میں کوئی برائی نہیں ہے...... یہ سوچ غلط ہے۔ یہ دل کی بات ہے، وہ جس پر آ جائے۔ مرد نوکروں سے تعلقات ایک نیا تجربہ ہوتا ہے۔ تم لوگ جانتی ہو ہم سب تجرباتی دور سے گزر رہی ہیں۔ کتنی عجیب

سی بات ہے کہ ہمارے دوستوں کو یہ بات پسند نہیں کہ ہم کسی لڑکے میں گہری اور جذباتی دلچسپی لیں چاہے خود وہ دس لڑکیوں سے دل بہلائیں، مرد بڑا تنگ نظر ہوتا ہے۔ اس لئے اپنے دوستوں کو اپنے افیئرز کے بارے میں بالکل بھی نہ بتائیں۔ ہم آپس میں اس لئے ایک دوسرے کو بتا دیتی ہیں کہ ہم کلب کی ممبر ہیں، ہمراز ہیں، اور ایک دوسرے کی گہری دوست ہیں۔ میں تو دوست لڑکوں کو اعتماد میں لینے کی قائل بھی نہیں ہوں۔'' نشاط نے کہا۔

''ایک بار میرے ڈیڈی کو ممی نے رنگے ہاتھوں سولہ برس کی ملازمہ کے ساتھ پکڑ لیا۔'' ساجدہ کہنے لگی۔ اُس روز سے ممی پچاس برس کی بوڑھی، بھدی اور بے کشش ملازماؤں کو رکھنے لگی ہیں۔''

''تمہارے ڈیڈی ملٹی نیشنل کمپنی میں ایم ڈی ہے۔ ایک اتنا بڑا آدمی اتنا گر جائے...... تم نے سوچا بھی ہے کہ آخر اُنہوں نے ایسی حرکت کیوں کی؟ جبکہ اُن کی لیڈی سیکرٹری نعیمہ بہت حسین اور تیس برس کی بھرپور اور غیر شادی شدہ عورت ہے۔ میں اُن دونوں کو کئی بار سی ویو کے ایک ریسٹورنٹ میں آئس کریم کھاتے ہوئے دیکھ چکی ہوں۔''

''میرے ڈیڈی نے یہ حرکت اس لئے کی کہ وہ لڑکی بڑی پُرکشش تھی۔ اُس کی اُٹھان بڑے غضب کی تھی۔ ڈیڈی چھ سات ماہ سے اُس سے وابستہ تھے اور ہر ماہ اُسے دو ہزار روپے چوری چھپے دیتے تھے۔'' ساجدہ نے بتایا۔

''اصل بات یہ نہیں ہے۔'' نشاط نے کہا۔ ''تمہاری ممی وقت سے پہلے بوڑھی اور بے کشش ہو گئی ہیں۔ موٹی اور بھدی بھی...... مرد کو عورت کی طلب ہمیشہ رہتی ہے۔ اور عورت کو مرد کی...... اُس لڑکی کی طرف تمہارے ڈیڈی کا جھکنا فطری تھا۔''

''اوہ، ہاں یاد آیا......'' فارینہ بولی۔ ''کل امریکہ سے شازیہ آ گئی ہے۔ وہاں اُس نے دو تین کلب جوائن کئے ہوئے تھے۔ وہ لندن کے اُس جزیرے پر بھی گئی تھی جہاں لباس میں جانے کی ممانعت ہے۔ وہاں ہر عمر کے مرد اور عورتیں سن باتھ لینے آتی ہیں۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی بتا رہی تھی کہ وہاں لڑکیاں روز بروز کس قدر ایڈوانس ہو رہی ہیں، کیسے کیسے کلب قائم ہو گئے ہیں۔ وہ ایک کلب کا منصوبہ اور بہت سارا لٹریچر بھی لے کر آئی ہے۔ کیوں نہ کل رات میں اُسے اپنے ہاں ڈنر پر بلا لوں......؟''

''گڈ نیوز......'' شہلا بولی۔ ''بڑی کمینی چیز ہے۔ جتنے لڑکے اُس کے دوست اور

پروانے تھے، اتنے شاید ہی ہم میں سے کسی لڑکی کے رہے ہوں گے۔ بڑی شوخ اور فری قسم کی لڑکی تھی۔ اُس کے دم سے یہاں بڑی رونق رہتی تھی۔ چلو اچھا ہوا وہ آ گئی۔ وہ ہمارے میوزیکل گروپ کی جان بھی تھی۔ اُس کے رقص تماشائیوں کو پاگل کر دیتے تھے۔ اب تو اُس نے اور مہارت حاصل کر لی ہو گی۔''

''ہاں......'' فارینہ نے کہا۔ ''وہ کہہ رہی تھی کہ ہمارا پڑوسی ملک ہندوستان کس قدر ایڈوانس ہو گیا ہے اور ہوتا جا رہا ہے۔ جبکہ پاکستان اس کے مقابلے میں بہت پیچھے ہے۔ اُس نے بتایا کہ صرف دہلی میں ہمارے جیسے دس فری کلب موجود ہیں۔ جبکہ ممبئی، کلکتہ اور دیگر بڑے بڑے شہروں میں ان کی سینکڑوں شاخیں ہیں۔ جبکہ ہمارے ہاں کراچی، لاہور اور اسلام آباد میں صرف ایک ایک کلب ہے۔ ٹی وی پر میوزیکل گروپوں کو کچھ شرائط اور پابندی سے گانے کی اجازت ملتی ہے۔''

''ہمارے ملک میں چونکہ بنیاد پرست بہت ہیں اس لئے صرف تین کلب ہیں، وہ بڑے محتاط بھی ہیں۔ رہی بات ٹی وی پر آزادی سے میوزیکل شو پیش کرنے پر پابندی کی تو اب ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ٹی وی والے غیر محسوس انداز میں نرمی اور رعایت برتنے لگے ہیں۔ ڈسکو اور پاپ موسیقی کو زیادہ پیش کیا جا رہا ہے۔ تھرکنے کی اجازت ہے، رقص پر سے بھی پابندی ہٹا لی گئی ہے۔ ہندوستان سے موزانہ کیا جائے تو بہتر ہے۔ وہاں پڑھے لکھے اور آزاد خیال لوگ ہیں، اپنے مذہب سے بیگانہ ہیں۔'' نشاط بولی۔

''اچھا بھئی...... اب چلنا چاہئے۔'' شہلا نے کہا۔ ''شام کو کلب میں ملاقات ہو گی.... کیا شازیہ بھی آئے گی؟''

''میں اُسے اپنے ساتھ ہی لے آؤں گی......'' فارینہ نے کہا۔ ''وہ تم سب سے ملنے کے لئے سخت بے چین بھی ہے۔''

تھوڑی دیر کے بعد یہ رنگین تتلیاں برآمدے میں آ گئیں۔ میں اُنہیں دیکھ کر ایک طرف مؤدبانہ کھڑا ہو گیا۔ نشاط نے بے بی کو کہنی ماری، پھر اُس سے سرگوشی میں آہستگی سے انگریزی میں کہا۔ ''تمہاری ممی اجازت دے دیں تو میں اسے اپنے ہاں جاب دے دُوں۔''

''اگر یہ تمہیں اتنا ہی پسند ہے تو اس سے شادی کر لو۔'' فارینہ نے شوخی سے کہا۔

''اگر یہ راضی ہو جائے تو میں اسے شادی کے بغیر بھی ایک کرائے کے فلیٹ میں رکھ

لوں۔'' نشاط نے کہا۔

''ممی اجازت نہیں دیں گی...... بڑی مشکل سے تو یہ ہاتھ لگا ہے۔ اسے نظر تو نہ لگاؤ۔''
بے بی نے کہا۔

میں اُن کے حسین چہروں کو دیکھ رہا تھا جن کے چہروں پر اتنی کالی لکیریں تھیں کہ میں
گن بھی نہیں سکتا تھا۔ ہمارے ملک میں امریکہ تھا۔ اس کی سوسائٹی تھی، معاشرہ تھا۔ ایک
عام آدمی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ان پوش علاقوں میں اتنی گندگی اور غلاظت ہے جتنی
سیوریج لائن میں ہوتی ہے۔ یہ بھی اس معاشرے کی ایک سیوریج لائن تھی جو امریکہ سے
آئی تھی۔ میں نے ایک لمحے کے لئے سوچا...... اگر میں کسی کو یہ ساری باتیں بتاؤں تو کیا
کوئی اس کا یقین کرے گا......؟

○

سہ پہر ڈھلنے کے بعد بیگم مہرین واپس آئی۔ اُس نے گاڑی سے اُترتے ہوئے مجھ
سے کہا کہ میں سرداراں کو دس منٹ کے بعد بھیج دُوں۔ میں سرونٹ کوارٹر کی طرف چلا گیا
اور دروازے کے باہر کھڑا ہوگیا۔ سرداراں بھی تھوڑی دیر پہلے ہی شمسہ کو لے کر آئی تھی۔
اُن دونوں کے چہرے زرد تھے۔ وہ دونوں متفکر اور بہت پریشان بھی تھیں۔

سرداراں تشویش ناک لہجے میں اپنے شوہر سے کہہ رہی تھی۔ ''کیا بتاؤں...... میرا
شک درست ثابت ہوا۔ لیڈی ڈاکٹر نے پیشاب ٹیسٹ کیا۔ اُسے تین ماہ چھ دن کا حمل
ہے...... وہ ماں بننے والی ہے......''

''کیا کہا......؟'' خانساماں کی کرخت آواز کمرے میں گونج گئی۔ ''وہ کمینی، حرامزادی
حاملہ ہوگئی ہے؟''

''ہاں......'' سرداراں کی آواز بجھی ہوئی تھی۔ ''یہ تو ایک دن ہونا تھا۔ میں نے تم سے
کہا بھی تھا کہ یہاں سے نکل چلو...... ہم نے بہت سارا مال اکٹھا کرلیا ہے، بہت کچھ کر
سکتے ہیں۔ لیکن تم نے میری ایک نہ سنی......''

''اُسے کس نے حاملہ کیا ہے......؟ اُس سے پوچھا تم نے؟'' خانساماں دہاڑا۔

''ہاں......'' سرداراں کا لہجہ مُردہ ہو رہا تھا۔ ''وہ بتاتی نہیں ہے۔ اُس نے رو رو کر برا
حال کرلیا ہے۔''

''اب رونے سے کیا حاصل......؟'' وہ دہاڑا۔ ''مجھے قوی شک ہے یہ سب اُسی
شیطان کا کیا دھرا ہے۔''

''مجھے اِس کمینی سے ایسی اُمید نہیں تھی۔'' سرداراں تپتے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''اس
حرامزادی نے ہماری عزت کا خیال نہیں کیا، ہمارا چین سکون غارت کردیا...... اب تو ہم
کسی کو منہ دکھانے کے قابل بھی نہیں رہے۔'' وہ سسک پڑی۔

''اس کو دس جوتے مار کر پوچھو کہ یہ کس کی حرکت ہے؟'' خانساماں نے برہمی سے
کہا۔ ''نومی کی حرکت ہے یا پڑوس کے کسی ملازم کی...... وہاں تین چار جوان مرد ملازم
ہیں۔ وہ دیکھنے ہی میں بدمعاش معلوم ہوتے ہیں۔''

''میں نے اسے رُوئی کی طرح دھنک کر رکھ دیا لیکن وہ بتاتی نہیں ہے کہ یہ کس کی
حرکت ہے۔'' سرداراں کہنے لگی۔ ''مجھے تو یہ نومی کی حرکت ہی معلوم ہوتی ہے۔ وہ ایک
نمبر لوفر، لچا، لفنگا اور عیاش قسم کا ہے۔ وہ جب بھی کسی اپنی دوست لڑکی کو لے کر آتا ہے تو
اُوپر والے کسی بیڈرُوم میں بند ہوجاتا ہے۔ ظاہر ہے وہ دونوں کتاب تو نہیں پڑھتے ہیں۔
اُس نے شمسہ کو شاید لالچ دے کر شیشے میں اُتار لیا ہے۔ معلوم نہیں یہ گھناؤنا کھیل کب سے
کھیلا جارہا ہے۔''

''سؤر کی بچی......! کیا میں تجھ سے نہیں کہتا تھا کہ شمسہ کے چلن ٹھیک نہیں معلوم ہو رہے
ہیں۔ اُس کے پاس میک اپ کا سامان، نئے اور بھڑکیلے کپڑے اور کبھی کبھی اُس کے
ہاتھ میں سوسو کے نوٹ کہاں سے آرہے ہیں۔ اور پھر وہ کام سے جی چرانے لگی ہے۔ دیر
تک سوکر اُٹھتی ہے...... چھوٹی بیگم کے ساتھ انگریزی فلمیں دیکھتی ہے جو بہت واہیات
ہوتی ہیں۔ لیکن تو نے میری ایک نہیں سنی۔ تجھے کبھی اپنی جوان بیٹی کے لچھن کی فکر ہی نہیں
رہی...... آخر اس کلنکنی نے ہم سب کے منہ پر کالک مل دیا۔''

''میں نے تو سوچا بھی نہیں تھا کہ نومی ہماری بیٹی پر ڈورے ڈالے گا اور اس کی عزت
تباہ کردے گا...... کیونکہ وہ بڑے گھرانوں کی لڑکیوں کے ساتھ رنگ رلیاں مناتا ہے، ایک
خانساماں اور ماسی کی بیٹی پر بری نظر کیوں ڈالے گا؟ سچ پوچھو تو بے بی نے اُسے فلمیں دکھا
کر خراب کیا ہے۔ میں نے کبھی کوئی فلم نہیں دیکھی لیکن سنا ہے کہ انگریزی فلمیں بہت
واہیات اور گندی ہوتی ہیں۔''

یہ بات کہتے ہوئے اُسے احساس ہوا کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے۔ جب بے بی کمرے میں بند ہو کر فلمیں دیکھتی تھی، وہ بیڈ رُوم کی کھڑکی کے باہر کھڑی ہو کر اندر جھانکتی تھی۔ وہ پہلے سے پردہ اتنا ہٹا دیتی تھی کہ ایک جھری سی بن جاتی تھی اور یہ جھری ٹی وی سکرین دیکھنے کے لئے کافی ہوتی تھی۔ اور پھر اُس نے دو ایک مرتبہ شمسہ اور بے بی کو جذبات کی رو میں بہتے ہوئے بھی دیکھا۔ لیکن اُس نے کبھی شمسہ کو روکا ٹوکا اس لئے نہیں کہ بے بی کی بڑی مہربانیاں تھیں۔ اُس کے خیال میں بے بی کی نامناسب حرکتوں میں کوئی حرج نہیں تھا۔ اُس نے ایک روز شمسہ کے کمرے کی تلاشی لی تو ایک خفیہ جگہ پر اُس نے ہزاروں کی رقم دیکھی۔ شمسہ نے اسے کبھی بھولے سے بھی اعتماد نہیں لے کر نہیں بتایا تھا کہ اس کے پاس اتنی بڑی رقم کہاں سے آئی ہے؟ اُسے رقم گنتی کرنے کا موقع بھی نہیں ملا۔ وہ اس خیال سے بھی خاموش رہی تھی کہ کسی بہانے مال تو آ رہا ہے، گھر میں ہی ہے۔ جب بھی اس کی ضرورت پڑے گی تب اسے استعمال میں لایا جا سکتا ہے پھر اُسے وہ دن اور کالی راتیں یاد آ گئیں جب صاحب اُس کی مہربانیوں کے عوض اُس کی مٹھی گرم کر دیا کرتے تھے لیکن اب تو وہ اُس کی طرف نظر بھر کے دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے تھے۔ اُن کے بیٹے نے باپ کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے شمسہ کو شکار کر لیا تھا۔

”کیا سوچ رہی ہے......؟“ چند ساعتوں کی گہری خاموشی کے بعد خانساماں کی آواز گونجی۔ ”تو بیگم صاحبہ کو نومی کی بدکاری اور کارستانی کے بارے میں بتا...... اُنہیں صاف صاف کہہ دے کہ آپ کے بیٹے نے اچھا نہیں کیا۔ ہماری بیٹی کی عزت تباہ کر دی، ملیامیٹ کر دی۔ ہمیں اس سے یہ اُمید نہیں تھی۔ کیا شریف ماں باپ کی اولاد کے یہی لچھن ہوتے ہیں؟“

خانساماں نے ایک پل کے ہزارویں حصے میں سوچا...... کیا اس کی بیوی یہ بات مالکن سے کہہ سکے گی......؟ مالکن کون سی شریف عورت ہے...... وہ کون سی پارسا ہے...... وہ مالکن کی کالی راتوں کے سلسلے میں بہت دنوں تک ساتھی بنا رہا۔ مالکن نے اُس سے یہ تعلق ختم کر دیا کیونکہ اس اُس میں اس عمر میں ایسی بات نہیں رہی تھی کہ ایک عورت ان تعلقات کو قائم رکھے۔ جب تک مالکن کے بیڈ رُوم میں جاتا رہا، اُس کی حیثیت ایک طوائف مرد کی سی تھی کیونکہ مالکن اُس کی مٹھی گرم کر دیتی تھی۔ ان کالی راتوں میں وہ صرف

مرد اور عورت ہوتے تھے۔ اور پھر یہ بات بھی اُس سے ڈھکی چھپی نہیں تھی کہ صاحب اُس کی بیوی پر مہربانی کر رہا ہے۔ وہ جس دلدل میں گرا تھا اس سے باہر نہیں نکل سکا تھا، وہ اپنی بیوی کو کیسے نکالتا؟ لیکن ان دونوں نے صاحب اور مالکن سے خوب فائدہ اُٹھایا تھا، بہتی گنگا میں ہاتھ دھویا تھا۔

”لیکن میں یہ بات کیسے کہہ سکتی ہوں؟ مجھ میں اتنی جرأت کہاں سے آئے گی؟“ سرداراں سرد لہجے میں بولی۔

”کیوں نہیں کہہ سکتی ہو...... اُن کے بدچلن بیٹے نے ہماری معصوم بچی کی عزت پامال کر دی...... وہ اُمید سے ہو گئی ہے، کیا ہم خاموش رہیں......؟ یہ زہر پی لیں......؟ نہیں، یہ نہیں ہو سکتا...... اُن کے بیٹے کی یہ حرکت انہیں بہت مہنگی پڑے گی۔“

”وہ بڑے لوگ ہیں۔ اُن کے پاس دولت کی طاقت ہے۔ وہ اُلٹا ہم پر الزام لگا کر پولیس کیس بنا سکتے ہیں۔ ملازمت سے بھی نکال دیں گے۔ اور پھر اُن کے ہم پر بہت سارے احسانات بھی ہیں۔“ سرداراں نے ایک خیال کے زیرِ اثر آہستگی سے کہا۔ اُسے صاحب کی مہربانیاں یاد آنے لگیں۔

”کون سے احسانات......؟ کیسے احسانات......؟ کیا احسانات کئے ہیں اُن لوگوں نے......؟“ خانساماں غصے اور جذبات کی رو میں کہہ گیا تھا۔ پھر وہ یکلخت کچھ خیال آتے ہی خاموش ہو گیا۔

”میں اُن کا موڈ دیکھ کر اُن سے کہتی ہوں۔ آج یا کل تک کہہ دُوں گی۔ اُن سے اس طرح سے کہنا ہو گا کہ بات بن جائے، سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہیں ٹوٹے...... اتنی اچھی ملازمت ہمیں کہیں ملنے سے رہی۔“ سرداراں نے کہا۔

”تم اُن سے کیا کہو گی......؟“ خانساماں ٹھنڈا پڑ گیا۔ کیونکہ سرداراں نے ٹھیک ہی کہا تھا، وہ کسی قیمت پر یہاں کی ملازمت کو ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہتا تھا۔ ”کیا تم اُن سے شمسہ کی شادی کی بات کرو گی؟“

”ہاں...... اس کے سوا چارہ نہیں ہے کہ کسی لڑکے یا عمر والے آدمی کو پکڑ کر اُس کے سر شمسہ کو منڈھ دیا جائے۔“

”شادی سے پہلے اس کے حمل کا اسقاط ہونا ضروری ہے...... تمہیں یاد ہے بیگم صاحبہ

نے کس ہسپتال میں بے بی کا اسقاط کروایا تھا؟ اُن سے کہو کہ وہ بے بی کی طرح شمسہ کا بھی اسقاط کروادیں۔ اس طرح ہمارے آنسو خشک ہو سکتے ہیں۔''

''لیڈی ڈاکٹر نے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ اسقاطِ حمل اب نہیں ہوسکتا...... کسی نے اسقاط کرنے کی کوشش کی تو پھر بیٹی کی جان جاسکتی ہے۔ بہتر ہے کہ جلدی سے کہیں شادی کردو......'' سرداراں بولی۔

''ایک حاملہ لڑکی سے شادی کون کرے گا؟'' وہ تشویش سے بولا۔ ''شادی کے چھ ماہ بعد ہی وہ ماں بنے گی تو کیا لڑکے اور اُس کے گھر والوں کو شک نہیں ہوگا......؟'' خانساماں نے کہا۔

''یہ سوچنا اور اس کا حل نکالنا بیگم صاحبہ کی ذمہ داری ہے۔'' سرداراں بولی۔ ''کیونکہ یہ کرتوت اُن کے بیٹے کے ہیں۔''

''ارے سنو!'' خانساماں نے یکلخت مسرت بھرے لہجے میں کہا۔ ''یہ لڑکا سالار کیسا رہے گا؟ تم اس کے بارے میں بیگم صاحبہ سے بات کرو۔ یہ لڑکا بہت سدھا اور بہت خوبصورت بھی ہے۔ اسے بیوقوف بنایا جاسکتا ہے۔ اور پھر ان دونوں کی جوڑی بھی خوب رہے گی۔''

''ہاں...... سالار بہت مناسب رہے گا۔ ہم سوچتے ہیں، اور میں بیگم صاحبہ سے مشورہ بھی کرتی ہوں۔''

میں نے اسی اثناء میں دروازے پر دستک دی۔ چند ثانیوں کے بعد سرداراں نے دروازہ کھولا۔ پہلے تو وہ مجھے دیکھ کر چونکی، پھر حیرت سے پوچھا۔ ''کیا بات ہے......؟ کیسے آنا ہوا......؟''

''بیگم صاحبہ ابھی ابھی آئی ہیں...... وہ تمہیں بلا رہی ہیں۔'' میں نے جواب دیا۔ میں اتنا کہہ کر وہاں سے چلا آیا۔ اب میں چوکنا اور ہوشیار ہوگیا تھا۔ اب میرے لئے یہاں رُکنا فضول تھا۔ لیکن میں ابھی عجلت میں کوئی قدم اُٹھانا نہیں چاہتا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد بیگم مہرین، سرداراں کو اپنے ساتھ لے کر چلی گئی تو میں نے کمرے سے اپنا سوٹ کیس لیا، اُسے ہائی روف کی پچھلی نشست پر رکھ دیا۔ پھر میں نے خانساماں سے جاکر کہا کہ میں گاڑی کے بریک چیک کروانے جارہا ہوں۔ پھر میں اُسی ہوٹل میں پہنچا جہاں پہلے میں نے کمرہ لیا تھا۔ میں نے دوبارہ کمرہ کرایہ پر لیا اور سوٹ کیس کمرے میں رکھ کر چلا آیا۔

اس وقت تک بیگم مہرین اور سرداراں لوٹی نہیں تھیں۔

تھوڑی دیر کے بعد شہزاد رضا آ گیا۔ اس کے کچھ دیر کے بعد میں نے شمسہ کو سرونٹ کوارٹر سے نکل کر اندر جاتے ہوئے دیکھا۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد وہ صاحب کے کمرے میں چائے لے کر گئی۔ میں نے اُسے پریشان اور متفکر سا پایا۔ ظاہر تھا وہ شادی کے بغیر حاملہ ہوگئی تھی۔ اُس کا الھڑپن، شوخی، مٹک کر چلنا اور رعونت رخصت ہوچکی تھی۔

رات کے بارہ بج چکے تھے۔ میں اس وقت جاگ رہا تھا، تب میں نے زینے پر آہٹ سنی۔ میرے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ بھینی بھینی خوشبو کا ایک جھونکا آیا اور اُس نے مجھے جیسے معطر کردیا۔ پہلے جو خیال آیا وہ سرداراں کا تھا۔ وہ شاید مجھے اپنے حسن و شباب کے جال میں پھانسنے اور اپنا داماد بنانے کے لئے چارہ ڈالنے آرہی ہو۔ لیکن میں نے دروازے پر شمسہ کو دیکھا۔ یہ میرے لئے اچانک، غیر متوقع اور حیرت انگیز نہیں تھا۔ میں اُس کی آمد پر اپنی جگہ سے ہلا نہیں۔

شمسہ نے اندر داخل ہوکر دروازہ بند کیا، لیکن اندر سے اُس کی چٹخنی نہیں لگائی۔ وہ ایسے بھڑکیلے لباس میں آئی تھی کہ اُس کا بھڑکیلا بدن اور بھی بھڑک اُٹھا تھا۔ اُس نے میک اپ کیا ہوا تھا جبکہ اُس کا وحشی حسن میک اپ کا محتاج نہیں تھا۔ میرے ذہن نے ایک پل کے ہزارویں حصے میں اُس کے ذہن کو پڑھ لیا تھا۔ اُس کے ارادے اور نیت اچھی نہیں تھی۔ پہلی بار تنہائی میں اُس سے سامنا ہوا تھا۔

''کیا بات ہے......؟'' میں نے سپاٹ اور جذبات سے عاری لہجے میں پوچھا۔ ''کس لئے آئی ہو؟''

''تم سے باتیں کرنے کے لئے......'' وہ میرے قریب آکر کھڑی ہوگئی اور مستی بھری آنکھوں سے میری آنکھوں میں جھانکا۔

میں نے اُس کے سراپا پر ایک نظر ڈالی، اُس کے انگ انگ سے مستی اُبلی پڑ رہی تھی۔

''کیسی باتیں......؟'' میں نے پھر سرد مہری سے کہا۔ ''باتیں صبح بھی ہوسکتی ہیں۔ تمہیں پتہ ہے اس وقت کیا بج رہا ہے؟''

''صبح کہاں موقع ملتا ہے...... امی اور بابا ہر وقت مجھ پر نگاہیں جمائے رکھتے ہیں۔'' اُس نے جواب دیا۔ ''گھر میں مجھ سے باتیں کرنے والا کوئی نہیں ہے...... سہیلی ہے نہ

دوست ہے۔ میں اکیلی بور ہو جاتی ہوں۔ میری ماں مجھے گھر سے نکلنے ہی نہیں دیتی۔ میں اپنی بوریت دُور کرنا چاہتی ہوں۔"

"کیوں...... گھر میں بے بی اور نومی بھی تو ہوتے ہیں۔ بے بی تمہاری عمر کی ہے۔" میں نے کہا۔

"لیکن وہ بڑے لوگ ہیں۔ مجھ سے بھلا باتیں کیوں کرنے لگے...... میں ماسی کی بیٹی جو ٹھہری......" اُس نے کہا۔

"سنو...... میں ایک نوجوان شخص ہوں...... تمہارے لئے نامحرم ہوں۔ تمہارا اس لباس میں رات کے وقت مجھ سے ملنے آنا نامناسب سی بات ہے۔ جو بھی دیکھے گا وہ شک میں مبتلا ہو جائے گا۔ تمہاری عزت اور ہم دونوں کی بہتری اسی میں پوشیدہ ہے کہ تم فوراً چلی جاؤ...... اس وقت کوئی بھی آ سکتا ہے...... تمہاری ماں یا باپ بھی آ سکتا ہے۔"

"میں اتنی جلدی نہیں جاؤں گی......" وہ مجھے لگاوٹ سے دیکھنے لگی۔ "سالار! بات یہ ہے کہ مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے۔"

"اگر تمہیں مجھ سے محبت ہو گئی ہے تو اس محبت پر آنچ مت آنے دو...... محبت ایک پاکیزہ جذبے کا نام ہے۔"

"میں تم سے صرف اور صرف محبت کی تجدید اور باتیں کرنا چاہتی ہوں۔ محبت اور جنگ میں ہر چیز جائز ہے۔"

"جب ایک جوان اور حسین لڑکی تنہائی میں ایک مرد سے ملنے آتی ہے تو اُس کے ساتھ شیطان بھی آ جاتا ہے۔ پھر شیطان بہکاتا اور ورغلاتا ہے۔ پھر پیر پھسل جاتا ہے۔" میں نے کہا۔ "مرد اور ناگ پر بھروسہ نہیں کرنا چاہئے۔"

"کوئی بات نہیں......" وہ شوخی سے بولی۔ "جب دل کا نذرانہ دیا جا سکتا ہے تو کیا جسم کا نذرانہ نہیں دیا جا سکتا؟"

"لگتا ہے تم بے بی کے ساتھ ہر قسم کی فلمیں دیکھتی ہو، اسی لئے اس قسم کی باتیں کر رہی ہو۔"

"کس قسم کی فلمیں......؟" وہ معنی خیز انداز سے مسکرائی اور مجھے شوخ نظروں سے دیکھنے لگی۔

"انگریزی کی رُومانی، جذباتی اور سنسنی خیز فلمیں...... انہوں نے تمہارا دماغ خراب کیا ہوا ہے۔" میں نے کہا۔

"ان فلموں سے زیادہ تم نے میرا دل خراب کیا ہے۔" وہ خود سپردگی کی نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔ "جب سے تمہیں دیکھا ہے، میرا دل و دماغ قابو میں نہیں رہا ہے...... تم کس قدر حسین اور پُرکشش شخصیت کے مالک ہو۔ آئی لو یو سالار!" اُس نے اپنے پیاسے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ "مجھے اپنے بازوؤں میں سمیٹ لو! میرے ہونٹوں کو چوم لو۔"

"تم یہ بہکی بہکی اور لچر قسم کی باتیں نہ کرو۔ میں ایک ملازم آدمی ہوں۔" میں نے کہا۔

"میرا دل کر رہا ہے کہ میں انگریزی فلموں کی ہیروئن بن جاؤں..." وہ میری طرف بڑھی۔

"تم کسی بھی ہیروئن سے کم نہیں ہو......" میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ ہیروئن، ہیروئن ہوتی ہے۔ چاہے وہ کسی بھی زبان کی فلم ہو۔"

"میں ایک ایسی انگریزی فلم کی ہیروئن بننا چاہتی ہوں جو تم نے شاید اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھی ہو گی۔"

"مجھے نہ تو ہیروئنوں سے کوئی دلچسپی ہے اور نہ ہی فلموں سے...... تمہارا مجھ پر بڑا احسان ہو گا، چلی جاؤ!"

"اچھا......" وہ معنی خیز انداز سے مسکرائی۔ "ابھی چلی جاتی ہوں...... ایک منٹ۔" پھر گھوم کر دروازے کی طرف بڑھی۔ وہاں رُک کر چشم زدن میں اپنا لباس اُتار کر ایک طرف پھینک دیا۔ پھر وہ میری طرف بڑھی۔

اسی اثناء میں دروازہ کھلا۔ دروازے پر شہزاد رضا کھڑا تھا......! وہ اندر داخل ہو کر دھاڑا۔ "یہ کیا ہو رہا ہے......؟ تم دونوں رنگ رلیاں منا رہے ہو......؟"

"شمسہ خود ہی آئی ہے۔ اور اس نے ابھی ابھی اپنا لباس اُتار کر پھینکا ہے۔ اس کے ارادے اچھے نہیں ہیں۔" میں نے کہا۔

"یہ جھوٹ بول رہا ہے صاحب جی!" شمسہ نے کہا۔ "یہ جب سے آیا ہے، تب سے ہر رات کو مجھے اپنے کمرے میں بلا رہا ہے۔"

"یہ آج اور ابھی ابھی خود ہی چلی آئی ہے۔" میں نے کہا۔ "میں نے اسے نہیں بلایا۔"

"یہ کئی راتوں سے میری عزت اور مجھ سے اس طرح کھیل رہا ہے جیسے میں کھلو:

ہوں۔'' شمسہ نے کہا۔

''یہ جھوٹ ہے...... سراسر بہتان ہے۔'' میں نے ہذیانی لہجے میں کہا۔ ''اگر میں نے کوئی زیادتی کی ہے تو اس نے شکایت کیوں نہیں کی؟''

''شمسہ کو جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے؟'' شہزاد رضا نے کہا۔ ''اس وقت یہ جس حالت میں ہے، وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ تم دونوں ہر رات ملتے ہو...... اگر تم دونوں ایک دوسرے کو چاہتے ہو تو میں کل ہی تم دونوں کی شادی کر دُوں گا۔''

''مجھے منظور ہے۔'' شمسہ نے کسی باحیا لڑکی کی طرح اپنا سر جھکا لیا۔

''لیکن مجھے نامنظور ہے۔ میں اس سے کسی قیمت پر شادی نہیں کروں گا۔'' میں نے تڑ سے جواب دیا۔

''کیوں شادی نہیں کرو گے......؟'' شہزاد رضا برہم ہو گیا۔ ''ایک تو تم نے اس کی عزت لوٹی اور روز ہی اس کی عزت سے کھیل رہے ہو...... اس کی غربت اور مجبوریوں سے فائدہ اُٹھا رہے ہو۔ میں دیکھتا ہوں تم اس سے کیسے شادی نہیں کرو گے...... تمہارا باپ بھی اس سے شادی کرے گا...... ایسی حسین لڑکی تمہیں ساری زندگی نہیں ملے گی۔''

''اس لئے کہ یہ لڑکی حاملہ اور بدکردار ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''اور پھر میں ایک ایسی لڑکی سے شادی کیسے کر سکتا ہوں جس سے آپ کے تعلقات ہیں؟ جسے آپ نے داشتہ بنایا ہوا تھا اور جو آپ کے کارن حاملہ ہو گئی۔''

''بہت خوب......'' شہزاد رضا نے قہقہہ لگایا جو بہت پھیکا تھا۔ ''اُلٹا چور کوتوال کو ڈانٹے...... تم سارا الزام مجھ پر دھر کر اپنا دامن بچانا چاہتے ہو...... شمسہ تمہاری وجہ سے حاملہ ہوئی ہے۔''

''یہ تین ماہ چھ دن کی حاملہ ہے...... جبکہ مجھے یہاں آئے جمعہ جمعہ آٹھ دن بھی نہیں ہوئے ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''اس سے آپ کے تعلقات کا اس سے بڑا ثبوت کیا ہو سکتا ہے کہ یہ آپ کو دیکھ کر ابھی تک قدرتی حالت میں کھڑی ہوئی ہے۔ اسے تو چاہئے تھا کہ چادر سے اپنا جسم ڈھانپ لیتی یا پھر باتھ رُوم میں گھس جاتی۔''

شہزاد رضا کا چہرہ متغیر ہو گا۔ شمسہ نے بستر کی چادر اُٹھا کر اپنے جسم کے گرد لپیٹ لی۔ پھر شمسہ بولی۔ ''دراصل میں حواس باختہ ہو گئی تھی اس لئے مجھے خیال نہیں رہا صاحب جی!

جھوٹ پر جھوٹ بول رہا ہے۔ یہ نہیں چاہتا کہ مجھ سے شادی کرے۔ بلکہ یہ چاہتا ہے کہ مجھ سے یونہی کھیلتا رہے۔ یہ شادی کا قائل نہیں ہے، اس لئے آپ پر رکیک اور سنگین الزام لگا رہا ہے۔''

شہزاد رضا نے جیب سے فوراً ہی پستول نکال لیا اور مجھے نشانے کی زد میں لیتے ہوئے کہا۔ ''تم نے اس سے شادی نہیں کی تو میں تمہیں شوٹ کر دُوں گا...... تم نے جو گناہ اور جرم کیا ہے اس سے اپنا دامن نہیں بچا سکتے...... تمہیں شرم نہیں آتی کہ تم نے ایک ماسی کی لڑکی کو حاملہ بنا دیا...... کمینے...... سؤر...... تم مجھے اس چکر میں پھنسانا چاہتے ہو...... ہم دونوں پولیس کو تمہارے خلاف بیان دیں تو اندر ہو جاؤ گے...... تم یہاں اسی صورت میں رہ سکتے ہو کہ اس سے شادی کر لو۔''

''صاحب جی!'' میں نے بڑے سکون و اطمینان سے کہا۔ ''آپ مجھے پستول دکھا کر کیوں خوفزدہ اور ہراساں کر رہے ہیں؟ کیا میں نہیں جانتا کہ آپ کس قماش کے ہیں، کتنے بدکردار ہیں؟ میں زیادہ تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ آپ لوگ جتنے بڑے ہیں، اُتنے ہی ذلیل، گھٹیا اور نیچے ہیں۔ آپ کی دنیا بہت کالی ہے۔ آپ کا گھر اور گھر کا ہر فرد کالا ہے، اس کے چہرے پر کالی لکیریں ہیں۔ آپ نے اپنی بیوی کو دولت کے حصول کا ذریعہ بنایا ہوا ہے۔ وہ ایک فاحشہ اور طوائف ہے۔ آپ اُسے کریڈٹ کارڈ کی طرح وقت پر استعمال کرتے ہیں...... پہلے آپ کے تعلقات سرداراں سے تھے۔ جب آپ کا اُس سے جی بھر گیا اور شمسہ شباب کی منزل پر پہنچی تو آپ نے اسے سبز باغ دکھا کر اپنی داشتہ بنا لیا۔'' میں بے ربط بول گیا۔ شہزاد رضا کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ ''اب چونکہ یہ حاملہ ہو گئی تو آپ نے اپنا دامن بچانے کے لئے اپنے پاپ کی گٹھڑی میرے سر پر رکھنے کا فیصلہ کر لیا۔''

''بکواس بند کرو......'' شہزاد رضا نے تڑختے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''تم نے جو زبان درازی کی ہے وہ میرے لئے بہت توہین آمیز ہے...... تم نے میری بیوی کو فاحشہ اور طوائف کہا ہے۔ اب تو میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا...... تم نے میرے بارے میں بہت کچھ معلوم کر لیا ہے...... میں......''

میں نے فوراً ہی برقی سرعت سے لپک کر اُس کے ہاتھ سے پستول جھپٹ لیا۔ اگر مجھ سے چند لمحوں کی تاخیر ہو جاتی تو وہ مجھے شوٹ کر دیتا۔ کیونکہ میں نے اُس کا بھانڈا پھوڑ دیا

تھا، اُسے اُس کا اصل مکروہ چہرہ دکھا دیا تھا۔ میری باتیں اُس کے لئے ناقابل برداشت ہو
رہی تھیں۔ وہ دل میں ششدر تھا کہ مجھے یہ سب کچھ کیسے معلوم ہو گیا؟
شہزاد رضا آج جب دفتر سے لوٹا تھا، تب شمسہ اُسے چائے دینے گئی تو اُس نے شہزاد
رضا کو بتایا کہ اُس کی ماں خرابی طبیعت کی بنا پر اسے لیڈی ڈاکٹر کے پاس لے گئی تھی۔ اس
کا پیشاب وغیرہ ٹیسٹ کرنے کے بعد لیڈی ڈاکٹر نے بتایا کہ وہ حاملہ ہے اور تین ماہ کا
حمل ہے۔ اس کا اسقاط ناممکن ہے۔ یہ سنتے ہی شہزاد رضا کے اوسان خطا ہو گئے۔ تاہم
اُس نے شمسہ کو دلاسہ دیا۔ پھر اُس کے ذہن میں ایک خیال آیا کہ کیوں نہ اس کی شادی
مجھ سے کرا دی جائے۔ اس نے شمسہ سے پوچھا تو وہ مجھ سے شادی کرنے کے لئے تیار ہو
گئی۔ پھر اس نے شمسہ کو منصوبہ بتایا۔ یہ سارا کھیل اسی منصوبے کا حصہ تھا۔ لیکن جب شہزاد
رضا نے صورت حال کو بدلا ہوا دیکھا تو اُس نے مجھے قتل کرنے کی ٹھان لی۔

پستول میرے ہاتھ میں دیکھ کر اُس کا چہرہ فق ہو گیا، ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ شمسہ کے
ہاتھ سے چادر چھوٹ کر فرش پر بکھر گئی۔ اُس نے جھک کر چادر اُٹھانا چاہی تو میں نے
کرخت لہجے میں کہا۔ ''خبردار جو تم نے چادر کو ہاتھ لگایا...... اپنی جگہ سیدھی کھڑی رہو۔''

وہ دہشت زدہ سی ہو کر سیدھی کھڑی ہو گئی۔ اُس کی آنکھوں سے خوف و ہراس جھانکنے
لگا۔ پھر میں نے شہزاد رضا سے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ ''تم اپنے سارے کپڑے اُتار دو......
جلدی کرو...... ورنہ شوٹ کر دوں گا۔''

''سنو......'' شہزاد رضا نے مرتعش لہجے میں کہا۔ ''تم نے مجھے قتل کیا تو قانون کے
ہاتھوں سے بچ نہ سکو گے۔''

''ہاں...... یہ بات تو میں بھی جانتا ہوں۔ لیکن میں ایسی حماقت ہرگز نہیں کروں گا......
میں جو حکم دے رہا ہوں اس پر عمل کرو! ورنہ میں بلا تامل تم دونوں کو گولی مار دوں گا......
جلدی کرو! میرے پاس وقت نہیں ہے۔''

شہزاد رضا نے ایک ایک کر کے اپنے سارے کپڑے اُتار دیئے۔ اب دونوں ہی بے
لباس میری نظروں کے سامنے کھڑے تھے۔ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''پیارے بچو! تم
دونوں اپنے اپنے کپڑے اُٹھاؤ اور اس کمرے سے باہر نکلو......!''

اُن دونوں نے مجھے بے بسی سے دیکھا۔ دونوں کے چہرے مُردوں کی طرح سفید ہو

ہے تھے۔ چند لمحوں کے بعد اُنہوں نے میرے حکم کی تعمیل کی اور اپنے اپنے کپڑے
ٹھائے کمرے سے باہر نکل آئے۔ میں چوکنا اور مستعد تھا۔ پھر میں اُن دونوں کو برابر
الے کمرے میں لے گیا اور اس کمرے کے تمام بلب، ٹیوب لائٹس اور فانوس جلا
یئے۔ کمرہ روشنیوں میں نہا گیا۔ پھر اے سی آن کر کے دروازہ بند کیا، پھر اُن سے کہا،
کپڑے صوفے پر ڈال دیں۔ وہ کپڑے ڈال کر ایک طرف کھڑے ہو گئے۔

پھر میں نے شمسہ کو اپنے پاس بلا کر اُس کی کنپٹی پر پستول کی نال رکھ دی۔ ''اب تم سچ
چ بتاؤ کہ تمہارے تعلقات کس سے ہیں......؟ صاحب سے یا نومی سے......؟''

''پہلے نومی سے بھی تھے۔ لیکن جب اُسے پتہ چلا کہ میرے تعلقات اس کے ڈیڈی
سے ہیں تو پھر وہ اپنے ڈیڈی کے حق میں دستبردار ہو گیا۔ تقریباً ایک برس سے ان کی
نایت اور میری مہربانیوں کا سلسلہ جاری ہے۔''

موت کی دہشت نے اُسے سچ بولنے پر مجبور کیا تھا۔ اُس کی آواز ہی نہیں بلکہ اُس کا
ازک جسم بھی تھر تھر کانپ رہا تھا۔ ادھر شہزاد رضا کی حالت یہ تھی کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہ
و۔ اُس کے اور میرے درمیان خاصا فاصلہ تھا۔ اُس کی رگوں میں لہو منجمد ہو گیا تھا۔

''تم کس کے بچے کی ماں بننے والی ہو......؟'' میں نے تڑختے لہجے میں پوچھا۔

''صاحب جی کے بچے کی......'' اُس نے جواب دیا۔ ''میں نے صاحب سے کہا بھی
تھا کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں رہتی ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ میں ماں بننے والی ہوں؟
صاحب جی مجھے دلاسہ دیتے رہے کہ فکر کرنے اور پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ ایسا
ہوتا رہتا ہے۔''

''اب آپ کیا فرماتے ہیں جناب شہزاد رضا صاحب؟'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔
''کیا یہ غلط کہہ رہی ہے؟''

''سنو......'' شہزاد رضا نے اپنے حواس مجتمع کر کے کہا۔ ''تمہیں کوئی حق نہیں پہنچتا کہ
ہمارے ذاتی معاملات میں دخل دو۔''

''لیکن کیا آپ کو اس بات کا حق حاصل ہے کہ اپنے گناہ کسی اور کے سر تھوپ دیں؟
کوئی آپ کو آئینہ دکھائے تو اُسے گولی مار دیں؟''

شہزاد رضا نے جواب نہ بن پڑا۔ وہ بغلیں جھانکنے لگا۔ پھر اُس نے کہا۔ ''تم سچ سچ بتاؤ

کہ کون ہو......؟ تمہیں ہمارے بارے میں کس نے بتایا؟'' اُس کی آواز حلق میں پھنس رہی تھی۔ اتنا سب کچھ کیسے جانتے ہو......؟''

''تم میرے بارے میں جان کر کیا کرو گے...... میں تمہارے کسی سوال کا جواب نہیں دُوں گا۔ میں بہت کچھ جانتا ہوں۔ اتنا کچھ کہ تم، تمہاری بیوی، بیٹی اور بیٹا بھی سوچ نہیں سکتے...... تم سب ایک گندے تالاب میں رہتے ہو۔ گندی مچھلیاں ہو...... اب چھوڑو اس موضوع اور باتوں کو...... میں جو حکم دُوں، وہ بلا چون و چرا بجالاؤ۔ تم دونوں بستر پر قریب قریب لیٹ جاؤ......''

اُن دونوں کو قدرے پس و پیش ہوا۔ لیکن جب میں نے بستر میں فائر کر کے سوراخ کیا تو اُن کے ہوش ٹھکانے آ گئے۔ پھر وہ دونوں بستر پر لیٹ گئے۔ اگلے لمحے میں نے کہا۔ ''صاحب جی! اپنی محبوبہ کو اپنی آغوش میں لے لیں......''

شہزاد رضا نے میری طرف بڑی بے بسی سے دیکھا تو میں نے تیزی سے کہا۔ ''اگر تم نے میری بات نہیں مانی تو پھر میں تمہاری ٹانگ میں سوراخ کر دُوں گا...... فوراً کسی اچھے بچے کی طرح میری بات مان لو۔ شاباش!''

جب اُس نے شمسہ کو پوری طرح اپنی آغوش میں لے لیا تو میں نے کہا۔ ''تم دونوں اسی حالت میں رہنا تاوقتیکہ میں کوئی دوسرا حکم نہ دُوں...... کاش! میرے پاس کیمرہ ہوتا......'' پھر میں نے شمسہ سے کہا۔ ''تم نے مجھ سے کہا تھا نا کہ میں ہیروئن بننا چاہتی ہوں؟ مجھے انگریزی فلموں کی ہیروئن بننا بہت پسند ہے۔ لو! میں نے تمہاری آرزو پوری کر دی۔ ایسے سین انگریزی فلموں میں ہوتے ہیں۔''

شمسہ مجھے متوحش نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ جبکہ شہزاد رضا کی آنکھوں میں نفرت اور غصے کی سرخی تھی۔ وہ اپنی بے بسی اور مجبوری پر کڑھ رہا تھا، دل میں سوچ رہا تھا کہ کاش! کسی طرح اُسے پستول مل جائے...... اُسے کسی نے اتنا ذلیل اور خوار نہیں کیا تھا۔

میں نے دیوار میں نصب انٹر کام کا ریسیور اُٹھا کر بیگم مہرین کا نمبر دبایا۔ چند لمحوں کے بعد اُس کی نیند میں ڈوبی ہوئی آواز سنائی دی۔ وہ سخت غصے میں تھی۔ ''کون ہے......؟ کس لئے میری نیند خراب کر دی؟''

''بیگم صاحبہ! میں سالار بول رہا ہوں۔ آپ کے لئے بہت ہی زبردست سرپرائز

ہے۔ آپ جلدی سے چھت پر آ جائیں۔''

''کیا بات ہے؟ بتاؤ......'' وہ بیزاری سے بولی۔ ''مجھے بڑے زور کی نیند آ رہی ہے۔''

''بیگم صاحبہ! زندگی میں کبھی کبھی ایسے سرپرائز ملتے ہیں...... اس سرپرائز کو آپ ساری زندگی نہیں بھول سکیں گی۔''

''اچھا، میں آ رہی ہوں۔'' اُس نے بادلِ نخواستہ کہا اور ریسیور پٹخ دیا۔

چند لمحوں کے بعد وہ شب خوابی کے لباس میں چھت پر آ گئی۔ میں نے زینے پر اُس کی آہٹ سن کر شہزاد رضا سے کہا۔ ''اپنی ہیروئن کا اس طرح سے طویل بوسہ لو جس طرح انگریزی فلموں میں لیا جاتا ہے...... شاباش! جلدی کرو۔''

وہ جیسے ہی شمسہ پر جھکا، میں فوراً ہی اپنے کمرے میں جا کر دروازے کی آڑ میں کھڑا ہو گیا۔ بیگم مہرین جب اس کمرے میں داخل ہوئی تو میں دبے پاؤں زینے کی طرف لپکا۔ پھر میں نے ایک تیز آواز سنی۔ ''شہزاد! وٹ اِز دِس......؟'' بیگم مہرین کی آواز تیز و تند، نفرت، حیرت اور غصے میں ڈوبی ہوئی تھی۔

تھوڑی دیر کے بعد میں کوٹھی سے باہر تھا۔ اس وقت ڈیفنس سوسائٹی ویرانی، سناٹے اور نیم تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ یہ کالی دنیا تھی۔ ان بنگلوں اور کوٹھیوں میں اس وقت کیا کچھ ہو رہا تھا؟ کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ یوں بھی اس کے مکین راتوں کو جاگتے اور دن کے وقت گہری نیند سوتے تھے۔ میں تیزی سے چلتا ہوا مین روڈ کی طرف چلا جا رہا تھا، بار بار پلٹ کر دیکھتا بھی جا رہا تھا کہ کہیں شہزاد رضا میرے تعاقب میں تو نہیں آ رہا ہے؟

تھوڑی دیر کے بعد میں نے بہت دُور سائرن کی آواز سنی۔ یہ پولیس موبائل تھی جو سائرن بجا رہی تھی جیسے اسے کسی مفرور ملزم کی تلاش ہو۔ پھر ایک خیال آیا...... کہیں شہزاد رضا نے پولیس کو ٹیلی فون پر میرے خلاف کوئی رپورٹ تو درج نہیں کرا دی؟ کہیں پولیس میری تلاش میں تو نہیں ہے؟ اس خیال کے آتے ہی میں ایک بغلی گلی میں داخل ہو کر تیزی سے دوڑنے لگا جو تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ پولیس کی موبائل کی آواز تیزی سے فضا میں گونج رہی تھی اور وہ قریب ہی محسوس ہو رہی تھی......!

OOO

اس گھپ اندھیرے میں اچانک میں کسی سے ٹکرا گیا۔ ہم دونوں ہی اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکے اور زمین پر گر گئے۔ اگلے لمحے ایک کرخت مردانہ آواز نے پوچھا۔ ''بھائی! تم کون ہو......؟ اندھیرے میں کیوں بھاگ رہے ہو......؟''

''پولیس میری تلاش میں ہے اور تعاقب کر رہی ہے۔'' میری زبان سے بلا ارادہ نکل گیا۔

''پولیس تو مجھے بھی تلاش کر رہی ہے...... گویا ہم دونوں ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔ چلو......چل کر کہیں چھپتے ہیں۔''

اُس اجنبی شخص نے اتنا کہہ کر میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ پھر وہ دوڑنے لگا۔ میں بھی اُس کی رفتار سے ساتھ دوڑنے لگا۔ ہم دونوں دو تین گلیوں سے ہوتے ہوئے ایک ویران اور سنسان سڑک پر آ گئے۔ جیسے ہی اس سڑک پر آئے پولیس موبائل کے انجن کی آواز سنائی دی۔ ہم پھر گلی میں داخل ہو گئے۔ اس گلی کے کارنر پر ایک زیرِ تعمیر بنگلہ نظر آیا جو کسی کھنڈر کی طرح لگ رہا تھا۔ اس کی تعمیر جیسے روک دی گئی تھی۔ اس کے اندر سے اندھیرا جھانک رہا تھا۔ اندر زندگی کے آثار بھی محسوس نہیں ہو رہے تھے۔

اُس اجنبی شخص نے ابھی تک میرا ہاتھ تھاما ہوا تھا۔ وہ مجھے گھسیٹتا ہوا اُس بنگلے کے اندر داخل ہو گیا۔ اندر ایک زینہ اُوپر کو جاتا تھا۔ وہ مجھے اُس زینے سے لے کر چھت پر پہنچ گیا۔ پھر اُس نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا۔ ہم دونوں اپنی پھولی ہوئی سانسوں پر قابو پانے کے لئے دیوار کے سہارے کھڑے ہو گئے۔ پھر ہم دونوں نے ایک دوسرے کی شکلیں دیکھیں۔ یہاں بھی اندھیرا تھا لیکن ایسا بھی نہیں کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دے۔ اور پھر ہم دونوں نے ایک دوسرے کا تنقیدی نظروں سے جائزہ لیا۔

اُس شخص کی عمر چھیالیس سینتالیس برس کی ہو گی۔ وہ کلین شیو تھا اور اُس نے نفیس اور عمدہ قسم کا سفاری سوٹ پہنا ہوا تھا۔ اُس کے پیر میں جو، جوتے تھے وہ چمک رہے تھے۔

جسامت کے لحاظ سے مناسب تھا، ویسے وجیہہ اور اسمارٹ لگ رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں عقاب کی سی چمک تھی۔ اُس کی شخصیت پُرکشش اور بارُعب تھی۔

''میرا نام غیاث ساگر ہے۔'' اُس نے اچانک اپنا تعارف کرایا اور مصافحے کے لئے اپنا ہاتھ بڑھایا۔

''میرا نام سالار......'' میں نے اُس سے گرم جوشی سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔

پھر ہم دونوں یکلخت خاموش ہو گئے کیونکہ اسی لمحے پولیس موبائل گلی میں داخل ہوئی تو روشنی کا سیلاب آ گیا۔ ہم دونوں فوراً ہی اکڑوں دیوار کے سہارے بیٹھ گئے۔

وہ گاڑی اس بنگلے کے سامنے رُک گئی۔ دوسرے لمحے رات کے سناٹے میں ایک گرج دار آواز گونجی۔ ''یونس خان!......تم بنگلے کے اندر جا کر دیکھ آؤ۔ وہ شاید یہیں چھپا ہوا ہو۔''

''دیکھ لیتا ہوں......مگر سر! وہ اس طرف نہیں نکلا۔ بلکہ وہ فیس فائیو کی طرف بھاگا تھا۔'' کسی نے جواب دیا۔

''دیکھ لینے میں کیا حرج ہے......تمہارے باپ کا کیا جاتا ہے؟'' اُسی آواز نے سابقہ لہجے میں کہا۔

چند ثانیوں کے بعد ٹارچ کی روشنی نے زیریں حصہ روشن کر دیا۔ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ کیونکہ اس شخص کی وجہ سے میں پولیس کے ہتھے چڑھنے والا تھا۔ شاید پولیس مجھے تلاش کر رہی ہو۔ وہ کس کی تلاش میں ہے؟ یہ بات علم میں نہیں آ سکی تھی۔ پولیس جسے بھی تلاش کر رہی تھی، کسی ایک کے پکڑے جانے کی صورت میں ہم دونوں کی شامت آ سکتی تھی۔ میں دل میں دُعا مانگ رہا تھا کہ وہ اُوپر نہ آئے۔ آخر میری دُعا قبول ہوئی۔ وہ نیچے والے کمروں کی خاک چھان کر چلا گیا۔ پھر گاڑی بھی چلی گئی۔

پولیس موبائل کے جانے کے بعد ہم دونوں نے سکون کا سانس لیا۔ جب اچھی طرح اطمینان ہو گیا کہ گاڑی جا چکی ہے تب ساگر نیچے سے ایک جھاڑو تلاش کر کے لایا۔ اُس کے دوسرے ہاتھ میں ایک چٹائی بھی تھی جو شاید چوکیدار کے استعمال میں آتی تھی۔ اُس نے چٹائی میرے ہاتھ میں تھما کر فرش پر جھاڑو دی۔ اچھی طرح صاف کرنے کے بعد اُس نے چٹائی بچھا دی۔ چٹائی قدرے صاف ستھری تھی۔ پھر ہم دونوں چٹائی پر دیوار کے سہارے بیٹھ گئے۔

''پولیس آپ کو کس لئے تلاش کر رہی ہے......؟'' میں نے اُس سے سوال کیا۔

''اس لئے کہ میں پولیس اور دنیا والوں کی نظروں میں ایک مجرم ہوں۔'' اُس نے اپنی جیب سے ریوالور نکال کر میرے سینے پر رکھ دیا۔ میں بالکل بھی خوفزدہ نہیں ہوا۔ کیونکہ میرے ذہن نے اُس کے ذہن سے بہت کچھ معلوم کر لیا تھا۔ یہ بھی معلوم کر لیا تھا کہ یہ ریوالور خالی ہے، اس میں ایک گولی بھی نہیں ہے۔ تاہم میں نے انجان بن کر اُس سے پوچھا۔

''دوست! کیا یہ میرے سوال کا جواب ہے...... کیا آپ مجھے شوٹ کرنا چاہتے ہو؟''

''ہاں....'' اُس نے سرد سفاک لہجے میں کہا۔ ''آپ کو قتل کرنا اشد ضروری ہو گیا ہے۔''

''وہ کس لئے......؟'' میں نے اُس کی طرف متعجب نظروں سے دیکھا۔

''اس لئے کہ آپ پولیس کو میرے بارے میں مخبری کر دیں گے...... اس طرح میں قانون کے ہتھے چڑھ جاؤں گا۔''

''آپ میرے دشمن تو نہیں جو میں پولیس کو مخبری کر دوں گا...... اور پھر میں بھی تو پولیس کے سائے سے بچ رہا ہوں۔''

اُس نے میرے سینے پر سے ریوالور کی نال ہٹا لی۔ ''آپ بڑے بہادر ہیں۔ بالکل بھی خوفزدہ نہیں ہوئے۔ ویسے یہ ریوالور بالکل خالی ہے۔ اس میں ایک گولی بھی نہیں ہے۔''

میں نے سوچا کہ اس سے کہوں کہ ہاں میں جانتا تھا۔ لیکن پھر سوچا، میں نے اپنے اس علم کے بارے میں کسی سے اب تک نہیں کہا تھا اور نہ کسی سے کہنے کی ضرورت تھی۔ میں نے اس بات کو اپنی ذات تک ہی محدود رکھا ہوا تھا۔

''آپ نے بتایا نہیں کہ پولیس کس لئے آپ کی تلاش میں ہے؟'' میں نے سابقہ سوال دُہرایا۔

''ایک منٹ...... ابھی بتاتا ہوں۔'' اُس نے اپنی جیب سے سگریٹ کی ڈبیہ اور ماچس نکالی۔ اُس نے مجھے سگریٹ آفر کیا۔ میں نے اُس سے کہا کہ میں سگریٹ نہیں پیتا۔ اُس نے سگریٹ سلگا کر ایک لمبا سا کش لیا، پھر کہنے لگا۔

''میں تین برس امریکہ میں رہ کر مستقل طور پر اپنے وطن اس لئے آ گیا کہ شادی کر کے گھر بسا لوں۔ میں نے ایک فرم میں ملازمت کر لی۔ میری تنخواہ بہت اچھی تھی۔ مجھے فرم کی طرف سے ایک فلیٹ بھی رہائش کے لئے ملا تھا۔ جب ایک برس گزر گیا تو میرے دوستوں

کی بیویوں نے میرے لئے لڑکی تلاش کرنا شروع کی۔ میں نے صاف صاف کہہ دیا کہ مجھے لڑکی بہت حسین چاہئے۔ میں آئیڈیل لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ میرے دوستوں کی بیویوں نے بہت ساری حسین لڑکیاں دکھائیں لیکن مجھے ان میں سے ایک بھی پسند نہیں آئی۔

پھر ایک تقریب میں مجھے ایک ایسی لڑکی دکھائی دی جو نہ صرف بہت حسین تھی بلکہ میرا خواب تھی۔ اُس لڑکی کا نام عطیہ تھا۔ اُس کے بارے میں مجھے ایک دوست نے بتایا کہ یہ ماڈلنگ کرتی ہے۔ اس کے ٹی وی پر کمرشل بھی آ چکے ہیں، ایک ٹی وی سیریل میں بھی آ رہی ہے۔ شوبزنس میں آئے ہوئے ابھی ایک سال بھی نہیں ہوا ہے۔ اُس کے حسن و شباب اور پرفارمنس کو دیکھتے ہوئے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ اس کا مستقبل تابناک ہے۔ مجھے اُس کی پرفارمنس اور مستقبل سے نہیں، اُس کی ذات سے دلچسپی تھی۔

مجھے شوبزنس دنیا کے بارے میں بہت کچھ معلوم تھا۔ میں امریکہ میں چونکہ تین برس گزار چکا تھا اس لئے میرے ذہن کے دریچے کھلے ہوئے تھے۔ میں ایک آزاد ذہن رکھتا تھا۔ بہت سے فلمی اور ٹی وی کے اداکار مجھے پسند تھے۔ میں اُن سے وقتاً فوقتاً ملتا رہتا تھا لیکن میں نے کبھی ان کی نجی زندگی میں جھانکا نہیں۔ مجھے اس کی کوئی ضرورت بھی نہ تھی۔ میں نے اپنے شوق کو صرف دلچسپی تک محدود رکھا تھا۔ میں ایک نئے دور کا آدمی تھا۔ میں کسی نہ کسی وجہ سے کنوارہ رہ گیا اور گھر بسانے کا خیال تک نہ آیا۔ شاید اس لئے بھی کہ مصروفیت نے گھر بسانے کے بارے میں سوچنے کی مہلت نہیں دی تھی۔

ایک روز میرے ایک ہم وطن دوست نے مجھے اپنے گھر پر پائے کھانے کی دعوت دی۔ جب میں اُس کے ہاں پہنچا تو میرے علاوہ کوئی اور دوست مدعو نہ تھا۔ میں پہلی بار تو اُس کے ہاں نہیں گیا تھا۔ جب بھی اُن کے ہاں کوئی خاص دیسی ڈش بنتی تھی، مجھے وہ ضرور مدعو کرتا تھا۔ اُس روز میں نے پہلی بار یہ بات محسوس کی کہ گھر اور زندگی کا اصل حسن عورت سے ہے۔ میرے دوست کے گھر میں ایک محبت کرنے والی بیوی اور اُس کے بچوں کی خوشبو ماحول اور فضا میں بسی ہوئی تھی۔ اُس کی بیوی تہمینہ ایک سگھڑ اور سلیقہ مند عورت تھی۔ مجھے پہلی بار ایک عورت گھر میں کام کرتی ہوئی بہت اچھی لگی۔ ورنہ میں عورت کو نائٹ کلبوں، ہوٹلوں اور فلموں میں ناچتے اور کام کرتے ہوئے دیکھ کر بہت خوش ہوتا تھا۔ میرے دوست کی بیوی نے کھانے کی میز پر مجھ سے کہا کہ...... بھیا! اب آپ کو شادی

کر کے گھر بسالینا چاہئے۔ کیونکہ آپ کی شادی کی عمر نکلی جارہی ہے۔

اُس کی بات میرے دل کو لگی۔ میں نے شادی کر کے گھر بسانے کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنا شروع کیا۔ یہاں پاکستانی گھرانوں کی لڑکیوں کی کوئی کمی نہیں تھی۔ بہت سارے پاکستانی گھرانوں میں میری آمد و رفت تھی۔ مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی عار نہیں کہ میں پارسائی کی زندگی نہیں گزار رہا تھا۔ میری زندگی میں مقامی اور پاکستانی لڑکیاں آچکی تھیں۔ لیکن عورت کبھی میری کمزوری نہیں رہی تھی۔ میں نے یہ بات محسوس کی کہ امریکہ میں جو پاکستانی لڑکیاں ہیں وہ مقامی لڑکیوں سے بھی دو قدم آگے ہیں۔ وہ یہاں کے ماحول، سوچ، معاشرے اور نظریات کو اپنائے ہوئے ہیں۔ ایک کھلی کتاب ہیں۔ اُن کے نزدیک عزت و آبرو کا تصور فرسودہ، بوسیدہ اور دقیانوسی ہے اور جسم ان کی اپنی ملکیت ہے۔ امریکی لڑکیوں کی طرح ایک لڑکی کا کنوارا رہ جانا عزت اور فخر کی بات نہیں ہے بلکہ لڑکی کے حسن و شباب کی توہین ہے۔ لڑکیاں فخر سے ایک دوسرے کو بتاتی تھیں کہ اس کی زندگی میں کس کس عمر کے کتنے مرد آئے؟ اُنہیں اس لڑکی پر بڑی حیرت اور تعجب ہوتا تھا کہ اس کے کسی دوست نے اسے کسی قابل نہیں جانا۔ آپ اس بات کو مذاق اور مبالغہ نہ سمجھیں۔ بہت ساری پاکستانی گھرانوں کی ایسی لڑکیاں بھی تھیں جو اپنی عزت و آبرو کو جان سے بھی عزیز رکھتی تھیں۔ کسی مرد کی طرف نگاہ اُٹھا کر نہیں دیکھتی تھیں۔ شریعت کی اتنی سختی سے پابندی کرتی تھیں کہ کوئی انہیں راستے سے ہٹانا چاہے تو ہٹا نہیں سکتا تھا۔ وہ روحانیت کی قائل تھیں۔ جبکہ دوسری لڑکیاں مادی زندگی کو پسند کرتی تھیں۔ وہ دونوں ایک دوسرے کی ضد تھیں۔

میں آزاد خیال ہوتے ہوئے بھی ایک باعصمت لڑکی سے شادی کرنا چاہتا تھا جو حسین اور کھلے ذہن کی ہو۔ میں روحانیت کا قائل نہیں تھا اور نہ کسی مذہبی خیال کی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ غیر مسلموں کا مسلمانوں کے بارے میں یہ خیال تھا کہ وہ بنیاد پرست ہیں، تنگ نظر اور متعصب ہیں۔ مجھے اس بات سے سخت نفرت تھی کہ ایک عورت کو چار دیواری تک محدود رکھا جائے۔

میرے دوست نے عطیہ سے میرا تعارف کرایا۔ وہ اس بات سے بے حد متاثر ہوئی کہ میں امریکہ سے آیا ہوا ہوں، میرے پاس امریکی ویزا ہے۔ امریکہ اُس کا خواب تھا۔

اس تقریب میں وہ اختتام تک میرے ساتھ رہی اور اُس کا موضوع امریکہ اور وہاں کی معاشرتی زندگی اور شو بزنس رہا تھا۔ اُس سے میری دوستی ہوگئی۔ ہماری ملاقاتیں ہونے لگیں۔ اُس نے ایک مرتبہ اپنے گھر والوں سے ملانے کے لئے مجھے مدعو کیا۔ اُس کی ایک چھوٹی بہن اور ایک بھائی تھا۔ والدین حیات تھے۔ ایک سو بیس گز کے مکان میں اُن کی اقامت تھی۔ متوسط زندگی تھی۔ متوسط گھرانا اور متوسط علاقہ تھا۔ اس وقت اُسی کی آمدنی پر گھر چل رہا تھا۔ چونکہ نئی نئی شو بزنس میں آئی تھی، اُس کے پاس کمرشل بھی کم تھے، لیکن وہ اپنے مستقبل سے نا اُمید نہیں تھی۔

میں نے ایک روز ساحل سمندر پر اُس سے کہا۔ ''عطیہ! میں ایک بات کہوں تو برا تو نہیں مانو گی؟''

''ایک کیا دس باتوں کا بھی برا نہیں مناؤں گی.....'' وہ مجھے شوخ نظروں سے دیکھتی ہوئی بولی۔

''کیا تم مجھ سے شادی کر کے گھر بسانا پسند کرو گی.....؟'' میں نے پوچھا۔

''جب میں تمہیں پسند کرتی ہوں، شادی کرنا کیوں پسند نہیں کروں گی؟'' اُس نے کہا۔ ''لیکن میری دو شرائط ہیں۔''

''وہ کیا.....؟''

''ایک تو میں شو بزنس کی دنیا اُس وقت تک نہیں چھوڑوں گی جب تک تم مجھے امریکہ ساتھ نہیں لے جاتے..... شادی کا علم صرف میرے گھر والوں کو ہوگا..... شادی راز میں رہے گی۔ تم مجھے کلفٹن کے فلیٹ میں رکھو گے لیکن دنیا والوں کو یہ بتایا جائے گا کہ تم میرے بھائی ہو۔''

مجھے اُس کی بات سن کر حیرت ہوئی۔ یقین نہیں آیا۔ میں نے تحیر زدہ لہجے میں پوچھا۔ ''وہ کس لئے؟''

''اس لئے کہ میرے کمرشل، میری شہرت اور مقبولیت پر اثر نہ پڑے۔ ورنہ یہ سب متاثر ہو جائیں گے۔'' اُس نے جواب دیا۔

''لیکن اس کا شادی سے کیا تعلق ہے؟ پیشہ اور ازدواجی زندگی الگ الگ چیزیں ہیں۔''

''دراصل ہمارا معاشرہ، اس کی سوچ اور خیالات دوسرے ممالک کے لوگوں سے یکسر مختلف ہیں۔'' وہ کہنے لگی۔ ''ہمارے ہاں لوگ کسی اداکارہ یا ماڈل کو شادی شدہ دیکھتے ہیں

تو اُن کے نزدیک وہ اپنی وقعت اور کشش کھو دیتی ہے۔ وہ اپنی پسندیدہ اداکاراؤں کو غیر شادی شدہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ نجانے کیوں وہ ایسا چاہتے ہیں۔''

''بڑی عجیب سی بات ہے......'' میں نے کہا۔ ''کیا مرد اداکاروں کے ساتھ بھی ایسا ہوتا ہے؟''

''ان کے ساتھ ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ لیکن عورتیں ایسے اداکاروں کو اپنا آئیڈیل نہیں بناتی ہیں۔'' اُس نے جواب دیا۔

''کیا ایسا ہوا ہے اور ہوتا ہے کہ ماڈل گرل یا کوئی اداکارہ خفیہ شادی کر کے اپنے شوہر کو بھائی کی حیثیت سے ملاتی ہو؟''

''ایسا ہوا ہے اور ہو رہا ہے۔'' وہ کہنے لگی۔ ''کچھ ماڈل لڑکیوں نے شادی کی ہوئی ہے۔ اُن کی خفیہ شادی کے بارے میں کسی کو نہیں معلوم...... یہ وہ ہیں جو شہرت کی بلندیوں پر ہیں۔ ان میں سے کوئی کسی وڈیرے کی بیوی ہے، کسی کا شوہر صنعت کار ہے اور کسی کا شوہر ملٹی نیشنل کمپنی میں ایم ڈی یا جنرل منیجر ہے۔''

''کیا پرستار لوگ اس لئے شادی شدہ ستاروں کو پسند نہیں کرتے ہیں کہ ان کا حسن ماند پڑ جاتا ہے اور جسم اپنی کشش کھو دیتا ہے؟ کیونکہ اداکاراؤں کا پُرکشش جسم ہی سب کچھ ہوتا ہے۔'' میں نے کہا۔

''نہیں...... ایسی کوئی بات نہیں...... شادی کے بعد تو ان کا جسم اور گداز اور پُرکشش ہو جاتا ہے۔ جب وہ ماں بن جاتی ہیں تو ان کے جسم میں اور گداز پیدا ہو جاتا ہے۔ پرستاروں کی اس عجیب و غریب سوچ کا کوئی علاج نہیں ہے۔''

میں نے سوچا کہ اس میں حرج ہی کیا ہے؟ دو تین بلکہ پانچ برس تک اس شادی کو خفیہ رکھا جا سکتا ہے۔ میں پانچ برس تک بچے کا باپ بننا نہیں چاہتا تھا تاکہ زندگی سے پوری طرح لطف اندوز ہو سکوں۔ عطیہ کا حسن بے مثال...... اُس کے شاداب بدن کے گداز پن اور رعنائیوں نے مجھے بہت متاثر کیا تھا۔ میں اسے ہر قیمت پر اپنانا چاہتا تھا۔

مری میں ہم دونوں نے خفیہ شادی کر لی۔ اُس کے گھر والوں کی موجودگی میں شادی ہوئی تھی۔ وہ لوگ شادی کے بعد واپس کراچی چلے گئے۔ ہم نے مری اور سوات کے پُرفضا مقامات کی سیر کی۔ بیس دن تک ہنی مون منایا۔ اُس کی معیت میں بڑا اچھا وقت

را۔ وہ تنہائی کی بہترین رفیقہ ثابت ہوئی۔ اُس کی محبت، گرم جوشی، والہانہ پن، وارفتگی خود سپردگی نے بہت متاثر کیا۔ وہ بیوی نہیں بلکہ ایک محبوبہ کی طرح میرے لمحات کو ین اور نشاط انگیز بناتی رہی۔

مری سے واپسی کے بعد ہم دونوں ایک فلیٹ میں رہنے لگے۔ یہ لگژری فلیٹ اُسے ملٹی نیشنل کمپنی کی جانب سے رہائش کے لئے اس لئے ملا تھا کہ اس نے اس کمپنی سے طویل المیعاد معاہدہ کر لیا تھا۔ اس کمپنی کی بیسیوں مصنوعات تھیں۔ یوں تو اس کے سارے معاملات ٹیلی فون یا موبائل فون پر یا پھر دفاتر میں طے ہوتے تھے لیکن کبھی کا شخص جو کسی فرم وغیرہ سے متعلق ہوتا تھا اُس سے معاملات طے کرنے فلیٹ پر آ جاتا ۔ وہ اُس سے میرا تعارف بھائی جان کی حیثیت سے کراتی تھی۔ گھر میں جو جز وقتی کام نے کے لئے ملازمہ آتی تھی وہ بھی یہی جانتی اور سمجھتی تھی کہ ہم دونوں بہن بھائی ہیں۔

شادی کے بعد اُسے بہت سارے کمرشل ملنے لگے۔ ٹی وی پر میں اُس کے کمرشل دیکھ کر خوش ہوتا تھا کیونکہ ہر کمرشل میں وہ ایک نئے انداز، نئی شادابی اور حسن کی کرشمہ سازیاں نظر آتی تھی۔ اُس کی شہرت اور مقبولیت میں روز بروز اضافہ ہونے لگا۔ اُس کے یوز اور رنگین تصاویر ملک کے تمام رسائل و جرائد اور اخبارات میں شائع ہونے لگیں۔

میں صبح اپنے کام سے نکلتا تو رات آٹھ بجے پہنچتا تھا۔ اُس کی شوٹنگ نہ ہوتی اور کسی ب میں وہ مدعو نہ ہوتی تو پھر ہم دونوں سیر و تفریح اور کسی ہوٹل میں کھانا کھانے نکل تے۔ لڑکے اور لڑکیاں، عورتیں اور مرد اُسے پہچان کر گھیر لیتے، اُس سے آٹوگراف لڑکیاں نہ صرف اُس کی پرفارمنس بلکہ اُس کے حسن و جمال اور اُس کے جسم کی دلکشی کی خوب تعریف کرتیں۔ میں یہ دیکھ اور سن کر بہت خوش ہوتا تھا۔ میرا سینہ ایک عجیب رت سے پھول جاتا۔

اُس کی کمرشل شوٹنگ اکثر راتوں کو ہوتی تھی۔ چونکہ اُس کے پاس بہت سارے ل تھے اور بریک شوٹنگ ہوتی تھی اس لئے وہ علی الصبح گھر لوٹتی تھی۔ اس وہ اس قدر تھکن سے چور اور نڈھال ہوتی تھی کہ کپڑے بدل کر فوراً سو جاتی تھی۔ والی کے باعث اُس کی آنکھوں میں ڈورے ہوتے تھے۔

میں صبح اپنا ناشتہ خود تیار کر کے اور خود ہی کر کے نکل جاتا۔ امریکہ کی زندگی میں نہ

صرف ناشتہ بلکہ کھانا بھی تیار کرتا تھا اور برتن دھوتا اور گھر کے سارے کام کاج کرتا تھا بلکہ کرنا پڑتا تھا۔ میں ان کاموں کا عادی تھا۔ امریکہ اور یورپ میں اپنے گھر کے سارے کام خود ہی کرنے پڑتے ہیں، یہ کوئی معیوب بات نہ تھی۔ کام کرنے میں شرم کس بات کی؟ ملازمہ بارہ بجے آتی تھی۔ کیونکہ عطیہ یوں بھی دیر سے سو کر اُٹھنے کی عادی تھی۔ دو گھنٹے کام کر کے ملازمہ چلی جاتی۔ عطیہ دوپہر کے وقت کہیں باہر جاتی تو مجھے ٹیلی فون پر بتا دیتی تھی۔ وہ مجھے اپنی مصروفیت سے اس لئے باخبر رکھتی تھی کہ میں گھر آ کر بور نہ ہوں۔

میں نے کبھی اُس سے نہیں پوچھا کہ اُسے ایک کمرشل کا کیا معاوضہ ملتا ہے؟ اس کی ماہانہ آمدن کیا ہے؟ کتنی ہے؟ اُس نے ایک بار خود ہی بتایا تھا کہ وہ ایک کمرشل کے پچاس ہزار سے ایک لاکھ روپے تک لیتی ہے۔ میں نے اُس کی آمدن کے بارے میں اس لئے بھی نہیں پوچھا تھا کہ مجھے اس کی کوئی ضرورت نہ تھی۔

اُس نے ایک برس میں جو شہرت، مقبولیت اور عروج حاصل کیا تھا وہ بہت کم ماڈل گرلز کو نصیب ہوا تھا۔ لیکن اُس کی یہ شہرت اور مقبولیت اور اُس کی راتوں کی مصروفیت مجھے گراں گزرنے لگی تھی۔ کیونکہ میری راتیں سونی، ویران اور تنہا گزرنے لگی تھیں۔ وہ مہینے میں صرف دو ایک راتیں گھر پر گزارتی تھی۔ دولت اُبل رہی تھی، اس کا اندازہ اس بات سے ہوا تھا کہ اُس نے ایک نئی مرسڈیز گاڑی خرید لی تھی۔ اُس کے پاس ہیرے جواہرات کے زیورات کے کئی سیٹ بھی موجود تھے جو اُس نے خریدے تھے۔ اُس کے پاس ملبوسات کا ایک ڈھیر تھا۔ ایک دفعہ جو لباس پہنتی تھی، اُسے دوبارہ نہیں پہنتی تھی۔ اُس نے اپنے ملبوسات ملازمہ اور سہیلیوں کو بھی دے دیئے تھے۔

ایک رات میں بستر پر اُس کے انتظار میں کروٹیں بدل رہا تھا کہ اُن کا فون آیا کہ وہ صبح نو بجے آئے گی۔ مجھے اُس کی بات سن کر سخت غصہ آیا، پھر اپنی غلطی اور پچھتاوے کا احساس ہوا کہ میں نے ایک ماڈل گرل سے شادی کیوں کی؟ میں نے ظاہری حسن سے متاثر ہو کر اپنی زندگی بے کیف اور ویران کر لی۔ یہ بھی کوئی زندگی ہے؟ یہ میری اپنی کوتاہی اور عجلت بازی تھی۔ ایک ماڈل گرل سے شادی کر کے میں نے اپنے پیروں پر کلہاڑی ماری تھی۔

میں اپنے بیڈ روم میں بستر پر دراز سوچ رہا تھا کہ اب کیا کروں؟ کیا میں عطیہ کے ساتھ زندگی گزاروں یا اسے طلاق دے دوں؟ اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے فون

الیا۔ دوسری طرف کوئی مرد تھا۔ اُس نے پوچھا کہ مس عطیہ کہاں ہیں؟ میں نے اُسے
ا کہ وہ شوٹنگ پر گئی ہوئی ہے۔

''شوٹنگ پر......؟'' اُس نے حیرت کا اظہار کیا اور فون بند کر دیا۔

میری نظر اُس کی الماری کے دروازے پر پڑی۔ اُس میں الماری کی چابیاں لٹک رہی
ں۔ وہ اپنی الماری کی چابیاں لے جانا بھول گئی تھی۔ مجھے یاد آیا کہ وہ ان چابیوں کو ہر
ت اپنے پاس سنبھال کر اور بڑی حفاظت سے رکھتی ہے، کبھی بھول کر نہیں گئی۔ میرے
ں میں کبھی کوئی خواہش یا تجسّس پیدا نہیں ہوا کہ اس کی الماری دیکھوں۔ چابیاں دیکھ کر
نے کیوں میرے دل میں تجسّس ہوا کہ اس کی الماری کی تلاشی لوں۔ دیکھوں کہ اس کی
ری میں کیا کچھ ہے۔

میں نے الماری کھولی۔ اُس الماری میں ایک خفیہ تجوری بھی تھی۔ میں نے وہ تجوری
ولی تو اُس میں ایک لفافے میں کاغذات تھے۔ اس کے علاوہ چھ سات لاکھ کی رقم، دو
بینکوں کی چیک بکس اور ڈیپازٹ سلپیں بھی تھیں۔ جب میں نے ڈیپازٹ سلپیں
یں تو دنگ رہ گیا۔ اُس کا بینک بیلنس نوے لاکھ روپے کا تھا۔ لفافے کے کاغذات
، پتہ چلا کہ مرسڈیز گاڑی اُسے کسی کی جانب سے گفٹ ملی ہے۔ جس نے گفٹ کی تھی،
ا کا نام بھی لکھا ہوا تھا۔

اس کے علاوہ کلفٹن میں اُس کا ایک لگژری فلیٹ بھی تھا جو اُس نے کرائے پر دیا ہوا
۔ اس کے بارے میں مجھے اُس نے بالکل بھی نہیں بتایا تھا۔ اس فلیٹ کے کرائے نامے
کاپی بھی موجود تھی۔ اس فلیٹ سے اسے بیس ہزار روپے ماہانہ کرایہ آتا تھا۔ اس کا
لب یہ تھا کہ وہ فلیٹ تیس لاکھ سے کم کا نہیں تھا۔ اور پھر اُس کے گھر والے گلشن اقبال
اچار سو گز کے ذاتی گھر میں رہائش پذیر تھے اور اُن کے ہاں دو گاڑیاں بھی تھیں۔ اس
طلب یہ تھا کہ وہ کروڑ پتی تھی۔ دولت میں کھیل رہی تھی۔ اُس نے مجھ سے ایک مرتبہ
ہی تھا کہ مجھے رقم کی ضرورت ہو تو میں لے سکتا ہوں، لیکن مجھے کوئی ضرورت نہیں
۔ کیونکہ میری آمدنی بہت ہی معقول تھی۔ ایک سال کے عرصے میں وہ کروڑ پتی بن گئی
۔ شوبزنس کے فنکاروں کے پاس دولت کی کوئی کمی نہیں ہوتی ہے۔

دوسرے دن میں دفتر سے جلد اُٹھ گیا۔ پھر میں کلفٹن ایک دوست سے ملنے اُس کے

گھر گیا تو وہ گھر پر نہیں تھا۔ اُس کی بیوی نے بتایا کہ وہ ایک گھنٹے کے بعد آئے گا۔ چونکہ اُس کی بیوی گھر پر اکیلی تھی اس لئے میں نے مناسب نہیں سمجھا کہ گھر پر انتظار کروں۔ میں ایک قریبی ریسٹورنٹ پر آ گیا۔ میں گاڑی پارک کر کے جب ریسٹورنٹ کی طرف بڑھ رہا تھا، ایک بُک سٹال پر ایک شو بزنس کے رسالے پر نظر پڑی جس کے سرورق پر عطیہ کی رنگین تصویر چھپی ہوئی تھی۔ میں بہت کم رسالے وغیرہ دیکھتا تھا جو گھر کے پتے پر آتے تھے۔ عطیہ ان رسالوں کو بڑے ذوق وشوق سے دیکھتی تھی کیونکہ ان میں اُس کی تصویریں چھپی ہوئی ہوتی تھیں۔ اس کے علاوہ دو تین بہت ہی موٹی موٹی البمیں بھی تھیں جو اُس کی تصویروں سے بھری ہوئی تھیں۔ شو بزنس کے اس انگریزی رسالے کے سرورق پر عطیہ کی جو تصویر چھپی تھی وہ بڑی ہیجان خیز تھی اور اُس کے بھڑکیلے جسم کی نمائش آزادانہ سی تھی۔ یہ خصوصی تصویر تھی۔ میں نے وہ رسالہ اُٹھا کر اُس کی ورق گردانی کی تو عطیہ کی اُس میں بیں عدد تصویریں تھیں۔ مختلف زاویوں سے کھینچی گئی تصویروں میں اُسے بے حجاب بنا دیا گیا تھا۔ میں نے اس قسم کی تصویریں عطیہ کی کسی رسالے میں نہیں دیکھی تھیں۔ وہ ایک طرح سے بے لباس ہی لگ رہی تھی۔ مجھے اُس کی یہ تصویریں اور حسن کی کرشمہ سازیاں زہر لگیں۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ عطیہ اس سطح کی تصویر بھی اُتروا سکتی ہے۔

میں یہ رسالہ دیکھ رہا تھا کہ کسی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں نے گردن گھما کر دیکھا، تقریباً چالیس برس کی عمر کا ایک شخص کھڑا تھا۔ وہ خوش پوشاک تھا اور سمارٹ لگ رہا تھا۔ اُس کی وجاہت متاثر کن تھی۔ اُس کی آنکھوں پر چشمہ تھا، وہ کلین شیو تھا۔ اُس نے کہا۔ ''تم نے مجھے پہچانا......؟ ہم بارہ برسوں کے بعد مل رہے ہیں۔''

اُس کی آواز مجھے بڑی مانوس سی لگی لیکن میں باوجود کوشش کے اُسے پہچان نہیں سکا۔

''نہیں دوست...... میں تمہیں پہچان نہیں سکا۔''

''میں جانی ہوں۔'' اتنا کہہ کر اُس نے اپنی آنکھوں سے چشمہ اُتار دیا۔

اگلے لمحے ہم دونوں بڑی محبت اور گرمجوشی سے بغل گیر ہو گئے۔ پھر ہم دونوں ریسٹورنٹ کی طرف بڑھے۔ اگر جانی مجھے اپنا نام نہیں بتاتا تو میں اُسے پہچان نہیں سکتا تھا۔ بارہ برس پہلے کے جانی اور آج کے جانی میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ اُس میں یکسر تبدیلی آ گئی تھی۔ بارہ برس قبل اُس نے ایک اداکار بننے کے لئے بہت جدوجہد کی تھی۔

اُس کا باپ مل مزدور تھا۔ اُس کی بڑی آرزو تھی کہ وہ دولت مند بن جائے۔ اس کے لئے وہ بڑی جدوجہد کر رہا تھا۔

اُس نے چلتے چلتے سڑک کے کنارے کھڑی ایک نئی ٹویوٹا کرولا کی طرف اشارہ کیا۔

''یہ میری گاڑی ہے۔''

کل وہ ایک سائیکل نہیں خرید سکتا تھا، آج اُس کے پاس ایک بے حد قیمتی گاڑی تھی۔ وہ سرخ وسفید ہو گیا تھا۔ میں نے ریسٹورنٹ کے اندر داخل ہو کر ایک میز پر بیٹھنے کے بعد اُس سے پوچھا۔ ''کیا تم اداکار بن گئے ہو؟''

''اداکار نہیں بن سکا۔ لیکن شو بزنس کی دنیا میں ایک ایجنٹ بن گیا ہوں۔ میں نے ایک ایجنسی کھولی ہوئی ہے۔''

''کیسی ایجنسی؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔ ''کوئی فلم ایجنسی......؟''

''نہیں...... فلم ایجنسی نہیں...... ماڈل گرلز اور اداکاراؤں کی بکنگ ایجنسی......'' اُس نے جواب دیا۔

''بکنگ ایجنسی......؟ کیا تم اُن کی فلموں میں بکنگ کرتے ہو؟'' میں نے سوال کیا۔

''فلموں کی نہیں، بلکہ اُن کی کالی راتوں کی بکنگ کرتا ہوں۔ مجھے اس کا کمیشن ملتا ہے۔ تم سے کیا چھپانا......'' وہ کہنے لگا۔ ''تم سے کبھی میری کوئی بات چھپی نہیں رہی۔ میرے دوست ہی نہیں، بلکہ ساری دنیا اس بات کو جانتی ہے کہ میں کیا ہوں اور کیا کرتا ہوں۔ کیا تمہیں کسی دوست نے میرے بارے میں نہیں بتایا کہ میں کیا کر رہا ہوں؟''

''امریکہ سے واپسی پر صرف ایک دو دوستوں سے ملاقات رہی۔ اتفاق سے کسی دوست نے تمہارے بارے میں نہیں بتایا۔ شاید اس وجہ سے بھی کہ تمہارا کوئی ذکر نہیں آیا۔ حیرت ہے کہ مجھے تمہارا خیال کیوں نہیں آیا؟''

''میں نے ایک شو بزنس بکنگ ایجنسی کھولی ہوئی ہے۔'' اُس نے جواب دیا۔

''شو بزنس بکنگ ایجنسی کیا ہوتی ہے؟'' میں نے اُسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ''میں پہلی بار سن رہا ہوں کہ شو بزنس ایجنسی بھی ہوتی ہے...... اس نام سے وضاحت نہیں ہو پا رہی ہے۔''

''جس طرح جائیداد کرایہ پر دینے اور خرید وفروخت کے لئے ایجنسی ہوتی ہے، اسی طرح اداکاراؤں اور اداکاروں کی خرید وفروخت اور انہیں کرائے پر چلانے کے لئے ایک

بکنگ ایجنسی کی بنیاد رکھی ہوئی ہے۔ میں اسے جدید طرز اور اعلیٰ پیمانے پر چلا رہا ہوں، جس کی وجہ سے میرا بزنس زوروں پر چل رہا ہے۔''

''کیا......؟'' میرا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔ ''کیا اداکاروں اور اداکاراؤں کی خرید و فروخت ہوتی ہے......؟ اُنہیں کرائے پر دیا جاتا ہے؟ تمہاری باتیں میری سمجھ میں بالکل بھی نہیں آ رہی ہیں۔''

''اُن کی جائیداد کی طرح خرید و فروخت ہوتی ہے۔ اُنہیں کرائے پر بھی اُٹھایا جاتا ہے۔ یہ صاف اور واضح ہے، اس میں سمجھنے والی کیا بات ہے؟ حیرت کی کیا بات ہے؟'' وہ زیر لب مسکرا دیا۔

''تمہاری باتیں بڑی عجیب و غریب اور ناقابل فہم ہیں۔ کیا ایسا ممکن ہے؟'' میں نے حیرت سے کہا۔

''میری جان! بات یہ ہے کہ تم شو بزنس کی دنیا سے کوئی واقفیت نہیں رکھتے ہو۔ دُور سے یہ دنیا بڑی حسین، رنگین اور بے حد پُرکشش دکھائی دیتی ہے۔ اس کی زندگی میں اتنی چمک ہے کہ آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں۔ جس طرح ہر تصویر کے دو رُخ ہوتے ہیں اسی طرح اس کے بھی دو رُخ ہیں، ایک روشن اور دوسرا تاریک...... اس تاریک رُخ کو کالی دنیا کہا جاتا ہے۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ یہ کالی دنیا ان کا تابناک مستقبل ہوتا ہے۔''

''کالی دنیا اور تابناک مستقبل سے تمہاری کیا مراد ہے......؟'' میں نے متعجب لہجے میں پوچھا۔

''اس کالی دنیا کی بدولت ان کے پاس کالا دھن آتا ہے، یہ راتوں رات دولت مند بن جاتی ہیں۔''

''تمہاری مراد یہ ہے کہ یہ انجانے راستوں پر چلتی ہیں؟'' میں نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

''جی ہاں...... اس راستے پر چلے بغیر ان کا گزارہ نہیں ہے۔ اس کے بغیر وہ رہ نہیں سکتی ہیں۔ کیونکہ اس سے ان کا مستقبل وابستہ ہوتا ہے۔ کوئی شو بزنس کی ایسی ہستی نہیں ہے جو اس راستے پر نہیں چلتی ہو۔''

''لیکن میں تمہاری یہ بات تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہوں...... تم مبالغے سے کام لے رہے ہو۔'' میں نے تکرار کی۔

''تم میری اس بات کو کس بناء پر تسلیم نہیں کر رہے ہو؟ اس میں مبالغے کی کیا بات ہے؟'' اُس نے حیرت سے میری شکل دیکھی۔

''اس لئے کہ اب وہ وقت اور دور نہیں رہا کہ اس دنیا میں بازارِ حسن سے لڑکیاں آئیں۔ اب وقت بہت بدل گیا ہے۔ اب شو بزنس کی دنیا میں نہ صرف اچھے گھروں کی بلکہ اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکیاں آ رہی ہیں۔ ماحول بھی بہت صاف ستھرا ہو گیا ہے۔ پہلے یہ ہوتا تھا کہ کوئی لڑکی جب تک متعلقہ شخص کی ہر بات نہیں مانتی تھی اُسے چانس نہیں ملتا تھا۔ لیکن اب یہ صورت حال نہیں ہے۔ اب ہر لڑکی کو اُس کے حسن و جمال، دلکشی اور کشش پر موقع دیا جاتا ہے۔''

''تم سے یہ کس نے کہہ دیا......؟'' وہ بڑے زور سے ہنسا۔

میں نے سوچا اس سے کہوں کہ عطیہ نے...... لیکن کسی اور خیال سے کہا۔ ''میں نے سنا اور محسوس کیا ہے۔''

''نہیں...... ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ گو کہ قدریں بہت بدل گئی ہیں، ماحول بدل گیا ہے لیکن فطرت نہیں بدلی ہے۔ یہ سچ ہے کہ پہلے طوائفیں آتی تھیں، بازارِ حسن کی لڑکیاں اداکارائیں بنتی تھیں۔ لیکن آج بھی وہی صورت حال ہے۔ طوائفوں کی لڑکیاں اور لڑکے بھی اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ لیکن اس شو بزنس کی دنیا نے نوجوان نسل کی آنکھیں ایسی چکا چوند کر دی ہیں کہ وہ اچھے برے کی تمیز کھو بیٹھی ہے۔ انہیں شہرت، دولت اور خواب ناک زندگی چاہئے۔ وہ ہر ایثار اور قربانی کے لئے تیار ہیں۔ عزت و آبرو کا تصور فرسودہ، بوسیدہ اور دقیانوسی ہو کر رہ گیا ہے۔ آج کی اس لڑکی کے نزدیک جو آسمان کی بلندیوں کو چھو لینا چاہتی ہے آبرو کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ متوسط اور باعزت گھرانوں کی لڑکیاں جوق در جوق اس دنیا کی طرف آ رہی ہیں۔ ایسی لڑکیوں کو چانس ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے جب تک وہ اپنی آبرو کھو نہ دیں۔ یہاں کچھ پانے کے لئے کھونا پہلی شرط ہوتی ہے۔''

''تو کیا اس وقت شو بزنس کی جتنی بھی کامیاب اور اُبھرتی ہوئی اداکارائیں نظر آتی ہیں وہ سب کی سب انجانے راستے سے گزر چکی ہیں؟''

''ہاں......'' اُس نے سر ہلایا۔

''لیکن ان میں ہر کوئی پارسائی کا دعویٰ کرتی ہے، اس بات کا ثبوت اور گواہ اُن کے انٹرویوز ہیں۔'' میں نے کہا۔

''انہیں میرے سامنے لاکر کھڑا کر دو۔ میں دیکھتا ہوں وہ کیسے پارسائی کا دعویٰ کرتی ہیں۔'' اُس نے کہا۔

''تمہارے نزدیک ماڈل گرلز کیسی ہیں؟ یہ تو ٹی وی اور فلمی اداکاراؤں سے مختلف ہوتی ہیں۔''

''یہ سب گندے تالاب کی مچھلیاں ہیں۔ کوئی بھی ایک دوسرے سے مختلف اور پارسا نہیں۔''

''میں اتنا جانتا ہوں کہ ہر ماڈل گرل ایسی نہیں ہوتی ہے۔ تم ان کی کردار کشی نہ کرو۔'' میں نے تلخی سے کہا۔

''آج کل ماڈل گرلز کے وارے نیارے ہو رہے ہیں...... فلمی اداکاراؤں کے وہ مزے نہیں رہے جو ان ماڈلز کے ہیں۔ ان کی پانچوں گھی اور سر کڑاہی میں ہوتا ہے۔ ٹھنڈے دل سے سوچو کہ ایک ماڈل گرل کے پاس دو ایک سال میں ہی لاکھوں نہیں بلکہ کروڑوں کی دولت کہاں سے آ جاتی ہے؟ یہ سب کچھ کالی راتوں کا اعجاز ہوتا ہے۔ ایک کالی رات سے اُن کی جتنی کمائی ہوتی ہے اتنی چار کمرشلز سے بھی نہیں ہوتی۔ اُن کی اصل کمائی کالی راتوں سے ہوتی ہے۔''

''کیا تم ان ماڈلز اور اداکاراؤں کی خرید و فروخت کرتے اور کرائے پر چلاتے ہو؟ یہ کس طرح کی خرید و فروخت ہے۔''

''خرید و فروخت کا یہ سلسلہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے جائیداد کا ہوتا ہے۔ دراصل ایک ماڈل گرل ہو یا اداکارہ وہ ایک جائیداد کی طرح ہوتی ہے۔ میں اس جائیداد کو کسی وڈیرے یا سرمایہ دار کے ہاتھ کچھ دنوں کے لئے فروخت کر دیتا ہوں۔ جب کسی شخص کو کسی ماڈل یا عورت کی ضرورت ہوتی ہے تو پھر میں اُسے کسی بروکر سے خرید کر منافع پر فروخت کر دیتا ہوں۔''

''کرائے سے تمہاری کیا مراد ہے؟'' میں نے دلچسپی سے پوچھا۔

''ایک رات کے لئے کسی ماڈل یا اداکارہ کی ضرورت کسی کو ہوتی ہے تو اسے بطور کرائے کے پیش کر دیا جاتا ہے۔''

''تم نے کہا تھا کہ مرد اداکار بھی جائیداد کی طرح بکتے ہیں...... کرائے پر دیئے جاتے ہیں۔ یہ میں تم سے پہلی بار سن رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''کیا مرد بھی طوائف کی طرح ہوتے ہیں؟''

''جس طرح مرد لڑکیوں اور عورتوں کے بھوکے ہوتے ہیں، اسی طرح عورتیں بھی پیاس ہوتی ہیں۔ ایسی مال دار عورتیں جو بیوہ ہوتی ہیں یا وہ جو کسی وجہ سے شادی نہیں کر پاتی ہیں...... ایسی نوجوان لڑکیاں جو فیشن ہوتی ہیں، وہ مرد اداکاروں کے قرب کی متمنی ہوتی ہیں۔ وہاں مردوں کی خرید و فروخت کرتی ہیں، کرائے پر حاصل کرتی ہیں۔ ایسا کم ہوتا ہے، لیکن ہوتا ضرور ہے۔''

''لیکن میں ایک ایسی ماڈل گرل کو جانتا ہوں جو باعزت طور پر ماڈلنگ کے پیشے کو اپنائے ہوئے ہے؟''

''وہ کون سی ماڈل گرل ہے......؟ کیا تم مجھے اُس کا نام بتا سکتے ہو؟'' اُس نے پوچھا۔

''عطیہ......'' میں نے کہا۔ ''آج کل اس کا طوطی بول رہا ہے۔''

''یہ تم سے کس نے کہہ دیا کہ وہ اس گندے تالاب میں ایک صاف مچھلی ہے؟'' وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔

''کسی نے نہیں کہا...... چونکہ میں اسے بہت قریب سے جانتا ہوں، اسی بنا پر کہہ رہا ہوں۔'' میں نے پُر اعتماد لہجے میں کہا۔

پھر اُس نے اپنی جیب سے ایک البم نکال کر میرے سامنے رکھی اور اس البم کے ورق اُلٹنے لگا۔ اس البم میں ماڈل گرلز کی جو تصویریں تھیں وہ ساری کی ساری نیم عریاں حالت میں تھیں۔ انہیں میں نے کبھی کسی کمرشل یا اخبار کے اشتہار، کسی فلمی رسالے میں اس طرح بے حجاب نہیں دیکھا تھا۔ پھر اُس نے عطیہ کی تصویر میرے سامنے رکھ دی۔ وہ مختصر پیراکی کے لباس میں کسی امریکی لڑکی کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔ اُس کے کومل اور بے پناہ پُرکشش گداز بدن پر صرف دھجیاں تھیں۔ میں اُس کی یہ تصویر دیکھ کر بھونچکا ہو گیا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ عطیہ اس عالم میں اپنی تصویر اُتروا سکتی ہے۔

''اب تم اس عطیہ کے بارے میں کیا کہتے ہو؟'' اُس نے پوچھا۔

''ہاں......'' میں نے سر ہلایا۔ میری آواز حلق میں پھنس گئی۔ ''تمہارے پاس ان ماڈل لڑکیوں کی تصویروں کی البم کیوں اور کس لئے ہے...... یہ ساری تصویریں نیم عریاں کیوں ہیں؟ یہ تصویریں انہوں نے تمہیں کس لئے دی ہیں؟''

''یہ تصویریں دراصل اس لئے ہیں کہ ان کی خرید و فروخت اور کرائے پر اُٹھانے میں

آسانی ہو۔ ان تصویروں کی مدد سے سودا ہوتا ہے، معاملات طے ہوتے ہیں۔ کیونکہ جب خریدار کسی بھی چیز کا سودا کرتا ہے تو وہ خوب دیکھ بھال اور ٹھونک بجا کر...... یہ سارے نگینے ہیں۔ ان نگیوں میں سب سے چمک دار نگینہ عطیہ ہے...... اس وقت یہ کروڑ پتی ہے۔''

''کیا یہ کروڑ پتی اپنے کمرشل سے نہیں بنی ہے......؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں...... کوئی بھی ماڈل...... چاہے وہ لاکھوں میں ایک کیوں نہ ہو، وہ روزانہ پانچ چھ کمرشل کیوں نہ کرے، ایک دو سال میں کروڑ پتی نہیں بن سکتی ہے۔ ایک بنگلہ یا لگژری فلیٹ بھی نہیں خرید سکتی ہے تاوقتیکہ وہ اپنی راتیں کالی نہ کرے، بستر اور اپنا بدن میلا نہ کرے۔ میں عطیہ کا ایجنٹ ہوں۔ میں اُسے بزنس دیتا ہوں۔ اس وقت اس کی بڑی مانگ ہے، صرف کمرشل ہی نہیں بلکہ اُونچے حلقوں میں بھی...... اُسے ایک مرسڈیز اور ایک فلیٹ صرف ایک ایک کالی رات کے عوض ملے ہیں۔ یہ سب سے مہنگی ماڈل ہے۔ اس کے علاوہ اس نے اپنی چھوٹی بہن کو بھی انجانے راستے پر ڈال دیا ہے۔ وہ بھی بہت جلد ماڈل بن کر نمودار ہونے والی ہے۔ وہ بھی دونوں ہاتھوں سے دولت لوٹ رہی ہے۔''

یہ سب کچھ سنتے ہی میرے وجود پر کیسے کوئی بجلی سی آگری۔ میں جیسے خاکستر ہوگیا...... میں نے اُس سے پوچھا۔ ''اُس سے اس وقت میری ملاقات کہاں ہوسکتی ہے؟ کیا میں آج کی رات اس کی بکنگ کرسکتا ہوں؟''

''ہاں...... کیوں نہیں؟'' اُس نے جواب دیا۔ پھر اُس نے اپنی نوٹ بک نکال کر دیکھی، اُس کے صفحات اُلٹ پلٹ کرتا رہا۔ پھر ایک صفحے پر اُس کی نگاہ جم گئی۔ چند لمحوں کے بعد اُس نے کہا۔ ''آج اُس سے صرف تمہاری ملاقات ہوسکتی ہے۔ وہ کل کے دن میں بھی مصروف ہے، پرسوں دن اُس سے تمہارا اپائنٹمنٹ کرواسکتا ہوں، جبکہ وہ وڈیرے کے ساتھ بک ہے۔ وہ وڈیرے کو ٹال سکتی ہے کوئی بہانہ کر کے...... دراصل وہ اُس وڈیرے کی داشتہ ہے۔ اُس وڈیرے نے ہی تو اُسے مرسڈیز خرید کردی ہے۔ وہ ہفتے میں تین دن اُس کے نذر کرنے کی پابند ہے۔''

''پرسوں رات اُس کے ساتھ کہاں بسر ہوگی؟ کیا اُس کے فلیٹ میں؟'' میں نے پوچھا۔

''اُس کے اپنے ذاتی فلیٹ میں جس میں اُس کا بھائی ساتھ رہتا ہے۔ اُس کا بھائی کل شام دو تین دن کے لئے کمپنی کے کسی کام سے لاہور جارہا ہے۔ اگر تم کہیں اور اُس

کے ساتھ رات گزارنا چاہتے ہو تو میں اس کا بھی بندوبست کرسکتا ہوں۔ پرسوں دن اُسے تم نے بک نہیں کیا تو پھر وہ اپنے وڈیرے کے ساتھ وقت گزارے گی۔''

''کسی اور دن رکھ لیتے ہیں......'' میں نے کہا۔ ''ویسے ایک رات کی وہ کیا قیمت لیتی ہے؟''

''قیمت نہیں کرایہ کہو...... ایک رات کا کرایہ چالیس سے ساٹھ ہزار روپے تک ہے۔ کرایہ دار کو دیکھ کر کرایہ طے کیا جاتا ہے۔ میں چالیس ہزار روپے کے کرایہ پر اُس سے معاملات طے کرواسکتا ہوں۔''

''کیا ان ماڈلوں کے گھر والوں کو ان کی کالی راتوں پر کوئی اعتراض نہیں ہوتا؟'' میں نے پوچھا۔

''اعتراض......؟ وہ کس لئے ہوگا؟ لکشمی دیوی جو گھر میں آرہی ہے۔ زندگی حسین، رنگین اور پُر آسائش گزر رہی ہو اور پانچوں گھی میں ہوں تو وہ اعتراض کیوں کرنے لگے؟ جب آدمی بے ضمیر ہوجائے اور بے غیرت بن جاتا ہے تو اسے کوئی پرواہ نہیں ہوتی۔ جب والدین بے غیرت اور اندھے بن جائیں تو کسی کو کیا غرض ہے؟ اب تم عطیہ ہی کی مثال لے لو۔ وہ اپنے بڑے بھائی کے ساتھ فلیٹ میں رہتی ہے۔ اُس کا بھائی کسی فرم میں ملازمت کرتا ہے۔ صبح آٹھ بجے گھر سے نکلتا ہے تو شام آٹھ بجے گھر پہنچتا ہے۔ اُس کے دفتر جانے کے دو ایک گھنٹے کے بعد کوئی نہ کوئی آجاتا ہے اور سہ پہر تک رہ کر چلا جاتا ہے۔ اُس کی صرف راتیں ہی نہیں بلکہ دن بھی کالے ہوتے ہیں۔ آج تک اُس کے بھائی کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں ہوسکی کہ اس کی بہن کیا گل کھلا رہی ہے۔''

''میں نے سنا ہے کہ جو ماڈل گرلز ہوتی ہیں ان میں سے بعض شادی شدہ ہوتی ہیں لیکن وہ کسی کو بتاتی نہیں ہیں۔ اپنے شوہروں کو سیکرٹری یا بھائی کی حیثیت سے متعارف کراتی ہیں۔ کیا یہ بات سچ ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''سو فیصد سچ ہے۔'' اُس نے جواب دیا۔ ''بے غیرت شوہر ہی نہیں بلکہ سگے بھائی بھی جسم کے خریدار بک کرتے ہیں۔ یہ دنیا اس قدر کالی ہے کہ تم تصور نہیں کرسکتے۔ اس میں ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا ہے۔''

اُس رات میں بستر پر دراز ہونے کی بجائے کمرے میں ٹہلتا رہا، عطیہ کے بارے میں

سوچتا رہا۔ اب میری سمجھ میں آیا کہ جب وہ سویرے گھر آتی ہے تو اس قدر تھکن سے چور اور نڈھال کیوں ہوتی ہے؟ وہ مجھ سے کہتی تھی کہ رات بیک وقت چار کمرشل کرنا پڑے اس لئے اس کا جوڑ جوڑ درد کر رہا ہے...... جبکہ وہ صرف ایک ہی کمرشل کرتی تھی۔ وہاں سے فراغت پا کر اپنی رات کالی کرنے چلی جاتی تھی۔ جو اُس کے جسم کی منہ مانگی قیمت ادا کرتا تھا، وہ اُس سے اپنی پائی پائی وصول کرتا تھا۔

عطیہ نے مجھے دھوکہ دیا، میرے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی اور میری آنکھوں میں دُھول جھونکی اور میری محبت کو بے دردی سے پامال کیا تھا۔ اُس نے مجھ سے شادی اپنے گناہوں اور سیاہ کاری پر پردہ ڈالنے کے لئے کی تھی۔ بھائی بنا کر مجھے ڈھال بنایا۔ اُس کا جرم میرے لئے ناقابل معافی جرم تھا۔ وہ میری بیوی تھی۔ مجھے یہ حق حاصل تھا کہ اُس سے اُس کی سیاہ کاریوں کے بارے میں پوچھوں، باز پرس کروں، اُسے سزا دُوں۔

اب عطیہ نے اس قدر دولت کمالی تھی کہ اُسے میری ضرورت نہیں رہی تھی۔ وہ میرے بغیر ہی امریکہ جاسکتی تھی۔ دوسرے دن میں دفتر نہیں گیا۔ عطیہ شوٹنگ کے بہانے چلی گئی تھی۔ اُس کی غیر موجودگی میں اُس کی چھوٹی بہن ملنے آئی۔ پھر جانے مجھے کیا ہوا کہ میں اپنے جذبات پر قابو نہ پاسکا۔ وہ سہ پہر تک میرا بستر اور میرا بدن میلا کرتی رہی۔ اُس نے اس بات کا اعتراف کیا کہ اس نے کالی راتوں کی آمدن سے وہ گھر خریدا جس میں وہ لوگ رہ رہے ہیں۔ اب اسے ماڈلنگ کا چانس ملنے والا ہے کالی راتوں کے باعث...... لیکن وہ یہ بات گول کر گئی کہ عطیہ بھی انجانے راستے پر چل رہی ہے۔

میں نے آج صبح عطیہ سے کہا کہ میں تین دن کے لئے کمپنی کے کام سے لاہور جا رہا ہوں اور صبح دس بجے گھر سے نکل گیا۔ پھر رات ہوتے ہی میں ایک ریوالور لے کر گھر داخل ہو گیا۔ میں نے ریوالور لوڈ کیا ہوا تھا اور سائلنسر بھی لگایا ہوا تھا۔ میں نے دیکھا وہ میرے بستر میں ایک وڈیرے کے ساتھ غلاظت کے دلدل میں دھنسی ہوئی ہے۔ یہ اُس وڈیرے کی داشتہ تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اُس کا چہرہ پیلا پڑ گیا۔ سفید پڑتا چلا گیا۔ میں نے تین گولیاں اُس کے خوبصورت جسم میں اور تین گولیاں وڈیرے کے جسم میں اُتار دیں۔ عطیہ صرف ایک بار چیخ سکی تھی۔ پھر میں نے دوسرے بیڈ روم میں کھسر پھسر کی آواز سنی...... اُس کا دروازہ کھول کر جھانکا تو اُس کمرے میں اُس کی چھوٹی بہن بھی ایک

وڈیرے کے ساتھ دادِ عیش دے رہی تھی۔ میرے پاس اور گولیاں نہیں تھیں ورنہ میں اُس کی بہن کو بھی موت کی نیند سلا دیتا۔ میں وہاں سے نکل آیا۔

میں اپنی گاڑی لئے بغیر نکل آیا تھا۔ پیدل جا رہا تھا کہ ایک گلی میں پولیس موبائل کو تیزی سے فلیٹ کی طرف جاتے دیکھا۔ پولیس کو اس قتل کی واردات کی فوری اطلاع دے دی گئی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد پولیس کے دو تین موبائل کو میں نے اپنی تلاش اور تعاقب میں دیکھا۔ پھر ہم دونوں یہاں آ کر روپوش ہو گئے۔ یہ ہے میری کہانی......''

''اب تم کیا کرو گے؟ کیا اپنے آپ کو قانون کے حوالے کر دو گے؟'' میں نے پوچھا۔

''ابھی میں کسی نتیجے پر نہیں پہنچا ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''قانون کے حوالے کرنا ہوتا تو میں سیدھا پولیس سٹیشن پہنچ جاتا۔ سوال یہ ہے کہ میں کیوں اپنے آپ کو قانون کے حوالے کروں...... میں نے اپنی بیوی کو اُس کے گناہوں کی سزا دی ہے۔ وہ اس کی مستحق بھی تھی۔ وہ قانونی اور اصولی طور پر مجرم ہے۔ اگر میں اُسے عدالت میں گھسیٹتا تو اس سے کچھ حاصل نہ ہوتا۔ وہی ڈھاک کے تین پات...... برسوں کیس چلتا، اُسے عدالت سے وہ سزا نہ ملتی جو اُسے ملنی چاہئے تھی اور ملی ہے۔''

''کہیں تم امریکہ واپس جانے کے بارے میں تو نہیں سوچ رہے ہو؟'' میں نے اُس کے ذہن کو ٹٹولتے ہوئے کہا۔

''ہاں شاید چلا جاؤں......'' اُس نے کہا۔ ''میں نے اُس کے قتل کی باقاعدہ منصوبہ بندی کی تھی۔ میں نے اُس کی الماری کی چابیوں کی ڈپلی کیٹ بھی بنالی تھیں۔ میں نے ایک دن قبل اُس کی الماری میں جھاڑو پھیر دی۔ بیس لاکھ روپے، لاکھوں کے ہیرے جواہرات کے زیورات اور اتنی ہی مالیت کے انعامی بانڈ وغیرہ نکال کر میں نے انہیں ایک محفوظ جگہ رکھ دیا ہے۔ امریکہ واپس جا کر زندگی گزارنے کے لئے یہ دولت کافی ہے۔ میں بیس لاکھ کی رقم وہاں بینک میں ڈیپازٹ کروں گا، اس کا سود ہر ماہ ملتا رہے گا۔ اس وقت میں عطیہ کی ڈیڑھ کروڑ کی دولت کا مالک ہوں۔''

''لیکن تم جاؤ گے کیسے......؟ پولیس تمہاری تلاش اور گھات میں ہے۔ تم نے دہرا قتل کیا ہے۔''

''یہ میرا مسئلہ ہے...... ملک سے باہر جانے کے بہت سارے راستے ہیں۔ جب میں

عطیہ کی ساری دولت اور اپنی دولت بھی امریکی ڈالر میں تبدیل کروں گا تو تب اس کی قوت ایٹم بم کے برابر ہو جائے گی۔ پھر اس کے جادو کے زور سے میں یہاں سے نکل جانے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ یوں بھی میرا پاسپورٹ کسی اور نام سے بنا ہوا ہے۔'' اُس نے کہا۔

''قانون کے ہاتھ بہت لمبے ہوتے ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''آخر تم اس سے کب تک بچو گے؟''

''ہاں...... میں یہ بات جانتا ہوں۔ لیکن میں اپنی پوری کوشش کروں گا کہ قانون کے ہتھے نہ چڑھوں۔ چڑھ گیا تو میں کیا کہہ سکتا ہوں، یہ میری بدقسمتی ہوگی۔ اس دنیا میں بہت سارے قتل آئے دن ہوتے رہتے ہیں۔ بہت کم قاتل پکڑے جاتے ہیں۔ بہت سے بے گناہوں کو پولیس اپنی کارکردگی دکھانے کے لئے پکڑ لیتی ہے۔ آج بھی کتنے قاتل دندناتے پھر رہے ہیں، پولیس انہیں پکڑ نہیں سکتی ہے۔ لیکن میں یہ بات جانتا ہوں کہ عطیہ کے گھر والے میری گرفتاری کے خواہاں نہیں ہوں گے۔ کیونکہ اُن کے گھر اور خاندان کی بدنامی ہوگی۔ ویسے اُنہیں اس بات کا بہت دُکھ اور افسوس ہوگا کہ سونے کی کان ہاتھ سے نکل گئی...... اور پھر کیا معلوم عطیہ اور اُس کا آشنا مرا نہ ہو، وہ زندہ ہوں۔ کیونکہ ایسے بے غیرت اور بے غیرتیں گولیوں سے نہیں مرتے ہیں۔''

''تم نے مجھے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔'' اُس نے میری آنکھوں میں جھانکا۔

''میری کہانی بہت لمبی ہے۔ کیا تم اسے سننا پسند کرو گے؟ کیا تمہارے پاس وقت ہے؟''

''نہیں...... میرے پاس بالکل وقت نہیں ہے۔'' وہ یکلخت کھڑا ہو کر اپنے کپڑے جھاڑنے لگا۔ پھر اُس نے مصافحے کے لئے ہاتھ میری طرف بڑھا دیا۔ ''اچھا دوست! اجازت دو...... تم سے مل کر، بڑی خوشی اور تقویت ہوئی۔ خدا تمہیں خوش رکھے...... میری ایک بات یاد رکھنا...... کبھی تم بھولے سے بھی کسی ماڈل گرل یا اداکارہ سے شادی نہیں کرنا۔ ایک بازارِ حسن کی طوائف ہوتی ہے، یہ شوبزنس کی طوائف ہوتی ہے۔ امریکہ ہو یورپ ہو یا ایشیاء شوبزنس کی دنیا کی کوئی لڑکی پارسا نہیں ہوتی ہے۔ تم نے میری کہانی سے سبق حاصل نہیں کیا تو تم دنیا کے بدقسمت ترین انسان ہو گے۔''

پھر وہ مجھ سے گرمجوشی سے مصافحہ کر کے اندھیرے میں گم ہو گیا۔

○

دوسرے دن صبح کے اخبارات میں عطیہ اور اُس کے آشنا پر قاتلانہ حملے کی خبر نمایاں تھی۔ اُن دونوں کی تصویریں چھپی ہوئی تھیں۔ خبر کی سرخی یہ تھی کہ...... عطیہ کے ایک پرستار نے شادی سے انکار پر غصے میں آ کر عطیہ اور اُس کے دوست پر قاتلانہ حملہ کر دیا۔ وہ دونوں شدید زخمی ہو گئے۔ اُن کی حالت خطرے سے باہر ہے۔ پولیس ملزم کو سرگرمی سے تلاش کر رہی ہے۔ مزید سنسنی خیز انکشافات متوقع ہیں۔

پولیس کی مٹھی گرم کر کے اصل خبر دبا دی گئی۔ غیاث ساگر کے لئے کوئی خطرے والی بات نہ رہی تھی۔

میں ساری رات کرب ناک اذیت، وحشت اور اضطراب سے اپنے ہوٹل کے کمرے میں ٹہلتا رہا۔ کبھی کبھی بالکنی میں آ کر کھڑا ہو جاتا۔ نیند میری آنکھوں سے دُور تھی۔ مجھے اپنی قسمت پر رونا آ رہا تھا کہ میں اب تک اپنی ذات اور اپنے گھر والوں کو تلاش نہیں کر پایا۔ میں حالات اور واقعات کے دلدل میں اس بری طرح گر گیا تھا کہ بمشکل تمام نکل پایا تھا۔ اگر میں ٹیلی پیتھی کے علم سے واقف نہ ہوتا تو اللہ جانے میرا کیا حشر ہوتا اور میرے ساتھ کیا سلوک کیا جاتا۔ اتنے دنوں، اتنے گھروں کی خاک چھاننے اور عجیب وغریب اور پُر خطر واقعات سے گزر جانے کے باوجود میں اپنی منزل نہیں پا سکا تھا اور مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اب کبھی میں اپنی منزل نہیں پا سکتا۔ میں نا اُمید اور مایوس ہونے لگا۔ میرے دل کے کسی کونے میں ایک نادیدہ آواز گونجی...... سالار! نا اُمید اور مایوس کیوں ہوتے ہو......؟ حوصلہ کیوں ہار رہے ہو......؟ منزل ایسے نہیں ملتی ہے۔ راستہ کٹھن اور دُشوار گزار ضرور ہے۔ لیکن یہ تمہیں منزل کی طرف لے جا رہا ہے۔

سہ پہر ڈھلتے ہی میں سیر کے لئے ساحل سمندر پر آ گیا۔ سیر تو ایک بہانہ یا وقت گزاری تھی، میں یہاں اپنی تلاش اور شناخت کے لئے آیا تھا۔ گرمی کے باعث مرد، عورتیں اور بچے جیسے اُبلے پڑ رہے تھے۔ وہ سمندر کے کنارے نہا رہے تھے، چھیڑ چھاڑ، اُچھل کود اور ہنسی مذاق کے علاوہ اُسے پانی میں گھسیٹ رہے تھے جو پانی سے ڈرتا تھا۔ جو خاندان گاڑیوں اور بسوں میں آئے تھے وہ اپنے گروہ اور ٹولیوں کی شکل میں کھڑے ہوئے تھے۔ معمر اور عمر رسیدہ لوگ پتھروں پر بیٹھے موسم اور ان لوگوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

میری نگاہ ایک ایسے شخص پر پڑی جس کی عمر تیس بتیس برس کی ہوگی۔ وہ خوبصورت،

وجیہہ، اور بے حد پُرکشش شخصیت کا مالک تھا۔ اُس کے چہرے پر کرب و اذیت چھائی ہوئی تھی اور اُس کی آنکھوں سے حزن و ملال جھانک رہا تھا۔ اُس کے دماغ میں ایک انتشار سا تھا، ایک ذہنی کشمکش جاری تھی۔ اُس کی نظریں سمندر کی لہروں پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ جو کچھ سوچ رہا تھا، وہ میرے ذہن نے پڑھنا شروع کر دیا۔ وہ مجھ سے قریب ہی بیٹھا تھا لیکن میری موجودگی سے بے نیاز اور بے پرواہ تھا۔ دراصل اُسے اُس کے غم نے زندگی اور دنیا سے بیزار کیا ہوا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ ایک فیصلہ کر کے اُٹھا اور سمندر کی طرف جانے کے لئے میرے قریب سے گزرا۔ اُس نے جو فیصلہ کیا، وہ بے حد خطرناک تھا۔ میں نے اُسے آواز دی۔

''جناب! میری ایک بات تو سنیں......''

اُس نے رُک کر میری طرف حیرت سے دیکھا، میرے قریب آ کر اُس نے کہا۔

''فرمایئے!''

''آپ خودکشی کے لئے کیوں جا رہے ہیں؟'' میں نے اُس کے چہرے پر نظریں مرکوز کرتے ہوئے کہا۔

''جی......؟'' وہ بھونچکا سا ہو گیا۔ چند ثانیوں کے بعد اُس نے کہا۔ ''یہ آپ سے کس نے کہہ دیا کہ میں خودکشی کرنے جا رہا ہوں؟''

''آپ کا چہرہ، غم اور کرب و اذیت اس بات کی چغلی کھا رہے ہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

''یہ آپ کا اندازہ ہے... ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' اُس نے تکرار کے انداز میں کہا۔

''ہاں...... یہ میرا اندازہ ہے۔ لیکن میں جو اندازہ لگاتا ہوں وہ کبھی غلط نہیں ہوتا۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''مجھے کیا ضرورت پڑی ہے کہ میں خودکشی کروں؟'' اُس کی آواز بے جان سی تھی۔ ''یہ بات ضرور ہے کہ میں کسی وجہ سے بے حد پریشان اور غمگین ہوں۔ لیکن آپ نے میری پریشانی بھانپ کر یہ اندازہ کیسے کر لیا کہ میں خودکشی کرنے والا ہوں؟''

''آپ کو جو غم اور پریشانی لاحق ہے، اس نے آپ کو خودکشی کرنے پر مجبور کیا ہے۔ کیونکہ آپ کو اپنی پریشانی کا کوئی حل نظر نہیں آ رہا ہے، اس لئے آپ نے خودکشی کرنے کا فیصلہ کیا۔ آپ کے نزدیک اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں ہے۔''

وہ لاجواب سا ہو گیا۔ اُس نے کہا۔ ''آپ اپنا اندازہ اور خیال اپنے پاس رکھیں۔''

''خودکشی ایک حرام موت ہے جو اللہ کو پسند نہیں ہے...... یہ ایک جرم بھی ہے۔'' میں نے کہا۔

''ہاں...... میں جانتا ہوں۔ مجھے نصیحت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ اپنے کام سے کام رکھیں۔'' وہ تلخی سے بولا۔

''لیکن آپ نے یہ بھی سوچا ہے کہ خودکشی کرنے سے آپ کی بیوی اور بچوں کا کیا بنے گا؟'' میں نے کہا۔

''یہ آپ نے کیا رٹ لگا رکھی ہے، خودکشی...... خودکشی......'' اُس نے بگڑتے ہوئے برہمی سے کہا۔

''سنو دوست!'' میں نے کہا۔ ''اس وقت آپ، اپنے آپ میں نہیں ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ آپ خودکشی کرنے جا رہے ہیں۔ ایک ہارے ہوئے آدمی کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا ہے۔ لیکن میں آپ کا غم اور پریشانی دُور کر سکتا ہوں۔ آپ کی ہار کو جیت میں بدل سکتا ہوں۔ اس طرح آپ خودکشی سے بچ جائیں گے۔''

وہ چونک گیا، پھر اُس نے کہا۔ ''نہیں...... آپ میرے لئے کچھ نہیں کر سکتے۔ یہ ناممکن ہے کہ میری پریشانی اور مسئلہ حل ہو جائے، میں جو ہار چکا ہوں وہ جیت میں بدل جائے۔ اب آپ اپنی زبان پر خودکشی کا نام نہ لائیں۔''

''دنیا میں کوئی چیز ناممکن نہیں ہے۔ میں آپ کو اس بات کی ضمانت دیتا ہوں کہ آپ کی پریشانی اور غم کو دُور کر دُوں گا۔ آپ کی ہار، جیت میں بدل جائے گی۔ آپ اللہ کی ذات سے مایوس نہ ہوں۔'' میں نے اُسے دلاسہ دیا۔

''اچھا......'' اتنا کہہ کر وہ چند ثانیوں تک کچھ سوچتا رہا، پھر اُس نے کہا۔ ''ایسا کس طرح سے ہو سکتا ہے؟''

''پہلے آپ مجھے بتائیں گے کہ مسئلہ اور پریشانی کیا ہے؟ پھر میں بتاؤں گا کہ میں کیا کر سکتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ ہم دونوں چل کر ریسٹورنٹ میں بیٹھتے ہیں۔ یا آپ مناسب سمجھیں تو میرے ساتھ میرے ہاں چلیں۔''

''آپ میرے ہاں چلیں...... میں نے اپنی بیوی اور بچوں کو میکے بھیجا ہوا ہے۔ وہ تین

چار دن بعد آئیں گے۔ آج کل سکول کی چھٹیاں ہیں۔ ہم وہاں آرام سے بیٹھ کر باتیں کر سکتے ہیں۔'' اُس نے کہا۔

راستے میں ہم دونوں ایک دوسرے سے متعارف ہوئے۔ اُس نے اپنا نام عارف بتایا۔ میں نے اُس کے ذہن سے معلوم کرلیا تھا کہ اُس کی پریشانی اور مسئلہ کیا ہے۔ لیکن میں پھر بھی اُس کی زبانی سننا چاہتا تھا۔

وہ گلبرگ میں ایک سو بیس گز کے مکان میں اقامت پذیر تھا۔ تین کمروں کا یہ مکان خوبصورت اور نہایت آراستہ و پیراستہ تھا۔ اس گھر سے نہ صرف آسودگی ظاہر ہورہی تھی، بلکہ اُس کی بیوی سگھڑ، سلیقہ شعار اور گھریلو عورت بھی معلوم ہوتی تھی۔ کارنس پر ایک خوبصورت فریم میں اُس کی بیوی اور دو بچوں کی تصویر آویزاں تھی۔ اُس کی بیوی ایک خوبصورت اور دلکش خدوخال کی عورت تھی۔ اُس کے چہرے سے ظاہر تھا کہ وہ ٹھنڈے مزاج کی عورت ہے۔

وہ مجھے نشست گاہ میں بٹھا کر چائے بنانے چلا گیا۔ جب وہ چائے بنا کر لے آیا تو میں نے کہا۔ ''آپ مجھے جو کچھ بھی سنائیں گے، پوری سچائی اور دیانت داری سے سنائیں گے...... کوئی ایک لفظ بھی نہیں چھپائیں گے۔''

''ٹھیک ہے......'' اُس نے سر ہلایا۔ پھر اُس نے کہنا شروع کیا۔ ''میں ایک مقامی فرم میں کیشیئر ہوں۔ تقریباً دس برس سے یہ فرائض انجام دے رہا ہوں۔ اس فرم میں جو سٹاف ہے اس میں مردوں کے علاوہ عورتیں بھی ملازمت کرتی ہیں۔ کوئی ایک سال پہلے ایک لڑکی نجمہ نے شادی کرنے کے بعد ملازمت کو خیرباد کہہ دیا تو اُس کی جگہ زاہدہ نامی ایک جواں سال عورت آ گئی۔ وہ تیس برس کی تھی لیکن اُس میں جو جاذبیت اور دلکشی تھی وہ میں نے اس عمر کی عورتوں میں نہیں دیکھی۔ اُس کا سراپا کسی قیامت سے کم نہیں تھا، دل کو گرما دینے اور رگوں میں خون کی گردش تیز کردینے والا تھا۔ پہلے ہی دن اُس کا سراپا جس میں جوانی کا خمار بھرا ہوا تھا، دفتر کے مردوں کے دلوں پر بجلی بن کر گرا تھا۔ میں اُس روز رات کو بہت دیر تک سو نہ سکا۔ اُس کا سراپا میری نظروں کے سامنے لہراتا، بل کھاتا اور بےحجاب سا ہوتا رہا۔ میں تصور میں بہت دور نکلتا رہا۔

دفتر میں کسی عورت کی ایسی جامہ زیبی نہ تھی۔ باس اور ایم ڈی کی سیکرٹریاں جو تھیں وہ

ھی اُس کا مقابلہ نہیں کرتی تھیں۔ وہ اپنی تنخواہ سے زیادہ خرچ کرتی تھی۔ لگتا تھا کہ اُس ے پاس کسی چیز کی کمی نہیں ہے، وہ بے حد دولت مند ہے۔ وہ غیر شادی شدہ تھی۔ اُس کی ائش بھی کے ڈی اے سکیم نمبر ایک کے ایک لگژری اپارٹمنٹ میں تھی۔

وہ دفتر میں بہت جلد نہ صرف عورتوں بلکہ مردوں سے بھی فری ہوگئی۔ وہ دفتر میں مجھ ے بہت قریب اس لئے تھی کہ اُس کا مجھ سے زیادہ واسطہ پڑتا تھا۔ میں اُس پر ریشہ خطمی گیا تھا، یہ جانتے اور سمجھتے ہوئے کہ میں ایک شادی شدہ شخص ہوں، دو بچوں کا باپ ں میں اُس کے سراپا اور پُرشباب گداز بدن کا اسیر بن گیا تھا۔

ایک روز چھٹی سے کچھ دیر قبل اُس نے مجھ سے کہا۔ ''عارف صاحب! آج میری الگرہ ہے۔ کیا آپ میرے غریب خانے پر قدم رنجہ فرما سکتے ہیں...... بڑی خوشی ہوگی اگر پ تشریف لائیں۔''

''اس قدر مختصر نوٹس؟'' میں نے حیرت سے کہا۔ ''آپ کل بھی دعوت دے سکتی تھیں۔''

''دراصل میں ہمیشہ اپنی سالگرہ کی تاریخ بھول جاتی ہوں۔ کچھ دیر پہلے مجھے اچانک د آیا۔'' اُس نے کہا۔ ''آپ کچھ خیال مت کریں۔ آپ رات نو بجے تک تشریف لے ئیں۔''

''آپ نے دفتر میں اور کس کس کو مدعو کیا ہے اپنی سالگرہ پر......؟'' میں نے پوچھا۔

''صرف آپ ایک اکیلے کو......'' اُس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''صرف مجھے کیوں......؟'' میں نے حیرت سے کہا۔ ''دفتر میں لوگ کیا سوچیں گے؟ یا کہیں گے؟ آپ سے شکایت کریں گے۔''

''صرف اس لئے کہ میں اپنی سالگرہ میں بھیڑ بھاڑ پسند نہیں کرتی۔'' اُس نے کہا۔ میں ہمیشہ اپنی سالگرہ بڑی سادگی سے مناتی ہوں۔ آپ دفتر میں کسی کو میری سالگرہ کے ے میں نہیں بتائیں۔ خاموشی سے چلے آئیں۔''

میں رات نو بجے ایک تحفہ لے کر اُس کے اپارٹمنٹ پر پہنچا۔ اطلاعی گھنٹی بجانے پر اُس ے دروازہ کھولا۔ اُسے ساڑھی اور بلاؤز میں دیکھ کر میری رگوں میں خون کی گردش تیز ہو ی۔ وہ اس لباس میں ایک ہندوستانی فلمی اداکارہ کی طرح لگ رہی تھی۔ وہ بلاؤز نہیں ایک دھجی تھا۔ ساڑھی اُس نے ناف سے نیچے باندھ رکھی تھی۔ وہ نئی نویلی دلہن کی

طرح لگ رہی تھی۔ رات کی رانی کی طرح مہک رہی تھی۔ میں نے اندر داخل ہو کر اُس کا اپارٹمنٹ دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا...... ایسا شاندار، آراستہ و پیراستہ اور خوابناک ماحول کا اپارٹمنٹ تو دفتر کے ایم ڈی کا بھی نہیں تھا۔

صرف میں اکیلا مہمان تھا۔ میں نے اُس سے پوچھا۔ ''اور مہمان، کہاں ہیں؟ کیا دیر سے آئیں گے؟''

''میں اپنی سالگرہ پر صرف ایک مہمان کو مدعو کرتی ہوں۔'' اُس نے جواب دیا۔ ''یہ میری روایت رہی ہے۔''

اُس کے جواب اور اس احساس نے میرے سارے جسم میں میٹھی سی سنسنی دوڑا دی کہ میں اکیلا ہوں۔ اُس نے مجھے بتایا کہ وہ اکیلی رہتی ہے۔ پھر اُس نے کیک کاٹا۔ تھوڑی دیر بعد اُس نے مجھ سے پوچھا کیا میں شراب وغیرہ کا شوق رکھتا ہوں؟ میں نے اُسے بتایا کہ میں نے آج تک چکھی نہیں ہے۔ دل میں کہا...... تم شراب سے کیا کم ہو...... بغیر پئے ہی مجھ پر نشہ سا چھا رہا ہے، میں بہکنے لگا ہوں۔

میں نے سوچا کہ مجھے یہاں سے جلد سے جلد چلا جانا چاہئے۔ کیونکہ تنہائی کسی ناگن کی طرح ڈس رہی تھی۔ پھر اُس کے نامناسب لباس اور جسم کی نمائش نے میرے جذبات کو تند کر دیا تھا۔ مجھے یہ ڈر اور خوف لگ رہا تھا کہ کہیں میرا پیر پھسل نہ جائے۔ یہ کوئی ناممکن بات نہ تھی۔ میں ایک جوان مرد تھا۔ میں اپنے جذبات کو جس طرح قابو میں کئے ہوئے تھا یہ میرا دل ہی جانتا تھا۔ میں ایک شادی شدہ شخص ہوتے ہوئے اُسے فتح کرنے کے بارے میں سوچتا رہتا تھا۔ آج ایک سنہری موقع ملا تھا لیکن اس سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے بزدلی سی ہو رہی تھی۔

اُس نے کھانے کی میز پر مجھ سے دریافت کیا۔ ''چھٹی والے دن آپ کی کیا مصروفیت رہتی ہے؟''

''میں گیارہ بجے تک سوتا رہتا ہوں۔ پھر لنچ کر کے ایک دوست کے ہاں تاش کھیلنے چلا جاتا ہوں۔'' میں نے بتایا۔

''وہاں کون کون سے کھیل کھیلے جاتے ہیں......؟'' اُس نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''رمی یا فلیش ہوتا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن میرے دوست فلیش کو ترجیح دیتے ہیں۔''

''تو آپ کسی بھی چھٹی والے دن میرے ہاں تاش کھیلنے کے لئے آ جائیں۔'' وہ بولی۔

''کیا آپ کے ہاں بھی تاش کی محفل جمتی ہے؟'' میں نے متعجب نظروں سے اُسے دیکھا۔

''تاش کا کھیل میری بہت بڑی کمزوری ہے۔'' وہ بولی۔ ''ہر چھٹی والے دن سہ پہر کے وقت میرے ہاں تاش کی محفل جمتی ہے۔ میری سہیلیاں اور اعلیٰ گھرانوں کی بیگمات بھی کھیلنے کے لئے آتی ہیں، آپ بھی آ جایا کریں۔''

''کیا مرد حضرات کھیلنے نہیں آتے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''کبھی کبھی آ جاتے ہیں...... لیکن میں اجنبی مردوں کو مدعو نہیں کرتی۔ میں اور میری دو تین سہیلیاں ہیں جو وقت گزاری کے لئے کھیلتی ہیں۔ وہ یا میں اپنی سہیلی یا جاننے والی بیگمات کو مدعو کر لیتی ہیں۔''

''آئندہ اتوار کو میں حاضر ہو جاؤں گا......'' میں نے کہا۔ ''خواتین کے ساتھ کھیلنے کا یہ میرے لئے پہلا اتفاق ہوگا۔''

کھانے سے فراغت پانے کے بعد میں نے جانے کی اجازت چاہی۔ اسی وقت اچانک بجلی چلی گئی۔ بجلی کے جاتے ہی گھپ اندھیرا چھا گیا۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ دوسرے لمحے میں نے اندھیرے میں اپنی گردن میں مرمریں بانہوں کو سانپ کی طرح لپٹتے ہوئے محسوس کیا...... پھر میں نے اپنے ہونٹوں اور گالوں پر گرم گرم سانسیں، جلن اور مہک سی محسوس کی۔ زاہدہ، زاہدہ نہ رہی، میں عارف نہ رہا۔ ہم دونوں غلاظت کی دلدل میں جا گرے...... اُس کی گرمجوشی اور خود سپردگی کے طوفان نے ہمیں دلدل میں دھنسا دیا۔ بجلی جلد ہی آ گئی تھی لیکن ہم اتنی دُور چلے گئے تھے کہ واپسی جلد نہیں ہو سکتی تھی۔

طوفان تھم گیا۔ سرفرازی کے بعد وہ خوابناک لہجے میں بولی۔ ''تم پہلے مرد ہو جو میری زندگی میں آئے۔''

''میری شادی سے پہلے اور شادی کے بعد تم پہلی عورت ہو جو میری زندگی میں آئی ہو۔'' میں نے اُس کے بالوں کو سہلاتے ہوئے کہا۔

''کیا تم رات رُک نہیں سکتے ہو....؟'' اُس نے مجھے خود سپردگی کی نظروں سے دیکھا۔

''کیوں نہیں......'' میں نے کہا۔ میں رُک گیا۔ یہ رات مجھے سہاگ کی پہلی رات کی

طرح لگی۔

تیسرا دن اتوار کا تھا۔ لیکن میں ہفتے والے دن دفتر سے سیدھا اُس کے ہاں پہنچ گیا تاکہ اُس روز کی یاد کو تازہ کیا جائے۔ وہ چاہتی تھی کہ میں رات رُک جاؤں، لیکن میں رُکا نہیں، کیونکہ میرے بچے کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ البتہ میں اتوار کے دن سہ پہر کے وقت اُس کے ہاں تاش کھیلنے پہنچ گیا۔ وہاں زاہدہ کی تین سہیلیاں موجود تھیں۔ اُس کی یہ سہیلیاں اُس کی ہم عمر، خوبصورت اور طرح دار بھی تھیں۔ تاش کھیلنے کے انداز سے پکی اور ماہر جواری معلوم ہوتی تھیں۔ میں دس ہزار کی رقم لے کر گیا تھا۔ لیکن وہ چاروں تیس سے پچاس ہزار روپے لے کر بیٹھی تھیں۔ زاہدہ نے مجھ سے کہا تھا کہ میں چاہوں تو اس سے جتنی رقم چاہے مرضی لے سکتا ہوں۔ مجھے اس کی ضرورت نہ پڑی کیونکہ میں نے بہت محتاط ہو کر کھیل میں حصہ لیا تھا۔ جب میں اُٹھا تو آٹھ ہزار روپے کی جیت میں تھا۔ میں نے اتنی بڑی رقم کبھی نہیں جیتی تھی۔ میں دوستوں کے ساتھ جو کھیلتا تھا اُس میں ہار جیت میں دو سو سے ہزار روپے تک ہوتے تھے۔ ہماری یہ کوشش ہوتی تھی کہ کوئی بڑی رقم ہارنے نہ پائے۔

ادھر میرے زاہدہ سے تعلقات استوار ہو گئے۔ دو ایک مہینے میں، میں ایک مرتبہ بھی ہارا نہیں تھا۔ ادھر زاہدہ کو بھی میں نے کبھی ہارتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ پھر میری سمجھ میں آیا کہ اُس کی پُرتعیش زندگی کا کیا راز ہے۔ وہ فال بھی نکالتی تھی جو اپارٹمنٹ کے کرائے اور مشروبات کے لئے ہوتی تھی۔ اُس نے یہ اپارٹمنٹ بیس ہزار روپے ماہانہ کرائے پر لیا ہوا تھا۔ ہر نشست میں پانچ سے سات ہزار روپے کی نال نکلتی تھی۔ یہ نال ایک طرح سے اُس کی آمدنی تھی۔ ہر ماہ اُسے میرے اندازے کے مطابق تیس بتیس ہزار کا فائدہ ہو جاتا تھا۔

ایک روز جب میں دفتر سے اُس کے ہاں پہنچا تو اُس نے کہا۔ ''اتوار کے روز دو بیگمات کھیلنے آ رہی ہیں جو کروڑ پتی ہیں۔ کیا تم اُس روز اُن کے ساتھ کھیلنا پسند کرو گے؟''

''کیوں نہیں ......'' میں نے کہا۔ ''آج کل میری قسمت زوروں پر ہے۔ دو ماہ سے نہ صرف میں تمہیں جیت رہا ہوں بلکہ ہر ہفتہ آٹھ دس ہزار کی رقم بھی جیت کر گھر لے جا رہا ہوں۔ اس مرتبہ شاید بیس پچیس ہزار روپے جیت لوں۔''

''بیس پچیس ہزار نہیں بلکہ چار پانچ لاکھ روپے بھی جیت سکتے ہو۔'' زاہدہ نے کہا۔

''چار پانچ لاکھ روپے......؟ وہ کیسے......؟'' میں نے حیرت سے اُس کی شکل دیکھی۔

''وہ اس طرح کہ اس کھیل میں حصہ لینے والے کو دس لاکھ روپے شو کرنا ہوں گے، تبھی وہ اس کھیل میں حصہ لے سکتا ہے۔ نو لاکھ روپے بھی ہوں تو اُسے شریک نہیں کیا جائے گا......؟'' زاہدہ نے کہا۔

''دس لاکھ روپے......؟'' میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ ''میں اتنی بڑی رقم کہاں سے لا سکتا ہوں؟ ہاں پچاس ہزار روپے کا بندوبست ہو سکتا ہے۔ میرے پاس اتنی رقم تو موجود ہے۔''

''چار پانچ لاکھ جیتنے کا سنہرا موقع پھر کبھی تمہیں نہیں ملے گا...... کہیں نہ کہیں سے بندوبست کرو۔'' اُس نے زور دیا۔

''میں ایک لاکھ روپے کا بندوبست نہیں کر سکتا، تم دس لاکھ روپے کے لئے کہہ رہی ہو۔'' میں نے کہا۔

وہ کچھ دیر خاموش رہی۔ اُس کی آنکھوں میں سوچ بھر گئی۔ پھر یکایک اُس کا حسین چہرہ دمک اُٹھا اور اُس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

''تم چاہو تو دس لاکھ کیا پندرہ لاکھ روپے کا بندوبست بھی کر سکتے ہو۔'' وہ رسیلی آواز میں بولی۔

''وہ کیسے اور کہاں سے......؟'' میں نے اُسے متعجب نظروں سے دیکھا۔

''تم کیشیئر ہو...... کمپنی کے دفتر میں پندرہ بیس لاکھ کی رقم ہر وقت موجود رہتی ہے۔ تم ایک دن کے لئے کیا دس لاکھ روپے نکال کر نہیں لا سکتے ہو؟ تجوری کی چابیاں اور سارا حساب کتاب تمہارے پاس ہوتا ہے۔'' اُس نے کہا۔

''وہ کمپنی کی امانت ہے۔ میں باس کی اجازت کے بغیر اس میں سے دس روپے بھی نہیں نکال سکتا۔''

''صرف ایک دن کی تو بات ہے۔'' وہ میرے گلے میں اپنی مرمریں بانہیں حمائل کر کے بولی۔ ''سنیچر کی شام رقم نکال لو اور پیر کے دن صبح جا کر رکھ دینا...... باس کے فرشتوں کو بھی ہوا نہیں لگے گی اور تمہارا کام بھی بن جائے گا۔''

''جانے کیوں مجھے ایک انجانا ڈر اور خوف سا محسوس ہو رہا ہے۔ اگر میں ہار گیا تو......؟''

''تم خوامخواہ ڈر رہے ہو...... سوچ لو! تمہیں پھر کبھی پانچ چھ لاکھ روپے جیتنے کا سنہری

موقع نہیں ملے گا۔ ہارنے کا سوال اس لئے پیدا نہیں ہوتا کہ اس دو تین ماہ کے عرصے میں تم ایک دن بھی نہیں ہارے ہو۔ تم قسمت کے دھنی ہو۔ مقدر کے سکندر ہو۔ اور پھر یہ بیگمات کوئی جواری نہیں ہیں۔ اُن کے پاس حرام کی دولت ہے۔ اس سے پہلے بھی وہ ایک مرتبہ ہار گئی ہیں۔''

''اچھا، مجھے سوچنے دو......'' میں نے اُس کی مخمور آنکھوں میں ڈوبتے ہوئے کہا۔

ہم دونوں جب تک کیف وسرور کے جہانوں میں سیر کرتے رہے وہ مجھے دس لاکھ روپے دفتر سے نکالنے کے لئے سمجھاتی رہی۔ آخر کار میں نے اُس کی بات مان لی۔ کھیل کا پروگرام اتوار کی بجائے ہفتہ کی شام رکھا گیا۔ وہ دونوں بیگمات رات نو بجے پہنچیں۔ زاہدہ اور اُس کی تینوں سہیلیوں نے بھی دس دس لاکھ ٹیبل شو کئے۔ میں نے بھی کئے، بیگمات نے بھی کئے۔ کھیل شروع ہوا۔ ابتداء میں، میں تین چار لاکھ روپے جیت رہا تھا۔ کھیل میں داؤ لگانے کے لئے ٹوکن دیئے گئے تھے۔ کھیل کے دوران شراب اور مشروبات کا دور بھی چلا۔ زاہدہ نے مجھے شراب چکھادی تھی۔ یہ خون کی طرح میرے منہ لگ گئی تھی۔ میں رات کے آخری حصے میں ٹھیک سے کھیل نہیں سکا۔ اس کی وجہ شاید شراب کا نشہ تھا یا نیند کا غلبہ... صبح ہوئی تو میرے پاس دس روپے بھی نہیں بچے تھے۔ سب سے زیادہ رقم زاہدہ نے جیتی تھی۔ اُس کی تینوں سہیلیاں بھی جیت میں تھیں۔ میں اور دو بیگمات تیس لاکھ ہار چکی تھیں۔

میرا سارا نشہ ہرن ہو گیا۔ میں نے زاہدہ سے کہا کہ وہ مجھے دس لاکھ روپے دیدے تاکہ میں دفتر لے جا کر رکھ دُوں، پھر کسی نہ کسی طرح اُسے ادا کر دُوں گا۔ زاہدہ نے صاف انکار کر دیا۔ دس لاکھ کیا وہ مجھے ایک ہزار روپے دینے کے لئے بھی تیار نہیں ہوئی۔ اُس کی آنکھوں میں سؤر کا بال آ گیا تھا۔ میں اُس کے ہاں سے نکلا تو میری حالت مُردے سے بھی بدتر تھی۔

اتفاق سے باس پندرہ بیس دنوں کے لئے امریکہ گیا ہوا تھا۔ میں کچھ ادائیگیوں کو کسی نہ کسی بہانے ٹالتا رہا۔ تجوری میں صرف گیارہ لاکھ روپے رکھے تھے۔ میرے لئے دس لاکھ کیا، ایک لاکھ کا بندوبست بھی مشکل تھا۔ میں ساری زندگی اس کا بندوبست نہیں کرسکتا تھا۔ اس لئے آج میں ساحل سمندر پر آ گیا تاکہ اپنی زندگی کا خاتمہ کر لوں۔ لیکن آپ نے مجھے روک دیا۔

''پھر آپ اُس روز سے زاہدہ کے ہاں نہیں گئے......؟ زاہدہ کا رویہ آپ کے ساتھ

دفتر میں کیسا ہے؟''

''نہیں...... میں زاہدہ کے ہاں نہیں گیا۔ زاہدہ دفتر میں مجھ سے اچھی طرح پیش آتی رہی ہے۔ میرے کمرے میں آ کر محبت اور لگاوٹ کا اظہار کرتی رہی۔ اُسے خود میرے ہارنے پر بہت حیرت ہے۔ اُس نے مجھ سے کہا ہے کہ دفتر میں گیارہ لاکھ کی جو رقم ہے اُسے داؤ پر لگا دو! شاید قسمت بدل جائے۔ میں ہفتہ کو پھر محفل جما رہی ہوں۔ تم آ جاؤ۔''

''میں آپ کو دس نہیں بیس لاکھ روپے جیت کر دے سکتا ہوں۔'' میں نے اُسے دلاسہ دیا۔ ''آپ فکر نہ کریں۔''

''وہ کس طرح سے......؟'' اُس نے بے دلی سے پوچھا۔ اُسے میری بات کا یقین نہیں آیا۔

''وہ اس طرح سے کہ میں ایک نوسر باز ہوں۔'' میں نے جھوٹ بولا۔ اس کے سوا چارہ بھی نہیں تھا۔

''جی......؟'' وہ چونکا۔ اُس کا چہرہ دمک اُٹھا۔ اُس کی آنکھوں میں زندگی کی چمک آ گئی۔ ''آپ سچ کہہ رہے ہیں؟''

''سو فیصد سچ بول رہا ہوں...... لیکن آپ کو دس لاکھ روپے کا انتظام کرنا ہوگا۔'' میں نے کہا۔

''دس لاکھ روپے کا بندوبست......؟'' اُس نے حیرت سے کہا۔ ''میں کیسے کر سکتا ہوں؟ یہ میرے لئے ناممکن ہے۔''

''آپ نے کہا ہے ناں کہ دفتر میں گیارہ لاکھ روپے موجود ہیں...... آپ ان میں سے دس لاکھ روپے نکال لائیں۔''

''نہیں...... نہیں......'' وہ خوفزدہ سا ہو گیا۔ ''میں اب کوئی رسک لینا نہیں چاہتا...... میری عقل ٹھکانے آ گئی ہے۔''

''پھر اس صورت میں آپ خودکشی کر لیں۔ لیکن یہ بھی سوچ لیں کہ آپ کے بیوی اور بچوں کا کیا بنے گا...... اُن کا کوئی پرسان حال نہ ہوگا...... سب کچھ تباہ و برباد ہو کر رہ جائے گا۔ ایک اور رسک لینے میں کیا حرج ہے؟''

کچھ دیر بحث و تکرار کے بعد وہ دس لاکھ روپے نکال کر لانے کے لئے تیار ہو گیا۔ پھر

میں نے اُس سے کہا کہ وہ مجھے آج، ابھی اور اسی وقت زاہدہ کے ہاں لے جا کر میرا تعارف دُبئی کے تاجر کی حیثیت سے کرائے۔ یہ کہے کہ میں اس کا دیرینہ دوست ہوں۔ آج کل دُبئی میں ہوں۔ کاروبار کے سلسلے میں آیا ہوں اور تاش کے کھیل کا بہت شوقین ہوں۔

کچھ دیر بعد ہم دونوں زاہدہ کے ہاں جانے کے لئے نکلے۔ میں زاہدہ سے مل کر اُس کے ذہن سے یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ اس شخص کے ساتھ کیا کھیل کھیلا گیا ہے۔ ہم زاہدہ کے اپارٹمنٹ پر پہنچے۔ واقعی زاہدہ بہت حسین تھی اور اُس کا سراپا بے مثال تھا۔ عارف نے جب اُس سے میرا تعارف کرایا اور یہ بتایا کہ میں بھی تاش کے کھیل میں حصہ لینا چاہتا ہوں تو وہ بہت خوش ہوئی۔ بہت اچھی طرح پیش آئی۔ اُس نے رات کے کھانے اور رات اُس کے ہاں بسر کرنے کی پیشکش کی۔ ہم دونوں اُس کے ہاں کھانا کھا کر واپس ہوئے۔ میں نے زاہدہ کے ذہن سے معلوم کرلیا تھا کہ اُس نے عارف کے ساتھ کیا کھیل کھیلا تھا۔

دوسرے دن ہفتہ تھا۔ میں اور عارف شام کے وقت زاہدہ کے ہاں پہنچے۔ اُس کی تینوں سہیلیاں اور دو عورتیں موجود تھیں۔ اُن میں ایک مشہور ومعروف فلم ساز عورت تھی اور دوسری ماڈل گرل تھی۔ یہ دونوں بھی دس دس لاکھ روپے لے کر آئی تھیں۔

میں نے زاہدہ کے بارے میں عارف کو بتا دیا تھا کہ وہ کس قماش کی عورت ہے اور اسے کھیل کے دوران کیا کرنا ہے۔ کھیل شروع ہوا۔ جب کھیل اپنے عروج پر تھا، تب عارف پانی پینے کے بہانے دو ایک مرتبہ اُٹھ کر کچن گیا اور پھر آ کر بیٹھ گیا۔ کھیل کے دوران وقفے وقفے سے زاہدہ کی سہیلی نے مشروبات سرو کئے۔ میں دو بریف کیسوں میں دس لاکھ کی رقم لے گیا تھا، جبکہ ایک ہی بریف کیس میں پوری رقم آ سکتی تھی۔ اس کی وجہ کچھ اور تھی۔

کھیل میں اُتار چڑھاؤ آتا رہا۔ جب کھیل ختم ہوا تو میں پورے بائیس لاکھ روپے جیت چکا تھا۔ اگر میں ذہن پڑھنے کا علم نہیں رکھتا تو شاید بائیس سو روپے بھی نہیں جیتتا۔ دراصل ان چھ عورتوں نے مل کر مجھے ہرانے کی کوشش کی۔ یہ زاہدہ کی سہیلیاں تھیں۔ میں نے نوٹوں سے بھرا بریف کیس عارف کے حوالے کیا تو وہ یہ سمجھیں کہ وہ خالی ہے کیونکہ میں نے عارف سے کہا تھا کہ وہ یہ خالی بریف کیسے لے جائے، رقم والا بریف کیس رہنے دے تاکہ شام کے وقت محفل جمی تو کھیل سکوں۔

زاہدہ اور اُس کی سہیلیوں کے چہرے فق تھے کیونکہ اُنہوں نے بائیس لاکھ کی رقم ہار دی

تھی۔ پہلے عارف گھر گیا، پھر زاہدہ کی سہیلیاں بھی چلی گئیں۔ میں نے زاہدہ سے کہا کہ میں ہوٹل نہیں جانا چاہتا، یہیں آرام کرنا چاہتا ہوں۔ یہ سن کر وہ بہت خوش ہوئی۔ جب میں سونے کے لئے بستر پر دراز ہوا تو تھوڑی دیر کے بعد زاہدہ مجھ پر مہربان ہونے کے لئے میرے ساتھ لیٹ گئی۔ میں نے آنکھیں بند کرلیں۔ مجھے نیند نے دبوچ لیا، پھر مجھے خبر نہ ہوسکی۔

کسی کے جھنجھوڑنے پر جب میں بیدار ہوا تو میں نے دیکھا، بستر پر لیٹا ہوا ہوں۔ زاہدہ پلنگ کے پاس کھڑی ہوئی ہے اور اس کے ہاتھ میں پستول ہے اور وہ غصے سے کانپ رہی ہے۔ اُس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا، آنکھیں شعلے برسا رہی تھیں۔ فرش پر میرا بریف کیس کھلا پڑا ہوا تھا...... مجھے بیدار کر کے وہ پھنکاری۔ ''رقم کہاں ہے؟''

میں آنکھیں ملتا ہوا اُٹھ بیٹھا۔ ''یہ میں نے کیسا خواب دیکھا...... کیسا حسین اور رنگین خواب تھا۔ آپ میرے ساتھ بستر پر لیٹی ہوئی تھیں، ہونٹوں کی مٹھاس اور تپش میں نے اپنے چہرے پر محسوس کی تھی۔ کہاں گیا وہ خواب......؟''

''مجھے بیوقوف مت بنائیں...... وہ رقم کہاں ہے؟'' وہ ہیجانی لہجے میں چیخی۔

''کہیں میں کوئی دوسرا خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں؟'' میں نے بے پرواہی سے کہا۔

''اگر آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا تو پھر آپ موت کا خواب دیکھیں گے۔''

اُس کا پارہ چڑھ گیا۔

''آپ کی ہر بات کا جواب دُوں گا...... لیکن آپ یہ بتائیں کہ آپ کو اس رقم سے کیا مطلب...... کیا واسطہ......؟'' میں نے پوچھا۔ ''وہ میری جیتی ہوئی رقم تھی۔ وہ رقم میں نے عارف کے ہاتھ اپنے ہوٹل بھیج دی ہے۔''

''یہاں کا اصول یہ ہے کہ جو رقم جیتتا ہے وہ اس کا چالیس فیصد مجھے دے کر جاتا ہے۔'' وہ جھنجھلا کر بولی۔

''آپ نے اپنے اس اصول کے بارے میں پہلے کیوں نہیں بتایا...... ورنہ میں کھیلنے نہیں بیٹھتا...... آپ کو نال سے سوا لاکھ روپے ملے ہیں...... کیا یہ رقم کافی نہیں ہے؟'' میں نے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

''میں یہ سمجھی کہ عارف نے آپ کو بتایا ہوگا اسی لئے میں نے کہنا مناسب نہیں سمجھا۔'' اُس نے جواب دیا۔

''محترمہ! یہ کوئی اصول ہے؟ بالفرض یہ اصول ہے تو پھر ہارنے والے کو بھی کچھ ملنا چاہئے...... یہ عجیب اصول ہے۔ میں نے کبھی یہ اصول کہیں دیکھا اور نہ سنا...... یہ اصول نہیں بلکہ سراسر بدمعاشی ہے۔'' میں نے کہا۔

''جو بھی ہے، جیسا بھی ہے یہ میرا اصول ہے...... آپ ابھی اور اسی وقت عارف کو ٹیلی فون کر کے رقم واپس منگوائیں۔'' وہ تیز لہجے میں بولی۔ ''اُس میں سے چالیس فیصد حصہ مجھے دیں جو میرا حق بنتا ہے۔''

''بالفرض محال میں نے اس میں سے چار فیصد بھی نہیں دیا تو آپ کیا کریں گی؟'' میں نے کہا۔

''میں آپ کو شوٹ کر کے کھڑکی سے آپ کی لاش باہر پھینک دُوں گی۔'' اُس نے خشونت آمیز لہجے میں کہا۔

''اس سے کیا حاصل ہوگا؟ اس صورت میں بھی آپ رقم سے محروم رہیں گی۔'' میں مسکرایا۔

''آپ بھی تو محروم ہو جائیں گے...... اس جہاں سے سدھار جائیں گے۔'' وہ استہزائیہ لہجے میں بولی۔

''لیکن آپ اس صورت میں جیل کی ہوا کھائیں گی۔ لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ سوچ لیں!'' میں نے ہنس کر کہا۔

''اچھی طرح سوچ لیا ہے...... پولیس ثبوت ملنے پر ہاتھ ڈالتی ہے۔ اسے آپ کے قتل کا کوئی ثبوت نہیں ملے گا۔''

''عارف سب سے بڑا ثبوت ہے...... پولیس کو اُگلوانے کے سینکڑوں پُرتشدد طریقے آتے ہیں۔ آپ کیوں اپنی اس حسین اور پُرکیف زندگی کو غارت کرنے پر تلی ہوئی ہیں، اپنے پیروں پر کلہاڑی مار رہی ہیں؟'' میں نے ناصحانہ انداز میں کہا۔

''میری سہیلیاں میری موجودگی کو کسی اور جگہ ثابت کریں گی۔ پولیس کو ثبوت کہاں ملے گا؟'' وہ بولی۔

''عارف اس مسئلے کو حل کر لے گا اور آپ کو کیفرکردار تک پہنچا دے گا۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''کسی کو قتل کرنا اور اس جرم کو چھپانا بہت مشکل ہوتا ہے۔ ذرہ برابر ثبوت بھی پھانسی کے تختے پر پہنچا دیتا ہے۔ کچھ باتیں ایسی ہیں جن پر آپ نے غور نہیں

کیا...... گیٹ پر جو سکیورٹی گارڈ ہے وہ آپ کے خلاف سب سے بڑا ثبوت ہے۔ آپ اپنی سہیلیوں سمیت پھنس جائیں گی۔ آپ اس ثبوت کو کیوں اور کیسے مٹائیں گی؟ اس کے علم میں یہ بات ہے کہ میں اور عارف آپ کے فلیٹ پر آئے۔ اُس نے انٹرکام پر آپ سے بات کر کے ہمیں آپ کے پاس جانے کی اجازت دی تھی۔''

''او مائی گاڈ...... یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا......'' وہ حیرت اور خوف سے بولی۔

''اور بھی دو ایک باتیں ایسی ہیں جنہیں آپ کی کھوپڑی سوچنے سے قاصر ہے۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''آپ حسین ضرور ہیں، جتنی حسین ہیں اتنی ہی بیوقوف بھی ہیں۔ کھوپڑی میں مغز ہوتا تو ہرگز یہ حماقت نہ کرتیں۔ اب بھی وقت ہے مجھے جانے دیں اور اُس رقم کو بھول جائیں۔''

اسی وقت بیرونی دروازے پر آہٹ ہوئی۔ دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز سنائی دی۔ چند ثانیوں کے بعد اُس کی تینوں سہیلیاں کمرے میں داخل ہوئیں۔ اُن کے چہرے متغیر تھے۔ وہ غصے کی حالت میں تھیں۔

''کیا ہوا شازیہ......؟'' زاہدہ نے چونکتے ہوئے کہا۔ ''یہ تم لوگوں کے چہرے بجھے ہوئے کیوں ہیں؟''

''عارف کا کچھ پتہ نہیں چلا...... اُس کے مکان پر تالا پڑا ہوا تھا۔ پھر ہم اُس کے دفتر گئے۔ چپڑاسی نے بتایا کہ عارف کچھ دیر کے لئے آیا تھا، اُس کے ہاتھ میں بریف کیس تھا۔ وہ کچھ دیر اپنے کمرے میں بیٹھ کر چپڑاسی کو پانچ سو روپے کا نوٹ دے کر چلا گیا۔ شاید وہ دفتر سے نکالی ہوئی رقم دفتر میں رکھ کر باقی رقم لے کر کہیں روپوش ہو گیا ہے۔''

''بریف کیس میں کل بتیس لاکھ کی رقم تھی۔'' زاہدہ نے کہا۔ ''اُس میں دس لاکھ دفتر کی رقم تھی۔ گویا اُس نے بیس لاکھ روپے دفتر میں رکھ دیئے، لاکھ لاکھ روپے جو وہ پہلے نکال چکا تھا اور ہار گیا تھا ایک طرح سے اُس نے اپنا قرض اُتار دیا۔ اب اُس کے پاس بارہ لاکھ روپے ہیں جو ہمارے ہیں۔''

''وہ کہاں ہوگا......؟'' شازیہ نے تشویش سے کہا۔ ''یہ تو بہت برا ہوا۔''

''وہ اُس ہوٹل میں گیا ہے جہاں اس نے کمرہ لیا ہے۔'' زاہدہ نے جواب دیا۔ ''گویا اُس نے اپنے دوست کی رقم میں سے بیس لاکھ کی رقم خیانت کر لی...... یہ تو بہت برا ہوا کہ

اس نے بیس لاکھ روپے دفتر میں لے جا کر رکھ دیئے۔ اب صرف بارہ لاکھ روپے ہیں...... ہمیں پوری بتیس لاکھ کی رقم چاہئے۔''

''میرے دوست نے کوئی خیانت نہیں کی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''میں نے اپنے دوست کی ہاری ہوئی رقم جیت کر دینے کے لئے اس سے کہا کہ وہ دفتر سے دس لاکھ روپے نکال کر لائے، میں اس کی رقم جیت کر دے سکتا ہوں۔ سو میں نے جیت کر دے دیئے۔ بارہ لاکھ کی رقم میں سے ہم دونوں ففٹی ففٹی کر لیں گے۔ یہ رقم ہمارا حق اور ملکیت ہے۔''

''ہم اب اس سے بتیس لاکھ کیسے وصول کر سکتے ہیں؟ عارف تو بیس لاکھ کی رقم دفتر میں رکھ آیا ہے۔'' شازیہ نے کہا۔

''جس طرح اُس نے دفتر میں رقم رکھی ہے اسی طرح پھر وہ نکال بھی سکتا ہے۔'' زاہدہ نے کہا۔

''اُس شخص نے کس ہوٹل میں کمرہ لے رکھا ہے؟'' دوسری سہیلی نبیلہ نے کہا۔ ''ہمیں بتائیں تاکہ ہم وصول کر آئیں۔''

''ہوٹل جا کر اوّل تو رقم وصول کر کے لانا مشکل ہے۔ دوسرا یہ کہ وہاں صرف بارہ لاکھ کی رقم ہے...... ہمیں پورے بتیس لاکھ کی رقم چاہئے۔ ہمیں پوری رقم وصول کرنی ہے۔'' زاہدہ نے کہا۔

''لیکن اب ہم کیسے ساری رقم وصول کر سکیں گے؟'' شازیہ نے اپنا سابقہ سوال دہرایا۔

''چلو...... میں بتاتی ہوں......'' زاہدہ نے کہا۔ پھر اُس نے نازیہ نامی سہیلی کو بلا کر اُس کے ہاتھ میں پستول تھما کر کہا۔ ''تم اسے نشانے کی زد میں رکھو...... اگر اس نے اپنی جگہ سے حرکت کرنے کی کوشش کی تو بلا تامل اس کے پیر میں گولی مار دینا، اس پر بھروسہ نہیں کرنا...... یہ سانپ ہے۔ موقع پاتے ہی ڈس لے گا۔''

زاہدہ اپنی دونوں سہیلیوں کو لے کر مشورہ کرنے کمرے سے نکل گئی۔ نازیہ پستول لے کر میرے روبرو کھڑی ہو گئی۔ وہ چوکنا تھی اور اُس کی آنکھیں مجھ پر مرتکز تھیں۔ وہ چار قدم کے فاصلے پر تھی۔ اُس پر جست لگا کر دبوچنا مشکل تھا۔

''نازیہ جانی!'' میں نے اُس کی طرف محبت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم کتنی حسین ہو......؟''

''یوشٹ اپ!'' وہ چونک کر غرائی۔ ''مجھے بیوقوف بنانے کی ضرورت نہیں۔''

''تمہیں میں نہیں بلکہ زاہدہ بیوقوف بنا رہی ہے۔'' میں نے اُس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ''جب کسی شکار کو پھانس کر لاکھوں روپے جیتنے پر تمہیں صرف دس ہزار روپے دیتی ہے، باقی رقم خود ہڑپ کر لیتی ہے۔ کیا یہ ناانصافی اور زیادتی نہیں ہے؟ ظلم نہیں ہے؟ اس کے علاوہ نال بھی خود ہڑپ کر لیتی ہے۔''

''یہ تم سے کس نے کہا کہ وہ صرف دس ہزار روپے دیتی ہے؟'' وہ حیران ہو کر بولی۔

''یہ میں جانتا ہوں...... یہ میرا اندازہ ہے۔ اور میرا اندازہ کبھی غلط ثابت نہیں ہوا۔'' میں نے کہا۔

''نہیں...... وہ ہمیں بہت زیادہ کیش دیتی ہے۔ تمہیں کوئی اندازہ نہیں ہے۔ تم مجھے بھڑکا رہے ہو۔'' وہ بولی تو اُس کا لہجہ بے جان تھا۔ ''تم اس بہانے یہاں سے فرار ہو جانا چاہتے ہو۔ میں تمہاری چالاکی سمجھ رہی ہوں۔''

''اُس نے کبھی بھی دس ہزار کے اوپر دس روپے بھی نہیں دیئے...... تم جھوٹ بول رہی ہو۔ میں تمہیں ایک لاکھ روپے دینے کے لئے تیار ہوں اگر تم میری محبت قبول کر لو۔ اس پستول سمیت اپنے آپ کو میرے حوالے کر دو۔'' میں نے رومانی لہجے میں کہا۔

''اس وقت تمہارے پاس ایک لاکھ روپے کہاں سے آئے......؟ تمہارے پاس اس وقت دو تین سو روپے بھی نہیں ہوں گے۔ پہلے تم مجھے ایک لاکھ روپے دو...... پھر میں تمہاری بات مانوں گی۔'' اُس نے کہا۔

''ایک لاکھ کی رقم میرے پاس نہیں ہے بلکہ اس الماری میں ہے۔'' میں نے الماری کی طرف اشارہ کیا۔ ''زاہدہ کی الماری میں لاکھوں روپے موجود ہیں۔ وہ میرے ہوں گے۔ میں تمہیں اس میں سے ایک لاکھ روپے دُوں گا۔ بولو منظور ہے؟''

''یہ تو میں بھی جانتی ہوں کہ اس الماری میں لاکھوں روپے ہیں۔ لیکن اس کی چابیاں زاہدہ کے پاس ہوتی ہیں۔''

''میں جانتا ہوں کہ زاہدہ نے الماری کی چابیاں کہاں رکھی ہیں؟ چابیاں اسی کمرے میں موجود ہیں۔'' میں نے کہا۔

''یہ کوئی نہیں جانتا کہ زاہدہ الماری کی چابیاں کہاں رکھتی ہے، تم کیسے جانتے ہو؟'' وہ

تجسس سے بولی۔

''دوایک مرتبہ تم نے اور شازیہ نے زاہدہ کی موجودگی میں الماری کی چابیاں تلاش کی تھیں لیکن تمہارے ہاتھ نہیں لگیں۔''

''تم...... تم......'' اُس کی آواز حلق میں پھنس گئی۔ چہرہ فق ہو گیا اور آنکھیں پھیل گئیں۔ ''تم یہ بات کیسے جانتے ہو......؟ تمہیں کس نے بتایا......؟ یہ جھوٹ ہے...... غلط ہے۔ سراسر بہتان ہے۔''

''نہیں...... یہ جھوٹ نہیں بلکہ سو فیصد سچ ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اس لئے کہ تم دونوں نے ہمیشہ یہ سوچا کہ زاہدہ ایک سہیلی ہوتے ہوئے بھی ہمارا حق کیوں مارتی ہے۔ خود لاکھوں ہڑپ کر لیتی ہے جبکہ ہم بھی شکار پھانس کر لاتے ہیں۔ شکار پھانسنے کے لئے چارہ بھی بن جاتی ہیں...... اس کا صلہ صرف دس ہزار روپے......''

وہ کچھ کہنا چاہتی تھی کہ اسی اثنا میں زاہدہ اپنی دونوں سہیلیوں کے ساتھ اندر داخل ہوئی۔ اُن کے ہاتھوں میں چاقو اور رسیوں کے ٹکڑے تھے جو تقریباً پانچ سات گز لمبے ہوں گے۔ وہ میرے قریب آ کر کھڑی ہو گئیں۔

''تم جلدی سے اپنی قمیض اُتار دو......!'' زاہدہ نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

''تم سب کے سامنے کپڑے اُتارتے ہوئے شرم آ رہی ہے لہٰذا تم لوگ کمرے سے باہر چلے جاؤ۔'' میں نے شرماتے ہوئے کہا۔

''میں کپڑے اُتارنے کے لئے نہیں، بلکہ صرف قمیض اُتارنے کے لئے کہہ رہی ہوں۔'' زاہدہ نے تیزی سے کہا۔

''وہ کس لئے......؟'' میں نے انجان بن کر پوچھا۔ میں نے جان لیا تھا کہ ان کے ارادے کیا ہیں۔

''یہ تمہیں جلد ہی پتہ چل جائے گا......'' اُس نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ ''تم نے قمیض نہیں اُتاری تو ہم اسے پھاڑ دیں گی۔ تمہیں زخمی کر دیں گی۔ تم یہ چاقو نہیں دیکھ رہے ہو؟'' زاہدہ نے میری نظروں کے سامنے چاقو لہرایا۔

''کتنی عجیب بات ہے۔'' میں نے کہا۔ ''جب تین چار بدمعاش کسی لڑکی کو اغواء کرتے ہیں تو اس کے سارے کپڑے اُتار دیتے ہیں۔ عورتیں کسی مرد کو یرغمال بنا کر

صرف اُس کی قمیض اُتارتی ہیں۔ یہ عورتیں کس قدر نرم دل اور شرم و حیا کی پتلی ہوتی ہیں۔ لیکن اس میں شرم کی کیا بات ہے؟ میں نے صبح سویرے تمہیں شاید بےلباس دیکھا تھا۔''

''یو شٹ اپ!'' وہ دہاڑی۔ میں نے تمہیں بکواس کرنے نہیں، قمیض اُتارنے کے لئے کہا ہے۔''

''لیکن میں یہ بات صاف طور پر بتا دینا چاہتا ہوں کہ تم چاروں نے میری عزت پر حملہ کیا، جبر و زیادتی سے بےحرمتی کی تو میں حدود آرڈیننس کیس بنا دوں گا۔ تم سب کو کوڑے لگیں گے۔'' میں نے قمیض کے بٹن کھولتے ہوئے کہا۔

''تم ہمیں کیا سمجھتے ہو......؟'' زاہدہ نے غراتے ہوئے کہا۔ ''ہم ایسی عورتیں نہیں ہیں جیسی تم سمجھ رہے ہو۔ ہم کیا کرنا چاہتی ہیں، تمہیں ابھی معلوم ہو جاتا ہے۔ ہمیں تمہاری عزت سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔''

''تم سب کیا ہو......؟ کیسی ہو......؟ یہ میں بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''میں تمہارے بارے میں بہت کچھ جانتا ہوں مس زاہدہ!...... تم گزشتہ تین برسوں سے دولت کمانے کے لئے منصوبے بناتی چلی آ رہی ہو۔ تین برس پہلے تم ٹی وی اداکارہ تھیں۔ شوبزنس کی دنیا میں قدم رکھنے کے بعد تم نے اُونچے خواب دیکھنا شروع کر دیئے۔ تم نے صرف ایک برس ڈراموں میں کام کیا لیکن وہاں تمہیں وہ سب کچھ مل نہ سکا جو تم چاہتی تھیں۔ اور پھر تم حسن و شباب اور بےمثال سراپا کے باوجود کامیاب نہ ہو سکیں۔ تم نے ایک روز سوچا کہ یہ کیا دنیا ہے، شوبزنس کی دنیا بھی اندر سے کتنی کالی ہے۔ بستروں کی زینت بنو تو چانس ملتا ہے۔ اتنی دولت نہیں ملتی ہے جو ملنی چاہئے۔ تم ایک دفتر میں کام بھی کرتی تھیں۔ تم نے ٹی وی فنکاروں اور پروڈیوسروں کے ساتھ بیٹھ کر شراب نوشی اور قمار بازی بھی سیکھ لی تھی۔ تمہیں خیال آیا کہ کیوں نہ قمار بازی سے دولت کمائی جائے۔ تمہارا ایک قمار باز سے واسطہ پڑا۔ اُس نے تمہیں بہت کچھ سکھا دیا۔ پھر تم نے ایسی پانچ لڑکیوں کو اعتماد میں لے کر ایک گروہ بنا لیا جو شوبزنس کی ایسی تتلیاں تھیں جن کے دلوں میں دولت کے ارمان تھے۔ وہ شہرت کی بھوکی تھیں۔ اُن کے لئے دس ہزار روپے میں بھی بڑی کشش تھی۔ پہلے تم جس کمپنی میں ملازمت کر رہی تھیں وہاں کے کیشیئر سے تعلقات استوار کر کے تم نے اسے اپنے جال میں پھانسا۔ وہ چار لاکھ روپے ہار کر نوکری سے گیا اور جیل کی ہوا کھائی۔ پھر

تم نے عارف کے دفتر میں ملازمت کر لی، اُس سے دوستی کی۔ پھر اُس سے تعلقات قائم کئے۔ لیکن یہاں آ کر مات کھا گئیں۔ یہ بدنصیب لڑکیاں جن کے پاس شوبزنس کی دنیا کی وجہ سے کچھ نہیں رہا، تمہاری ساتھی بن گئیں...... انہیں دس دس ہزار دے کر ٹرخاتی رہیں، خود لاکھوں ہڑپ کرتی رہیں...... انہیں بیوقوف بناتی رہیں اور اب بھی بنا رہی ہو۔''

زاہدہ کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ لیکن اُس نے دوسرے لمحے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ پھر اُس نے نازیہ کو قہر آلود نظروں سے گھورا۔ ''تم نے اس سے میرے بارے میں کیا اُلٹی سیدھی بکواس کی ہے؟''

''قسم لے لیں باجی! جو میں نے اُس سے کچھ کہا ہو...... یہ شخص مجھے ایک لاکھ روپے کا لالچ دے رہا تھا کہ میں اسے پستول دے دُوں...... لیکن میں اس کے قریب نہیں آئی۔ یہ شخص بڑا کائیاں ہے۔''

''لیکن اسے میرے بارے میں کیسے اور کس سے معلوم ہوا......؟ عارف میرے بارے میں اتنا کچھ نہیں جانتا ہے۔'' وہ تنک کر بولی۔ ''میں نے اُسے کبھی اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ وہ میرے ماضی سے بالکل بھی واقف نہیں ہے۔''

''تمہارے چہرے پر جو کالی لکیریں ہیں وہ تمہاری زندگی اور ماضی کی ہیں۔'' میں نے کہا۔

زاہدہ کی ایک سہیلی سونیا تھی جو بعد میں اس کی دشمن بن گئی تھی۔ زاہدہ اس وقت اس کے بارے میں سوچنے لگی تھی کہ کہیں اس نے تو مجھے نہیں بتایا۔ میں نے زاہدہ کی طرف دیکھا۔

''تمہاری سہیلی نے مجھے بتایا تھا۔ اتفاق سے دو دن پہلے وہ میری تنہائی کی رفیقہ تھی۔''

''اُس کمینی سے تو میں بعد میں نمٹوں گی۔'' وہ چونک کر بولی۔ ''چلو...... تم جلدی سے قمیض اُتار دو!''

میں نے قمیض اُتار کر کرسی پر ڈال دی اور پھر پتلون کے بٹن کھولنے لگا۔ میں نے انڈرویئر پہنا ہوا تھا۔ وہ چیخی۔ ''یہ تم کیا کر رہے ہو......؟ میں نے تمہیں صرف قمیض اُتارنے کے لئے کہا ہے، پورے کپڑے اُتارنے کے لئے......''

لڑکیوں نے منہ پھیر لیا تھا۔ میں نے شوخی سے کہا۔ ''پورے کپڑے اُتارنے میں کیا حرج ہے؟''

''تم بہت بے شرم ہو......'' شازیہ نے غصے سے کہا۔ ''دیکھ نہیں رہے ہو...... ہم سب

لڑکیاں ہیں۔''

''آپ ستی ساوتری کیوں بن رہی ہیں؟'' میں نے کہا۔ ''کیا میں نہیں جانتا کہ تم مردوں کے سامنے بے حجاب ہو جاتی ہو...... تم میں سے ایک لڑکی بھی ایسی نہیں ہے جس نے اس دشت کی سیاحی نہ کی ہو۔''

''کیا ہم تمہیں طوائفیں نظر آ رہی ہیں جو تم ہم پر رکیک قسم کے الزام لگا رہے ہو......؟'' شازیہ نے ہذیانی لہجے میں کہا۔

''اس شوبزنس کی دنیا میں جو بھی لڑکی قدم رکھتی ہے وہ طوائف سے بھی بدتر ہو جاتی ہے۔'' میں نے پُرسکون لہجے میں کہا۔

''یوشٹ اپ......'' شازیہ کی آنکھیں شعلے برسانے لگیں۔ ''تم ہم شریف اور باعزت گھرانے کی باعزت لڑکیوں پر تہمت لگا رہے ہو...... ہم سب کنواری لڑکیاں ہیں، ہماری عزتیں محفوظ ہیں۔ کوئی یہ ثابت کر دے کہ ہماری آبرو لٹ چکی ہے تو ہم ایک کروڑ روپے دینے کے لئے تیار ہیں۔''

''ایک کروڑ کیا، تم ایک لاکھ روپے نہیں دے سکتی ہو۔'' میں زیرِ لب مسکرا دیا۔ ''ہر وہ اداکارہ جو طوائف ہوتی ہے، جس کی ماں بھی طوائف ہوتی ہے وہ بھی اپنے آپ کو باعصمت ظاہر کرتی ہے، اپنی پارسائی کا سرٹیفکیٹ دینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں تم سب کے بارے میں بتا سکتا ہوں کہ تم لوگوں کی زندگی میں آنے والے پہلے مرد کا کیا نام ہے؟ وہ کون تھا؟ کس دن، کس وقت اور کس لئے اپنا سب کچھ اُس شخص پر اپنی مرضی سے نچھاور کر دیا؟ پھر اس کے بعد کتنے لوگ آئے۔ بہتر ہے میری زبان نہ کھلواؤ......''

''تم نفسیاتی حربہ آزما رہے ہو...... تمہاری ذہنیت کا اندازہ ہو رہا ہے کہ تم کس قماش کے ہو۔'' زاہدہ برہمی سے بولی۔ ''تم ایک سیاہ کار اور گندی ذہنیت کے مالک ہو۔ اس لئے سب کو اپنی طرح سمجھ رہے ہو۔''

''تم اسے کچھ بھی کہہ لو......'' میں کہنے لگا۔ ''میں سب سے پہلے تمہارے بارے میں تاہوں۔ سولہ برس کی عمر میں تمہاری ماں کے ایک آشنا نے تمہیں شراب پلا کر تمہاری زت برباد کی۔ اُس کا نام شارق تھا۔ شازیہ ایک کمرشل اور ڈرامے کے لئے انٹرویو ینے کے لئے گئی تو دفتر کے ایک کمرے میں سرفراز نے سرفرازی کی شرط رکھی جو شازیہ

نے قبول کر لی۔ نازیہ کو ایک پروڈیوسر کاشف نے ہوٹل کے کمرے میں بلایا، اُس نے صاف طور پر نازیہ سے کہا کچھ پانے کے لئے کچھ کھونا بھی پڑتا ہے۔ نازیہ نے پانے کے لئے اپنے آپ کو کھونا منظور کر لیا۔ یہ جو اِرم صاحبہ ہیں، تیرہ برس کی عمر میں ایک ہزار روپے کی خاطر اپنے بوڑھے پڑوسی کی جھولی میں گر گئی۔ کیونکہ یہ ایک فرانس کا بنا ہوا میک اپ بکس خریدنا چاہتی تھی۔ پھر مرد آتے رہے۔ میں ان سب کے ناموں سے واقف ہوں...... کیا میری یہ باتیں غلط ہیں......؟''

وہ چاروں پتھر کی بت بن گئیں...... اُن پر جیسے کوئی بجلی سی آ گری ہو۔ وہ گنگ سی ہو کر مجھے دیکھ رہی تھیں۔ وہ دل میں حیران تھیں کہ مجھے یہ ساری باتیں کیونکر، کیسے اور کس ذریعے سے معلوم ہوئیں؟ یہ تو ان کے ایسے راز ہیں جو ان کے سوا کوئی نہیں جانتا...... نہ ہی انہوں نے کسی کو اعتماد میں لے کر بتایا۔ میں نے ان سب کو ایک دوسرے کے سامنے برہنہ کر دیا، ان کے راز افشاء کر دیئے۔

میں نے پتلون اور بنیان بھی اُتار کر پھینک دی۔ اب میرے بدن پر صرف ایک انڈرویئر تھا۔ زاہدہ نے یکلخت چونک کر کہا۔ ''چلو...... اسے جلدی سے باندھو...... یہ تو بڑا خطرناک اور چالاک شخص ہے۔''

پھر اُن تینوں نے مل کر مجھے بستر پر لٹایا اور پلنگ سے باندھ دیا۔ پھر زاہدہ نے ایک سگریٹ سلگا کر اُس کا ایک کش لیا، پھر وہ ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔ پھر اُس نے اُس نے استہزائی لہجے میں کہا۔ ''تم یہ بتاؤ کہ تم نے کس ہوٹل میں کمرہ لیا ہوا ہے......؟ میں وہاں ٹیلی فون کرتی ہوں۔ عارف سے کہو کہ وہ بتیس لاکھ کی رقم واپس لا کر دیدے۔''

''بالفرض محال میں یہ بات اُس سے نہ کہوں تو تم کیا کرو گی میری جان؟'' میں مسکرایا۔

''پھر تمہارے منہ پر ٹیپ چپکا کر تمہارا جسم داغنا شروع کر دوں گی۔'' وہ سنجیدگی سے بولی۔

''یہ تو جلتے سگریٹ کے داغ ہیں جو جسم پر ہوں گے، کسی دن بھر جائیں گے، مٹ جائیں گے...... لیکن تمہارے جسم پر جو داغ ہیں تم انہیں کیسے مٹاؤ گی......؟ تمہارا چہرہ، جسم اور دامن داغوں سے بھرا ہوا ہے۔''

''تم میرے داغوں کی فکر نہ کرو، اپنی خیر مناؤ...... یہ بتاؤ کہ تم ٹیلی فون پر عارف سے بات کر رہے ہو یا نہیں؟''

''تمہارا یہ مطالبہ ناجائز ہے۔ وہ رقم میری جیت کی ہے۔ اس پر تمہارا کوئی حق نہیں ہے۔ تم اسے بدمعاشی سے وصول کرنا چاہتی ہو۔ میں نے آج تک ایسی مثال کہیں نہیں یکھی......'' میں نے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''میرا صرف ایک سوال اور حکم ہے۔'' زاہدہ نے تنک کر کہا۔ ''مجھے وہ رقم چاہئے۔ رے بتیس لاکھ روپے...... وہ رقم منگوا کر دے رہے ہو یا نہیں...... جواب دو!''

''میری جان! تم اُس رقم کو بھول جاؤ...... وہ رقم کیا ہے، میں تمہیں امریکی ویزا لاؤں گا جو چاند پر پہنچنے سے زیادہ مشکل ہے۔ مجھ سے محبت اور لگاوٹ کی باتیں کرو۔ ہارا سراپا بڑا زبردست ہے۔''

''مجھے امریکی ویزا کی نہیں بلکہ رقم کی ضرورت ہے...... امریکی ویزا تم اپنے پاس کھو'' زاہدہ نے خشونت سے کہا۔

''ایک بات یاد رکھو زاہدہ!'' میں نے کرخت لہجے میں کہا۔ ''اگر تم نے میرے جسم کو اغا تو اچھا نہیں ہوگا۔''

''تم مجھے دھمکی دے رہے ہو......؟'' وہ زہرخند بولی۔ ''تم اس طرح سے کہہ رہے ہو یسے تم میرا کچھ بگاڑ لو گے۔''

''ہاں...... تم گھاٹے میں رہو گی...... لینے کے دینے پڑ جائیں گے...... اچھی طرح وچ لو!'' میں نے تیز لہجے میں کہا۔

''میرا بال تک بیکا نہیں ہوگا۔ کیونکہ تم میرے رحم و کرم اور قابو میں ہو، بے بس ہو۔'' ہ استہزائی لہجے میں بولی۔

''تم ساٹھ لاکھ کی رقم سے محروم ہو جاؤ گی جو تم نے اپنی الماری میں رکھی ہوئی ہے۔'' ل نے کہا۔

وہ بری طرح چونکی۔ اُس کی آنکھیں پھیل گئیں، پھر سنبھل کر بولی۔ ''میرے پاس اتنی ی رقم کہاں سے آئی؟''

''یہ وہ رقم ہے جو نال اور جوئے میں شکاریوں کو پھانس کر تم نے جمع کی ہوئی ہے اور بی ساتھیوں کو دس دس ہزار روپے دے کر ٹرخا دیا...... جبکہ اصولی طور پر ان سب کا برابر کا صہ ہوتا تھا۔'' میں نے کہا۔

"تم اپنی جان بچانے کے لئے میرے خلاف ان سب کو بھڑکا رہے ہو۔ یہ تمہاری ان باتوں میں نہیں آنے والی۔"

"تم یہ کہہ کر اپنا دامن نہیں بچا سکتی ہو۔ تم انہیں اور باقی دو لڑکیوں کو بھی دس دس لاکھ روپے فی کس دو۔" میں نے کہا۔ "پہلے ان کا حساب کرو، پھر میرا حساب کرنا...... اب تم یہ رقم ہڑپ نہیں کر سکتی ہو۔"

"میرے پاس ساٹھ لاکھ کیا، چھ لاکھ روپے بھی نہیں ہیں۔ تم کون ہوتے ہو ہمارے معاملات میں دخل دینے والے......؟"

"تم جھوٹ بول رہی ہو...... الماری کی خفیہ تجوری میں نہ صرف ساٹھ لاکھ روپے ہیں بلکہ سونے کے زیورات بھی ہیں۔ اس کے علاوہ دو لاکھ روپے کے انعامی بانڈ بھی ہیں۔ اس کے علاوہ محبت نامے بھی رکھے ہوئے ہیں۔"

"تم میری سہیلیوں کو بہکا رہے ہو...... اور پھر میں انہیں ان کا حصہ دے چکی ہوں۔ میرے پاس ساٹھ لاکھ نہیں ہیں۔"

"اچھا...... تم اپنی الماری کھول کر تجوری دکھاؤ! جھوٹ کیا ہے، سچ کیا ہے ابھی پتہ چل جاتا ہے۔"

"باجی...... یہ شخص ٹھیک کہہ رہا ہے۔ آپ نے ہم سب کو دس دس ہزار دے کر ٹرخایا جبکہ اصولی طور پر ہم بھی لاکھوں روپے کی حصہ دار اور حق دار ہیں۔ کیا یہ ناانصافی نہیں ہے کہ آپ لاکھوں لے لیں اور ہمیں دس ہزار دے کر ٹرخا دیں؟" شازیہ نے کہا۔

"اس موضوع پر بعد میں بات ہو گی...... پہلے اس سے بتیس لاکھ روپے تو وصول کر لوں۔" زاہدہ بپھر گئی۔

"پہلے ساٹھ لاکھ میں سے ہمیں دس دس لاکھ روپے کا حصہ دیا جائے۔" نازیہ نے کہا۔ "پھر بتیس لاکھ روپے وصول کر کے اس میں سے حصہ کیا جائے۔ اس شخص نے ہماری آنکھیں کھول دی ہیں۔ یہ تو فرشتہ ہے۔"

"اچھا...... یہ پستول مجھے دو۔" زاہدہ نے جلتا ہوا سگریٹ ایش ٹرے میں مسل کر نازیہ کی طرف ہاتھ بڑھایا جو اُس کے سامنے چند قدم پر کھڑی تھی۔ "میں تم لوگوں کو حصہ دُوں گی۔ لیکن اس شرط پر......"

"اسے پستول نہیں دینا......" ارم نے اپنی جگہ سے چیخ کر کہا۔ "ورنہ یہ ہمیں یہاں سے بھگا دے گی۔"

"تم لوگ میری بات کا یقین کرو کہ میرے پاس ساٹھ لاکھ نہیں چھ لاکھ روپے رکھے ہوئے ہیں۔" زاہدہ کا لہجہ کھوکھلا تھا۔

"اگر ایسی بات ہے تو الماری کھول کر دکھا دیں۔" نازیہ نے کہا۔ "الماری کی چابیاں لائیں۔ میں دیکھتی ہوں۔"

"تم کون ہوتی ہو میری الماری چیک کرنے والی؟" زاہدہ بگڑ گئی۔ "کیا تمہارے باپ کا مال ہے؟"

"باجی! زبان سنبھال کر بات کریں۔" نازیہ کو غصہ آ گیا۔ "آپ نے ہم سے کہا تھا کہ ہم سب پارٹنر ہوں گی۔ چونکہ اس آمدن میں کتنا حصہ ملے گا یہ ہم نے طے نہیں کیا تھا، آپ دس دس ہزار دے کر ہمیں ٹرخاتی رہیں، یہ کہتی رہیں کہ یہ اپارٹمنٹ خرید لوں، پھر نیا حساب کتاب کروں گی۔ اس کی ڈیکوریشن پر جو لاکھوں کا قرض لیا، وہ بھی ادا کرنا ہے۔ آپ کے پاس ساٹھ لاکھ روپے ہیں تو ہمیں حصہ دیں۔ ہمیں ابھی اور اسی وقت حصہ چاہئے۔"

"تم نے اس کی باتوں پر یقین کر لیا؟ تم یہ کیوں نہیں سمجھ رہی ہو کہ یہ ہمیں آپس میں اس لئے لڑا رہا ہے کہ یہاں سے فرار ہو جائے۔ یہ ایک نمبر چالاک اور فراڈی ہے۔ تم لوگ اس کی باتوں میں نہ آؤ۔" زاہدہ بولی۔

"میں تم لوگوں کو لڑا نہیں رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "اس کی الماری کی تلاشی لے لو۔ اس میں سے ساٹھ لاکھ روپے نہیں نکلے تو پھر میں بتیس لاکھ روپے منگوا کر دے دُوں گا۔ اگر اس میں سے ساٹھ لاکھ برآمد ہو گئے تو پھر مجھے یہاں سے جانے دیا جائے۔ اور میں اُس رقم میں سے ایک ہزار روپے بھی نہیں دُوں گا۔"

"منظور!......" اِرم بولی۔ "لیکن یہ بتائیں کہ آپ کو کس طرح اور کیسے پتہ چلا کہ ساٹھ لاکھ روپے الماری میں ہیں؟"

"کھیل ختم ہونے کے بعد یہ محترمہ مجھے اس بیڈ رُوم میں لے آئیں۔ پہلے دو گلاس شراب لائیں۔ ایک گلاس میں وہ نشے والی دوا ملا دی جو تم لوگ شکار کو شراب اور مشروبات میں ملا کر پلاتی ہو۔ تاکہ وہ نشے کی حالت میں ٹھیک سے نہ کھیل سکے اور ہارتا جائے۔ میں

نے گلاس بدل لئے۔ یہ مجھ پر مہربان ہوگئی۔ پھر اس نے نشے اور کیف کی حالت میں ساری باتیں بتا دیں۔''

''یہ جھوٹ ہے...... بکواس ہے...... نہ میں نے اسے ہاتھ لگایا اور نہ ہی اسے ہاتھ لگانے دیا۔'' زاہدہ ہیجانی لہجے میں بولی۔

''اگر یہ جھوٹ ہے تو الماری چیک کرا دیں......'' شازیہ بولی۔ ''چھ لاکھ روپے ہوئے تو ہم ایک پائی بھی نہیں لیں گی۔''

''ہاں...... ہاں......'' اِرم نے اس کی تائید کی۔

''تم سب میری نظروں کے سامنے سے دفع ہو جاؤ......'' زاہدہ مشتعل ہوگئی۔ ''میں تم لوگوں کی نوکر نہیں ہوں جو الماری چیک کراؤں......تم لوگ میری بات کا یقین کیوں نہیں کر رہی ہو......اس کی بات کا یقین کیوں کر رہی ہو؟''

''آپ ان تمام باتوں کو چھوڑیں اور الماری کی چابیاں دے دیں۔'' شازیہ نے سخت لہجے میں کہا۔

''میں چابیاں نہیں دُوں گی۔'' زاہدہ بھنا کر بولی۔ ''نہ یہ الماری چیک کراؤں گی۔''

''الماری کی چابیاں کچن میں دودھ کے پاؤڈر والے ڈبے میں رکھی ہوئی ہیں۔'' میں نے شازیہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

زاہدہ بھونچکی ہوگئی۔ اس سے پہلے کہ وہ اُٹھ کر کھڑی ہوتی نازیہ نے آگے بڑھ کر اُس کی کنپٹی پر پستول رکھ دی۔ ''آپ تشریف رکھیں...... ورنہ میں پستول کے دستے سے آپ کی کھوپڑی بجا دُوں گی۔'' وہ دھمکی آمیز لہجے میں بولی۔

شازیہ چند لمحوں میں الماری کی چابیاں لے آئی۔ پھر الماری کھولی۔ اُس میں جو تجوری تھی وہ بھی کھولی گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد ہزار ہزار کے نوٹوں کی گڈیاں میز پر سجی ہوئی تھیں۔ زاہدہ کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ اُس کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ سب کو گولی مار کر ہلاک کر دیتی۔ اُس نے ایک مرتبہ نازیہ سے پستول چھیننے کی کوشش بھی کی تھی، اُس کے دائیں طرف ارم اور بائیں طرف نازیہ کھڑی ہوئی تھی۔ وہ اُسے قابو میں کئے ہوئے تھیں۔

''اسے کرسی سے باندھ دو......'' میں نے مشورہ دیا۔ ''ورنہ تم لوگ آپس میں حصہ نہ کر سکو گی۔''

زاہدہ کو کرسی سے باندھ دیا گیا۔ تب میں نے کہا۔ ''یہ ساری رقم لے کر چلی جاؤ...... اس کمینی عورت کو ایک پائی بھی نہ دو۔ ستارہ اور ناظمہ کو بھی ایمانداری سے حصہ دے دینا۔ پھر یہاں بھولے سے بھی نہیں آنا...... کیونکہ یہ گاڑی چلنے والی نہیں ہے، اور پھر یہ تم لوگوں کا کچھ بگاڑ بھی نہیں سکتی ہے۔ اس سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

''آپ کا بہت بہت شکریہ کہ آپ نے ہمیں ہمارا حق دلا دیا۔'' شازیہ ممنونیت سے بولی۔ ''ہم نے آپ کے ساتھ جو بدتمیزی کی، اُس پر شرمندہ ہیں۔ آپ کچھ خیال نہ کریں۔ ہمیں معاف کر دیں۔''

''میری مشکیں تو کھول دو!'' میں نے کہا۔

اِرم نے میری طرف بڑھ کر چاقو سے رسیاں کاٹ دیں۔ میں نے بستر سے نکل کر کپڑے اُٹھاتے ہوئے کہا۔ ''آپ لوگ یہاں سے فوراً چلی جائیں...... کیونکہ ایک گھنٹے کے بعد ان کا وڈیرا دوست آنے والا ہے۔''

''کیا آپ ہمارے ساتھ نہیں چل رہے ہیں......؟'' شازیہ نے پوچھا۔

''نہیں...... میں یہاں تھوڑی دیر رُکوں گا تاکہ محبت بھری باتیں کر کے دل کے ارمان پورے کروں۔''

''تم سب کان کھول کر سن لو......'' زاہدہ ہذیانی لہجے میں بولی۔ ''یہاں سے تم ایک پائی بھی لے گئیں تو میں معہ سود وصول کروں گی...... ایک کو بھی نہیں بخشوں گی۔ انسپکٹر صاحب سے کہہ کر حوالات کی ہوا کھلا دُوں گی۔''

''لیکن آپ ہمارے خلاف بہت سوچ سمجھ کر کوئی قدم اُٹھائیں۔'' اِرم نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

''میں تمہیں ایسا پھنسواؤں گی کہ تم لوگوں کی ضمانت بھی نہ ہوگی...... اگر عزت اور شرافت سے زندگی گزارنا چاہتی ہو تو یہ رقم چھوڑ جاؤ...... یہ میری رقم ہے۔ میں اس کی مالک ہوں۔'' وہ کرسی پر کسمساتی ہوئی بولی۔

''جب گرفتاری عمل میں آئے گی تب ضمانت کی ضرورت پڑے گی......'' اِرم نے جواب دیا۔ ''عزت اور شرافت نہ آپ کے پاس ہے نہ ہمارے پاس...... لیکن ایک بات آپ بھول رہی ہیں۔''

''کون سی بات......؟'' وہ اُلجھ کر بولی۔

''جس طرح پہلے زمانے میں انسان کی جان کسی پرندے میں ہوتی تھی اسی طرح آپ کی جان بھی ہمارے قبضے میں ہے۔''

''تم کیا کہنا چاہتی ہو......؟'' وہ غصے سے بولی۔ ''پستول تمہارے ہاتھ میں ہے اس لئے دھمکی دے رہی ہو؟''

''پستول میرے ہاتھ میں نہیں، نازیہ کے ہاتھ میں ہے...... آپ کی جان اُس وڈیو فلم کیسٹ میں ہے جو میرے پاس ہے۔ اگر میں وہ کیسٹ پولیس کے کسی اعلیٰ افسر کو دے دُوں تو کیا تب بھی آپ اپنے آشنا انسپکٹر سے کہہ کر ہمیں حوالات میں بند کرا دیں گی؟''

زاہدہ کا چہرہ پیلا پڑ گیا، پھر سفید پڑتا چلا گیا۔ اُس کی آنکھوں سے خوف جھانکنے لگا۔ وہ اس طرح سے خاموش ہوگئی جیسے اُس کی قوتِ گویائی چھین لی گئی ہو۔ وہ مورتی کی طرح دکھائی دینے لگی۔

جب شازیہ میرے بریف کیس میں نوٹوں کی گڈیاں رکھنے لگی تو زاہدہ کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اُس کی آنکھوں میں نفرت اور غصے کی سرخی بھر گئی۔ اُس کی نظروں کے سامنے اُس کی ساری دولت لے جائی جا رہی تھی۔ وہ اس قدر بے بس سی تھی کہ کچھ کر نہیں سکتی تھی۔ اُس کے پاس کچھ کہنے کے لئے رہا بھی نہ تھا۔ وہ اسے اس کا حصہ دینے کی بجائے لے جا رہی تھیں۔ اسے اس کا حصہ نہیں دے رہی تھیں تو یہ ایک طرح سے غلط بھی نہ تھا۔ کیونکہ وہ اپنی سہیلیوں کو فریب دیتی چلی آئی تھی۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ تینوں چلی گئیں۔ اب اس بیڈ رُوم میں ہم دونوں کے سوا کوئی نہ تھا۔ وہ ایک ٹک مجھے دیکھے جا رہی تھی کہ میں اُس کے ساتھ کیا کرتا ہوں۔ اُس کے چہرے پر خوف کے سائے لرزاں تھے۔ میں بستر پر بیٹھ گیا۔ اُس کا رخ اپنی طرف کر لیا تا کہ اُس سے بات کرنے میں سہولت رہے۔

''خون کا بدلہ خون......'' میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ ''کیا خیال ہے میں تمہارا لباس پھاڑ کر پھینک دُوں اور تمہارے ریشم جیسم نرم و نازک بدن پر چرکے لگاؤں، جلتے سگریٹ سے اسے داغ دُوں؟''

''نہیں......'' اُس کی پھٹی پھٹی آنکھیں میرے چہرے پر مرکوز ہوگئیں۔ آواز حلق میں

پھنسنے لگی۔

''کیوں نہیں؟'' میں نے سگریٹ کا ایک لمبا سا کش لے کر دُھواں اُس کے چہرے پر چھوڑ دیا۔

''اس لئے کہ میں عورت ہوں......'' اُس نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔ ''عورت اتنا بڑا ظلم برداشت نہیں کر سکتی۔''

''گویا تم عورت ہونے کے ناطے رعایت چاہتی ہو...... لیکن تم ایک سفاک اور بے رحم عورت ہو۔ جرائم پیشہ بھی ہو۔ تمہیں عارف اور اُس کے بیوی بچوں پر بھی رحم نہیں آیا۔ تم نے اُس کی زندگی برباد کرنے اور گھر اُجاڑنے میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی تھی۔ اگر میری اُس سے اتفاقیہ ملاقات نہ ہوگئی ہوتی تو وہ خودکشی کر چکا ہوتا۔'' میں نے کہا۔

اُس نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ اُس کے پاس کہنے کے لئے تھا ہی کیا؟

''تم نے بہت بڑا جوا کھیلا...... لیکن تم بازی ہار گئیں...... تم نے جو بساط بچھائی تھی وہ تمہارے کسی کام نہ آئی، وہ اُلٹ گئی۔ ایک شکاری خود شکار بن گیا، اس کا نوالہ بن گیا...... دراصل تمہیں لالچ کا اندھا جنون لے ڈوبا...... کیا اس طرح کوئی کھیل کھیلتا ہے؟ اب تمہارے پاس رکھا کیا ہے؟ تمہیں لینے کے دینے پڑ گئے۔ تم نہ صرف بتیس لاکھ بلکہ اپنی رقم سے بھی محروم ہوگئیں...... اب تمہاری مثال ایک خالی برتن کی سی ہے۔ اب تمہاری سہیلیاں بھی ہاتھ سے گئیں۔''

''یہ سب کچھ تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔'' وہ بے جان لہجے میں بولی۔

''میری وجہ سے نہیں...... یہ تمہارے اپنے کرتوت ہیں جن کی تمہیں سزا مل رہی ہے۔ میں جا رہا ہوں۔ تمہیں معاف کر رہا ہوں۔ صرف اس لئے کہ تمہیں بہت بڑی سزا مل گئی۔ تم پوری روٹی کے چکر میں آدھی سے بھی گئیں۔''

اُس نے میری کسی بات کا جواب نہیں دیا، خاموشی سے سنتی رہی۔ لیکن اُس کے سینے میں سانس کا زیر و بم بتا رہا تھا کہ وہ اندر سے بری طرح تپ رہی ہے۔ اُس کے چہرے کی سرخی بڑھتی جا رہی تھی۔

چند ثانیوں کے بعد اُس نے کہا۔ ''تم نے میرے ساتھ جو کچھ کیا وہ اچھا نہیں کیا۔ میں تمہیں بخشوں گی نہیں۔''

''میں نے تمہارے ساتھ برا نہیں کیا بلکہ تم نے خود ہی اپنے ساتھ برا کیا ہے۔''

''کوئی اپنے ساتھ بھی برا کرتا ہے؟'' اُس نے خشمگیں نظروں سے مجھے گھورا۔

''شاید تم نے سنا نہیں...... سنا ہوتا تو شاید ایسی ذلیل اور گھٹیا حرکت نہیں کرتیں۔ لالچ بری بلا ہے۔ اس بلا نے تمہیں نگل لیا ہے۔ تم لالچ نہ کرتیں تو تمہاری مکر و فریب کی گاڑی چلتی رہتی۔'' میں نے کہا۔

''لیکن میں عارف کو بخشوں گی نہیں۔'' زاہدہ نے نفرت و حقارت سے کہا۔

''تم اُس کا بال تک بیکا نہیں کرسکتی ہو۔ کیونکہ اب تم ایک کٹی پتنگ ہو...... اس پنچھی کی طرح ہو جس کے پر کاٹ دیئے گئے۔ میں اِرم سے تمہاری ویڈیو فلم کی ایک کاپی خرید کر عارف کو دے دُوں گا تا کہ تم اُسے پریشان اور ہراساں نہ کرسکو...... تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ تم اپنی ملازمت سے استعفیٰ دے دو۔''

ویڈیو فلم کا نام سنتے ہی اُس کا چہرہ ہلدی کی طرح زرد ہوگیا۔ چند لمحوں کے بعد وہ بولی۔ ''کاش! میں نے اُس کمینی پر اعتماد نہ کیا ہوتا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ مجھے بلیک میل کرے گی...... لیکن وہ کیسٹ تمہیں نہیں دے گی۔''

''ایک لاکھ روپے کے عوض تو وہ فلم دیدے گی۔ کیوں؟'' میں نے کہا۔

○

میں ہوٹل پہنچا تو عارف میرا انتظار کر رہا تھا۔ اُس نے بتایا کہ وہ بیس لاکھ کی رقم دفتر میں رکھ کر چلا آیا ہے، اُس کے سر سے بہت بڑا بوجھ اُتر گیا ہے۔ اب اُس نے جوئے سے توبہ کر لی ہے، وہ اس کے قریب بھی نہیں پھٹکے گا۔ اسے بہت بڑی نصیحت مل گئی ہے۔ جو ذہنی سزا ملی وہ ناقابل بیان ہے۔

وہ کسی طرح بھی بارہ لاکھ کی رقم لینے کے لئے تیار نہیں تھا۔ اُس کے لئے اصل دولت یہ تھی کہ اُس نے کمپنی سے جو امانت لی تھی وہ لوٹا دی تھی، وہ سکون تھا جو اسے اس وقت نصیب ہوا تھا۔ دراصل مجھے بھی رقم کی ضرورت یا لالچ نہیں تھا۔ آخر ہم دونوں نے جیتی ہوئی رقم ففٹی ففٹی کر لی۔ پھر وہ چھ لاکھ کی رقم لے کر رخصت ہوگیا۔

○○○

اب چونکہ میرے پاس اس کے علاوہ مزید لاکھوں کی رقم تھی اس لئے میں نے ایک اعلیٰ قسم کے ہوٹل میں کمرہ لے لیا تا کہ جوئے میں جیتی ہوئی رقم سے اُس وقت تک سکون و آرام اور اطمینان سے ہوٹل میں رہوں جب تک مجھے میری منزل نہیں مل جاتی۔ میں پہلے جس ہوٹل میں تھا وہ ایک درمیانہ قسم کا تھا لیکن وہاں رقم چوری ہونے کا خطرہ تھا۔

میں سہ پہر کے وقت ہوٹل کے کمرے سے نکل کر سبزہ زار کی طرف جا رہا تھا تا کہ وہاں بیٹھ کر چائے پیوں اور سوچوں کہ اب مجھے اپنی تلاش کے لئے کیا تدبیر کرنا چاہئے؟ حیرت اور دُکھ کی بات تھی کہ اتنے بڑے شہر میں مجھے میرا ایک شناسا، دوست اور رشتہ دار نہیں ملا تھا۔ دوسری طرف میں مختلف قسم کے واقعات سے دوچار ہو رہا تھا۔ مجھے دو ایک بار یہ خیال بھی آیا کہ کہیں میں امریکہ اور یورپ کے کسی شہر میں تو نہیں رہتا تھا؟ شاید وہاں میرے دوست، رشتہ دار اور گھر والے موجود ہوں۔ لیکن میں امریکہ اور یورپ جا نہیں سکتا تھا۔ کیونکہ پاسپورٹ، شناختی کارڈ اور ویزا کا حصول ناممکن سا تھا۔

میں اپنے خیالوں میں مگن جا رہا تھا کہ کسی سے ٹکرا گیا۔ دیکھا تو ایک جواں سال اور حسین عورت تھی۔ اُس کی عمر چوبیس پچیس برس کی ہوگی۔ وہ مجھ سے ٹکرا کر لان میں گر چکی تھی۔ اُس کی ساڑھی کا پلو، پرس اور وہ خود بکھری پڑی تھی۔ میں نے اُسے فوراً ہی سہارا دے کر کھڑا کیا، پھر پرس اُٹھا کر اُس سے معذرت کی تو وہ بولی۔

''یہ میری غلطی تھی۔''

''غلطی ہم دونوں کی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''کیوں نہ میں اس کا جرمانہ چائے کی صورت میں ادا کردُوں؟''

''چلئے......!'' وہ ساڑھی کا پلو سینے اور شانے پر درست کرتی ہوئی شوخی سے بولی۔

پھر ہم دونوں ایک میز پر آ بیٹھے جو سوئمنگ پول کے قریب تھی۔ میں نے ویٹر کو چائے

اور سینڈ وچز کا آرڈر دیا اور اس سے کہا۔ ''میرا نام سالار ہے۔ میں اس ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہوں۔ اندرون ملک سے کراچی کی سیر کے لئے آیا ہوا ہوں۔''

''میرا نام مس ساجدہ ملک ہے۔'' وہ بولی۔ ''میں اپنی ایک رشتہ دار عورت خالدہ چودھری سے ملنے آئی تھی جو امریکہ سے آئی ہوئی ہیں۔ وہ اس وقت کسی کام سے گئی ہوئی ہیں اس لئے اُن سے ملاقات نہ ہوسکی۔''

''آپ کی اُن سے ملاقات نہ ہوسکی ایک طرح سے بہت اچھا ہی ہوا۔'' میں نے کہا۔

وہ چونک پڑی۔ اُس کے چہرے پر حیرت سی چھا گئی۔ ''وہ کس طرح؟''

''اس لئے کہ میری آپ سے ملاقات ہوگئی۔'' میں نے جواب دیا۔ ''یہ میرے لئے سرپرائز ہے۔''

''آپ اندرون ملک کے کس شہر سے آئے ہیں......؟ کیا پہلی بار کراچی آئے ہیں؟'' ساجدہ ملک نے پوچھا۔

''لاہور سے......'' میں نے جواب دیا۔ ''میں سال دو سال میں ایک مرتبہ کراچی آتا رہتا ہوں۔''

''بائی دی وے لاہور میں آپ کی کیا مصروفیت ہے؟ کیا آپ کسی فرم میں ملازمت کرتے ہیں؟''

''لاہور میں انارکلی میں میری ایک جیولری شاپ ہے۔ میں بزنس کے سلسلے میں کراچی آتا رہتا ہوں۔''

''آپ جیولری شاپ کے مالک ہیں......؟'' اُس کا حسین چہرہ دمک اُٹھا۔ ''تو آپ ہیرے جواہرات کے کاروبار کے سلسلے میں کراچی آتے رہتے ہوں گے۔''

''ظاہر ہے...... اس بار بھی میں اسی سلسلے میں آیا ہوں۔ قیمتی ہیروں کی تلاش میں ہوں۔'' میں نے کہا۔

''میں اگر آپ کو کوئی ہیرا دکھاؤں تو کیا آپ اسے خریدنا پسند فرمائیں گے؟'' اُس نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''کیوں نہیں......؟ میں ہیروں کا بیوپاری ہوں۔ خرید و فروخت میرا کام ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''کیا آپ کے پاس ہیرا ہے؟ اگر ہے تو مجھے خریدتے ہوئے بڑی خوشی ہو

گی۔ کیونکہ وہ ہیرا بھی آپ ہی کی طرح ہوگا۔''

ساجدہ کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ ''آپ تو مجھے شاعر بھی معلوم ہوتے ہیں...... ایک ہیرا میرے پاس ہے۔ وہ کچھ دنوں کے بعد آپ کو دکھاؤں گی۔ وہ ہیرا بنکاک سے خرید کر لایا ہوا ہے۔''

میں اور ساجدہ ہیرے جواہرات کے موضوع پر گفتگو کرنے لگے۔ ساجدہ نے ہیرے کا ذکر نہیں کیا ہوتا تو میں اُس کا ذہن نہیں پڑھتا۔ اب میں نے اُس کے ذہن کو اپنے ذہن میں منتقل کرلیا۔ ساجدہ اس لئے ہوٹل آئی تھی کہ وہ خالدہ چودھری کو کسی بہانے سے یہاں سے لے جائے، اُسے اغواء کر کے یرغمال بنا لے۔ اصل قصہ یہ تھا کہ خالدہ چودھری ایک امیر ترین عورت تھی۔ اُس کا بزنس نہ صرف پورے پاکستان بلکہ امریکہ اور یورپ میں بھی پھیلا ہوا تھا۔ وہ سال میں دو تین مرتبہ پاکستان اپنے کاروبار کے سلسلے میں آتی تھی۔ شکاگو میں بھی اُس کی ایک جیولری شاپ تھی۔ دراصل وہ ایک بے حد قیمتی اور نایاب ہیرے کے حصول کے لئے کراچی آئی ہوئی تھی۔ یہ ہیرا بنکاک میں دس لاکھ اسٹرلنگ پاؤنڈ میں نیلام ہوا تھا۔ لیکن یہ ہیرا جس نے خریدا تھا دوسرے دن ہی وہ اپنے فلیٹ میں بے ہوش پایا گیا اور وہ ہیرا چور لے اُڑے تھے۔ ایک خیال یہ تھا کہ وہ ہیرا بنکاک سے باہر لے جایا گیا تھا۔ وہ شاید کراچی لایا گیا ہے یا لایا جانے والا ہے۔

سلطان بین الاقوامی مافیا کا سرگرم کارکن تھا۔ وہ کراچی میں رہتا تھا۔ اُسے کسی نے یہ اطلاع دی تھی کہ وہ ہیرا خالدہ چودھری کے ہاتھ بیچ دیا گیا ہے یا بیچا جانے والا ہے۔ سلطان نے ساجدہ سے کہا کہ وہ کسی طرح خالدہ چودھری کو اس کے ہاں لے آئے تو وہ اسے ایک لاکھ روپے دے گا۔ ساجدہ لندن سے کراچی کسی کام سے آئی تھی۔ سلطان سے اس کی ملاقات دبئی میں ایک ہوٹل میں ہوئی تھی۔ پھر اُن کے درمیان دوستی ہوگئی۔ ساجدہ کے لئے ایک لاکھ روپے میں بڑی کشش تھی۔ لیکن جب اُسے ہیرے کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہ بہت قیمتی ہے تو اس کی نیت میں فتور آ گیا اور وہ اس کے خواب دیکھنے لگی۔

ساجدہ نے خالدہ چودھری کو یرغمال بنا کر اُس سے تاوان میں ہیرا یا ڈالر وصول کرنے کا منصوبہ بنایا ہوا تھا۔ ابھی تک اس بات کا کچھ پتہ نہیں چل سکا تھا کہ وہ ہیرا کس کے پاس ہے؟ خالدہ چودھری کے پاس یا اس شخص کے پاس ہی ہے جو کراچی لانے والا ہے؟ ساجدہ نے ایک جوان لڑکے کو اس منصوبے میں شریک کرلیا تھا۔ کیونکہ وہ اکیلی یہ کام

انجام نہیں دے سکتی تھی۔ اسے ایک مرد ساتھی کی ضرورت تھی۔ اُس نے لڑکے کو یہ لالچ دیا تھا کہ وہ تاوان میں سے اسے نصف حصہ دے گی جبکہ اس کے ارادے کچھ اور تھے۔ وہ تاوان کی ساری رقم یا ہیرے کی فروخت سے حاصل ہونے والی رقم اکیلی ہی ہڑپ کرنا چاہتی تھی۔ وہ دوسری طرف سلطان کو بھی بیوقوف بنا رہی تھی۔ وہ اُس سے بیس ہزار کی رقم پیشگی لے چکی تھی۔

ساجدہ جتنی حسین اور پرُکشش تھی اتنی ہی لالچی بھی تھی۔ وہ لندن کے آزادانہ ماحول میں پلی بڑھی تھی۔ اس وقت وہ میری نظروں کے سامنے ایک باحیا مشرقی لڑکی کی طرح بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ مجھے اپنا اسیر بنانے کے لئے لگاوٹ کی باتیں کئے جا رہی تھی۔ اُس نے مجھے بتایا کہ خالدہ چودھری نے ہوٹل میں جو سوٹ لیا ہوا ہے۔ اس کا نمبر 220 ہے۔

ساجدہ نے مجھے اپنا موبائل فون نمبر دیا۔ پھر وہ چلی گئی۔ اُس کے جانے کے تھوڑی دیر کے بعد ایک دراز قد اور سرخ وسفید شخص جو اپنی شکل وصورت اور وضع قطع سے جرائم پیشہ لگ رہا تھا میری قریبی میز پر دو ساتھیوں کے ساتھ براجمان ہو گیا۔ میں نے ذہن سے اُس کے بارے میں معلوم کر لیا تھا۔ اُس کا نام سلطان تھا۔ وہ ساجدہ کی تلاش میں آیا تھا اور ساجدہ کی مدد سے خالدہ چودھری کو اغوا کرنا چاہتا تھا۔ ساجدہ جا چکی تھی اور خالدہ چودھری ابھی ہوٹل نہیں پہنچی تھی۔

سلطان اور اُس کے آدمی تقریباً دو گھنٹے تک خالدہ چودھری کا انتظار کر کے چلے گئے تھے۔ میں بھی دوسری منزل پر ٹھہرا ہوا تھا۔ جب میں رات کا کھانا کھانے کے لئے کمرے سے نکلا تو ایک جوان اور خوبرو عورت کو دیکھا جو تیس برس کی ہو گی۔ وہ سوٹ نمبر 220 سے نکل کر لفٹ کی طرف آ رہی تھی۔ اُس نے کالی ساڑھی اور کالا بلاوز پہن رکھا تھا جس میں اُس کی ہیئت قیامت کی ہو گئی تھی۔ اُس کا گورا بدن، عریاں باہنیں، عریاں کمر اس طرح اس لباس میں چھلک رہی تھی جس طرح کانچ کی صراحی میں شراب چھلکتی ہے۔ اُس کا گداز اور شاداب بدن اس لباس میں عجب بہار دے رہا تھا۔

یہ عورت خالدہ چودھری تھی۔ وہ ڈنر کے لئے نیچے جا رہی تھی۔ ہم دونوں ایک ہی لفٹ میں سوار ہوئے۔ اس لفٹ میں ایک امریکی جوڑا بھی تھا۔ خالدہ چودھری میرے پاس کھڑی رات کی رانی کی طرح مہک رہی تھی۔ ہم دونوں نے سرسری طور پر ایک دوسرے کو دیکھا تھا۔ یہ ایک امیر ترین عورت تھی۔ اس کا باپ امریکہ میں تھا جس کے ساتھ وہ رہتی

تھی۔ اُس نے ابھی تک کسی وجہ سے شادی نہیں کی تھی۔

میں دانستہ کچھ دیر بعد ڈائننگ ہال میں داخل ہوا۔ وہ کونے کی میز پر بیٹھی مینو کارڈ دیکھ رہی تھی۔ جب ویٹر اُس سے آرڈر لے کر چلا گیا تو میں اُس کی میز پر جا پہنچا۔ اُس نے مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''کیا میں بیٹھ سکتا ہوں؟'' میں نے بڑی شائستگی سے کہا۔

''ضرور...... ضرور......'' وہ متذبذب ہو کر بولی۔ ''میں نے شاید آپ کو لفٹ میں دیکھا تھا۔''

''میں مس ساجدہ ملک کا دوست ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''میرا نام سالار ہے۔ آپ مس خالدہ چودھری ہیں؟''

''آئی سی......'' وہ رسیلی آواز میں بولی۔ ''وہ مجھ سے ملنے آئی تھی اور میرا انتظار کر کے چلی گئی۔''

''جی ہاں۔'' میں نے کہا۔ ''اس کے علاوہ ایک اور مہمان بھی آپ کا انتظار کر کے چلے گئے۔''

چونکہ اس وقت ویٹر آ گیا تھا اس لئے وہ اُس کی طرف متوجہ ہو گئی۔ اُسے اس مہمان کے بارے میں پوچھنے کا موقع نہ مل سکا۔ اُس نے ویٹر سے کہا کہ اس آرڈر کو ڈبل کر دے۔

ویٹر کے جانے کے بعد اُس نے پوچھا۔ ''دوسرے مہمان کون تھے؟ ریسپشن والوں نے کچھ نہیں بتایا۔''

''انہوں نے کسی وجہ سے آپ کے لئے کوئی پیغام نہیں چھوڑا۔'' میں نے جواب دیا۔

''کیا آپ انہیں جانتے ہیں......؟'' اُس نے تجسس سے پوچھا۔

''جی نہیں...... لیکن مجھے اُس مہمان کا نام معلوم ہے۔ میں نے اُسے آج ہی پہلی بار دیکھا ہے۔''

''کیا نام ہے اُس کا......؟ آپ کو اُس کا نام کیسے معلوم ہوا...... یہ بھی کیونکر پتہ چلا کہ وہ مجھ سے ملنے آیا تھا؟''

''لان میں وہ میرے برابر والی میز پر اپنے آدمیوں کے ساتھ بیٹھا باتیں کر رہا تھا۔ میں نے اُس کی زبان سے آپ کا نام سنا۔ اُس کے ایک ساتھی نے اُسے سلطان کہہ کر

مخاطب کیا تھا۔ وہ آپ سے کسی چیز کے سلسلے میں ملنا چاہتے تھے۔"

"سلطان......؟" خالدہ چودھری نے نام دہرایا۔ پھر بولی۔ "دو تین دن پہلے خدیجہ نے مجھے اس شخص کے بارے میں کہا تھا وہ کوئی بزنس مین ہے۔ کسی بزنس کے سلسلے میں مجھ سے بات کرنا چاہتا ہے۔"

"لیکن وہ بزنس مین کم، مشکوک زیادہ معلوم ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔ "آپ اُس سے سنبھل کر معاملات طے کریں۔ ہوشیار اور محتاط رہیں۔ کہیں وہ آپ کے لئے کسی پریشانی کا باعث نہ بن جائے۔"

"آپ کے اس پُرخلوص مشورے کا بہت بہت شکریہ۔" وہ ممنونیت سے بولی۔ "میں امریکہ سے آئی ہوئی ہوں۔ اپنے والد کے ساتھ مل کر دس برس سے وہاں کاروبار کر رہی ہوں۔ میں اس کے اسرار و رموز سے بخوبی واقف ہوں۔ مجھے کوئی کاروبار میں دھوکہ نہیں دے سکتا ہے اور نہ ہی بیوقوف بنا سکتا ہے۔ میں بہت پھونک پھونک کر قدم رکھتی ہوں۔"

"ذہانت تو آپ کے چہرے اور آنکھوں سے عیاں ہے۔" میں نے تعریفی لہجے میں کہا۔

"آپ نے مجھے اپنی مصروفیت کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔" وہ بولی۔

"لاہور میں میری ایک چھوٹی سی جیولری شاپ انار کلی میں ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "سال میں دو ایک مرتبہ میں ہیرے جواہرات کی خریداری کے لئے کراچی آتا رہتا ہوں۔ اس مرتبہ بھی اسی لئے آیا ہوں۔"

"واقعی...... آپ جوہری ہیں؟" وہ یکدم خوش ہوگئی۔ اُس کی بڑی بڑی حسین آنکھیں ہیرے کی طرح چمکنے لگیں۔ "گویا آپ میرے ہم پیشہ ہوئے۔ شکاگو میں میری بھی ایک بہت بڑی جیولری شاپ ہے۔"

وہ مجھ سے بہت جلد گھل مل گئی، بے تکلف سی ہوگئی۔ وہ ہیرے جواہرات کے موضوع پر مجھ سے تبادلہ خیالات کرنے لگی۔ پھر ہم کھانے سے فراغت پا کر اُٹھے۔ بہت دیر تک سبزہ زار پر چہل قدمی کرتے رہے۔ جب ہم لفٹ سے اُوپر آئے تو اُس نے مجھے تیکھی نظروں سے دیکھا۔ "کیوں نہ میرے کمرے میں چل کر کچھ پی لیں؟"

میں اُس کے سوٹ میں پہنچا۔ وہ مجھے صوفے پر بٹھا کر شراب کی بوتل اور گلاس لے آئی۔ اُس نے دو پیگ تیار کرتے ہوئے کہا۔ "اس ملک میں مسلمانوں کے لئے شراب پینے کی

ممانعت ہے۔ لیکن اگر آپ یورپ اور امریکہ چلے جائیں تو وہاں مسلمانوں کی ایک بڑی اکثریت شراب نوشی کرتی ہے۔ اس کے علاوہ کچھ عرب ریاستوں خصوصاً عراق میں تو شراب پانی کی طرح پی جاتی ہے۔ اس ملک میں لوگ اسے مشروب مغرب سمجھ کر پیتے ہیں۔"

"میں شراب کا عادی نہیں ہوں اور نہ ہی اس سے شوق کرتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"لیکن آپ میرا دل رکھنے کے لئے پی لیں۔" وہ نشیلی آواز میں بولی۔ "اصل بات یہ ہے کہ اکیلے پینے میں مزہ نہیں آتا ہے۔ ساجدہ مجھے کمپنی دیتی تھی۔ آج آپ مجھے کمپنی دیں تو بڑی نوازش ہوگی۔"

"میں اس لئے نہیں پیتا کہ مجھ پر نشہ فوراً چڑھ جاتا ہے۔ پھر میں بہک جاتا ہوں، بے قابو ہو جاتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "میں نہیں چاہتا کہ میرا پیر پھسل جائے۔"

"یہ بہت ہی ہلکی قسم کی شراب ہے۔ لہٰذا آپ بے خوف و خطر پی جائیں۔" وہ متبسم ہو کر بولی۔

میں نے اُس سے غلط نہیں کہا تھا لیکن اُس نے مجھ سے غلط بیانی کی تھی کہ شراب ہلکی قسم کی ہے۔ شراب بہت تیز تھی۔ نشہ چڑھتے ہی میں نے اُسے دبوچ لیا اور اُس کے چہرے پر جھک گیا۔ اس میں میرا کوئی قصور نہ تھا۔ یہ سب کیا دھرا شراب کا تھا جو میں نے اُسے ایک وحشی کی طرح بھنبھوڑ ڈالا۔ وہ خود بھی یہی چاہتی تھی۔ اسی لئے اُس نے مجھے ایسی شراب پلائی تھی کہ میں بے قابو ہو جاؤں اور اسے بے بس کر دوں۔ وہ امریکہ کے آزاد ماحول میں زندگی بسر کر رہی تھی۔ وہ جوان تھی۔ اُس نے شادی بھی اسی لئے نہیں کی تھی کہ تنہائی کے بہت سے رفیق ایک ایک کر کے بہت سارے ملتے رہیں گے۔ میرا ایسا پیر پھسلا کہ میں غلاظت کے دلدل میں دھنستا چلا گیا۔

اس طوفان کا زور ٹوٹنے کے بعد میرے دل و دماغ پر ایک عجیب سا نشہ چھایا ہوا تھا۔ ابھی نشہ پوری طرح اُترا نہیں تھا۔ میری پلکیں منوں بھاری ہو رہی تھیں، آنکھوں کے سامنے ایک دُھندسی چھا رہی تھی۔ میں نے برابر لیٹی ہوئی خالدہ چودھری کو دیکھا۔ اُس کے ہونٹوں پر ایک فاتحانہ تبسم رقصاں تھا۔ اُس کی آنکھوں میں ہزاروں قمقمے جل رہے تھے۔ پھر اُس نے میرے ہونٹوں میں اپنے رس بھرے ہونٹ پیوست کر دیئے۔ پھر دوسرا طوفان آ گیا...... میں پھر اس کی زد میں کسی تنکے کی طرح بہہ گیا۔

○

جب میں نیند سے بیدار ہوا تو بستر پر اکیلا دراز تھا۔ خالدہ چودھری نہیں تھی۔ بستر کی شکن آلود اور بے ترتیب چادر رات کا فسانہ سنا رہی تھی اور اُس کے رسیلے بدن کی مہک بستر میں بسی ہوئی تھی۔ میرا لباس فرش پر بکھرا ہوا تھا۔ میرے جسم پر چادر ڈال دی گئی تھی۔ خالدہ چودھری نہانے گئی ہوئی تھی۔ نشہ تو اُتر چکا تھا لیکن دل و دماغ پر ایک خمار سا چھایا ہوا تھا جو پرانی شراب کی مانند تھا۔ خالدہ چودھری بھی تو ایک پرانی شراب ہی تھی۔

وہ ملحقہ باتھ رُوم میں نہانے گئی ہوئی تھی۔ میں بستر پر تکیوں کے سہارے نیم دراز ہو کر سوچ رہا تھا کہ خالدہ چودھری نے میرے ساتھ جو کچھ کیا وہ اچھا نہیں کیا۔ جو نہیں ہونا تھا وہ ہوگیا تھا۔ اب میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ شیطان کو درمیان میں نہیں آنے دُوں گا۔ وہ ایک عیاش اور بدچلن عورت تھی۔ ایسی دولت مند عورتیں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ ان کے چہروں پر کالی لکیریں ہوتی ہیں۔

خالدہ چودھری کے پاس جو اثاثے اور دولت تھی وہ بے پناہ تھی۔ لیکن دولت کی پیاس بجھی نہیں تھی۔ وہ بے انتہا دولت کما کر کیا کرے گی؟ نہ اس کے بچے ہیں اور نہ شوہر ہے۔ صرف ایک باپ ہے۔ دولت قبر میں لے جانے سے تو رہی...... وہ بھی اس ہیرے کے چکر میں آئی ہوئی تھی...... دولت کی جتنی ہوس دولت مندوں کو ہوتی ہے، عام آدمی کو نہیں ہوتی۔

سوچتے سوچتے چالیس منٹ گزر گئے۔ خالدہ چودھری باتھ رُوم سے باہر نہیں آئی تو مجھے فکر اور تشویش ہونے لگی۔ میں نے بستر سے نکل کر باتھ رُوم میں جھانکا، وہ خالی پڑا تھا۔ میں نے اُسے کمرے سے نکل کر نشست گاہ میں دیکھا، وہ وہاں بھی نہیں تھی۔ پھر میں نے بیڈرُوم میں آکر کپڑے پہنے، گھڑی میں وقت دیکھا، دن کے بارہ بج کر بیس منٹ ہو رہے تھے۔ کہیں وہ ناشتہ کرنے تو نہیں چلی گئی؟ یا پھر ممکن ہے اس سے ملنے کوئی مہمان آیا ہو اور وہ نیچے چلی گئی ہو۔ میں نے سوٹ کا دروازہ کھولا۔ اُس پر ایک کارڈ جھول رہا تھا۔ مداخلت نہ کیجئے...... وہ شاید اس لئے لگا کر چلی گئی تھی کہ ہوٹل کا عملہ مجھے تنگ نہ کرے اور میں مزے سے سوتا رہوں۔

پھر میں نے بڑے سکون واطمینان سے غسل کیا۔ جب میں کمرے میں آیا تو ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے ریسیور اُٹھالیا۔ دوسری طرف ایک مردانہ بھاری آواز نے تمسخر سے

پوچھا۔ ''دُلہا میاں بیدار ہوگئے......؟ نہا دھو کر تیار ہو لئے......؟''

میں نے آواز پہچان لی۔ سلطان کی آواز تھی۔ میں نے کہا۔ ''تمہیں کس سے بات کرنی ہے؟''

''تم سے......'' اُس نے کہا۔ ''تمہاری دُلہن خالدہ چودھری ہماری مہمان ہیں۔''

''تو میں کیا کروں......؟'' میری زبان سے غیرارادی طور پر نکل گیا۔

''کیا تم اپنی دُلہن کو رہائی نہیں دلانا چاہتے؟ کیسے دُلہا ہو یار!'' اُس نے استہزائیہ انداز میں کہا۔

''تم نے کس لئے اسے اغوا کیا......؟'' میں نے دریافت کیا۔

''اس لئے کہ اس کے پاس جو ہیرا ہے وہ ہمیں تحفے میں دے دیا جائے۔''

''مجھے نہیں معلوم تم کس ہیرے کی بات کررہے ہو۔''

''میں اُس ہیرے کی بات کررہا ہوں جو بنکاک سے کراچی لایا گیا ہے۔''

''میں صرف اس ہیرے کے بارے میں جانتا ہوں جو ساری رات بستر میں جگمگاتا رہا...... میری مس خالدہ چودھری سے ہوٹل میں شام کے وقت ملاقات ہوئی۔ پھر وہ مجھے اپنے سوٹ میں لے آئی۔ پھر اس نے جو شراب پلائی اس نے اپنا کام دکھایا۔ صبح بیدار ہوا تو یہ ہیرا غائب تھا۔ میں کسی اور ہیرے کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔'' میں نے رُک رُک کر کہا۔

''تم نے جو کچھ بتایا اس نے خالدہ چودھری کی باتوں کی تصدیق کردی...... لیکن یہ بات یاد رکھو...... ان محترمہ کے بارے میں ہوٹل کی انتظامیہ یا پولیس کو کوئی اطلاع دینے کی ضرورت نہیں...... اب تم یہ حجلہ عروسی چھوڑ کر اپنے کمرے میں جاؤ۔''

اُس نے اتنا کہہ کر گفتگو کا سلسلہ منقطع کردیا۔ میں نے بھی ریسیور رکھ دیا اور سوٹ سے نکل گیا۔

میں اپنے کمرے میں داخل ہوکر کرسی پر بیٹھ گیا۔ خالدہ چودھری کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ دروازے پر کسی نے بھونڈے پن سے دستک دی۔ میں نے دروازہ کھولا۔ دروازہ کھلتے ہی ساجدہ مجھے ایک طرف دھکا دیتی ہوئی کمرے میں گھس آئی۔ اُس نے دروازہ بند کرکے چٹخنی لگائی اور دروازے سے لگ کر لمبی لمبی سانسیں لینے لگی۔ اُس کے سینے میں سانسوں کا تلاطم ہچکولے کھا رہا تھا۔ اُس کے چہرے سے وحشت ٹپک رہی تھی اور

آنکھوں سے خوف و ہراس جھانک رہا تھا۔

میں نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر اُسے بستر پر بٹھایا، ایک گلاس پانی پلایا تب جا کر اُس کی حالت سنبھلی۔ میں نے پوچھا۔

''کیا ہوا مس ساجدہ ملک..؟ آپ اس قدر پریشان اور ہراساں کیوں ہو رہی ہیں؟''

''سلطان کے دو آدمی مجھے اغوا کر کے لے جانا چاہتے ہیں......'' اُس نے جواب دیا۔

''وہ کس لئے؟'' میں نے سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھا۔

''اس لئے کہ اس کا خیال ہے کہ وہ ہیرا میرے پاس پہنچ گیا ہے۔''

''کیا یہ سچ ہے؟'' میں نے دریافت کیا۔

''ہاں......کسی حد تک سچ ہے۔'' اُس نے جواب دیا۔

''کسی حد تک سچ سے تمہاری کیا مراد ہے؟'' میں نے پوچھا۔ ''سچ سچ بتاؤ کہ اصل بات کیا ہے؟''

''میں تمہیں یہاں نہیں بتا سکتی۔ کیونکہ سلطان کے آدمی میرے تعاقب میں ہیں۔ وہ میری تلاش میں یہاں آ سکتے ہیں۔'' اُس نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔ ''میں یہاں اب ایک لمحے کے لئے بھی رُکنا نہیں چاہتی۔''

''سلطان کے آدمیوں کو اس بات کا علم کیسے ہو سکتا ہے کہ تم اس وقت میرے کمرے میں موجود ہو؟'' میں نے سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھا۔

''کل اُن کے علم میں یہ بات آ گئی تھی کہ میری تم سے ملاقات ہوئی تھی اور ہم دونوں کافی دیر تک سبزہ زار پر بیٹھے باتیں کرتے رہے تھے۔ میں خالدہ چودھری سے ملنے آئی تھی۔ وہ نہ ملی تو تمہارے ساتھ بیٹھ کر گپ شپ کرتی رہی۔''

''آخر ان بدمعاشوں کو ہماری اس ملاقات کا علم کیونکر ہو گیا؟ کس نے بتایا ہو گا؟'' میں نے پوچھا۔

''اس ہوٹل کے ملازمین میں سے ایک ملازم سلطان کا خریدا ہوا ہے۔ وہ اُسے پل پل کی خبر دیتا رہتا ہے۔'' ساجدہ نے جواب دیا۔ ''ہو سکتا ہے کہ اُس نے مجھے دیکھ لیا ہو۔ اُس نے سلطان کو میرے بارے میں اطلاع کر دی ہو۔''

''کیا تم یہ چاہتی ہو کہ ہم یہاں سے چلیں؟'' میں نے اُس کی آنکھوں میں جھانکتے

ہوئے پوچھا۔

''ہاں......'' اُس نے سر ہلایا۔ ''مجھے تم سے بہت ساری ضروری باتیں کرنی ہیں۔ بس اب تم چل پڑو۔''

''تم نے خالدہ چودھری سے کل شام رابطہ کیا تھا......؟'' میں نے پوچھا۔

''کل میں نے اُسے فون کیا تھا اور یہاں آنے سے کچھ دیر پہلے بھی...... وہ کل سے غائب ہے۔ کیا تمہاری اُس سے ملاقات ہوئی تھی؟''

''ہاں ہوئی تھی......'' میں نے کپڑے بدلتے ہوئے اُسے بتایا۔ ''ہم نے رات ایک ساتھ ڈنر لیا۔ تم سے کیا چھپانا......رات میری اُس کے سوٹ میں گزری۔ صبح میں بیدار ہوا تو وہ سوٹ میں نہیں تھی۔''

''کیا......؟'' وہ اُچھل پڑی۔ ''وہ بتا کر نہیں گئی کہ کہاں گئی؟ کیا وہ ابھی تک نہیں لوٹی ہے؟''

''نہیں......وہ مجھے بتا کر نہیں گئی۔ لیکن مجھے معلوم ہے کہ وہ کہاں گئی ہے۔ چلو! میں تمہیں یہاں سے نکل کر بتاتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''اب تم مجھے اپنے ساتھ کہاں لے جا رہی ہو؟ کیا وہ محفوظ جگہ ہے؟''

''میں تمہیں اپنے فلیٹ پر لے جا رہی ہوں۔ اس فلیٹ کے بارے میں، میں نے کسی کو نہیں بتایا۔ میں نے اسے کرائے پر لیا ہوا ہے۔''

پھر میں ساجدہ کے ہمراہ ہوٹل سے باہر آیا۔ اُس نے اپنی گاڑی پارکنگ لاٹ میں کھڑی کی ہوئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد اُس کی گاڑی بڑی تیز رفتاری سے کلفٹن کی طرف جا رہی تھی۔ میں نے عقبی آئینے میں اچھی طرح سے دیکھ کر اطمینان کر لیا تھا کہ کوئی تعاقب میں تو نہیں ہے۔ اُس نے ایک لگژری فلیٹ کرائے پر لیا ہوا تھا جو نہایت آراستہ و پیراستہ تھا۔

میں نے اُس سے پوچھا۔ ''مجھے تم پہلے یہ بتاؤ کہ سلطان کے آدمی تمہاری تلاش اور تعاقب میں کس لئے ہیں؟''

''اس لئے کہ وہ ہیرا حاصل کر سکیں جو بنکاک سے لایا گیا ہے۔ جو آدمی ہیرا لے کر آیا ہوا ہے اُسے میں جانتی ہوں۔ وہ ہیرا بہت ہی سستا بیچنا چاہتا ہے۔ جبکہ میں وہ ہیرا کسی اور کے ہاتھ بیچنا چاہتی ہوں۔ سلطان اور خالدہ چودھری کے ہاتھ بیچنے سے مجھے کچھ

حاصل نہ ہوگا۔ وہ صرف ایک لاکھ روپے دیں گے۔'' اُس نے کہا۔ ''میرے اس ارادے کی نجانے سلطان کو کیسے خبر ہوگئی اس لئے وہ مجھے اغواء کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔''

''کیا یہ بات سچ ہے کہ سلطان نے تمہیں پچیس ہزار کی رقم پیشگی اس لئے دی کہ ہیرے کو لانے والے کی شناخت کراؤ گی یا رابطہ کرا دو گی......؟ اگر یہ بات سچ ہے تو تم اس شخص کو ہیرا سلطان کے ہاتھ بیچنے کے لئے کیوں نہیں لے جانا چاہتی ہو؟ جبکہ تم پچیس ہزار کی رقم پیشگی لے چکی ہو۔''

''تمہیں یہ سب کچھ کس نے بتایا......؟'' اُس نے ششدر ہو کر میری شکل دیکھی۔

''سلطان نے......'' میں نے جھوٹ بولا۔ ''میں اُس سے کیسے کہتا کہ میں یہ سب کچھ اس کے ذہن سے معلوم کر رہا ہوں۔

''سلطان سے......؟'' اُس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ وہ سراسیمگی سے بولی۔ ''یہ بات سلطان نے تم سے کیوں کہی......؟ تمہارا اُس سے کیا تعلق ہے......؟ تمہاری اُس سے ملاقات کہاں اور کیونکر ہوئی؟''

''سلطان کا صبح ٹیلی فون آیا تھا۔'' میں اُسے بتانے لگا۔ ''میں اور خالدہ چودھری جب ڈنر سے فارغ ہوئے تو اُس نے مجھے سوٹ میں چل کر کچھ پینے کی دعوت دی۔ میں انکار نہ کر سکا۔ اُس نے مجھے ایسی تیز نشے کی شراب پلائی کہ میرا پیر پھسل گیا۔ اُس نے دانستہ یہ حرکت کی تھی مجھے نہیں معلوم تھا کہ خوبصورت اور جوان مرد اُس کی کمزوری ہیں۔ پھر رات بھر میری اُس سے نہ صرف محبت بھری باتیں بلکہ ہیرے کے موضوع پر بھی باتیں ہوتی رہیں۔ اُس نے بتایا کہ اس سے ہیرے والا شخص رابطہ کرنے والا تھا لیکن وہ اب تک رابطہ نہ کر سکا۔ تم سلطان کے لئے ہیرا خریدنے میں دلچسپی رکھتی ہو اور اس ہیرے والے کا کھوج لگا رہی ہو۔ سلطان نے تمہیں ایک لاکھ روپے کمیشن دینے کا وعدہ کیا ہے۔ جب میں صبح بیدار ہوا تو خالدہ چودھری بستر پر نہیں تھی۔ میں سمجھا نہا رہی ہوگی۔ کچھ دیر بعد شک ہوا تو میں نے غسل خانے میں جھانکا، وہ وہاں موجود نہیں تھی۔ کچھ دیر بعد سلطان کا ٹیلی فون آیا۔ اُس نے بتایا کہ خالدہ چودھری اس کی مہمان ہے یعنی اسے اغواء کر لیا گیا ہے۔ اب وہ سلطان کے ہاں یرغمال بنی ہوئی ہے۔''

سلطان نے خالدہ چودھری کو اغواء کر لیا......؟'' وہ اُچھل پڑی۔ ''وہ کس لئے؟''

''یہ تو میں نہیں بتا سکتا۔ نہ مجھے معلوم ہے اور نہ ہی سلطان نے بتایا۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اُس سے تاوان وصول کرنے کے لئے اغواء کیا ہوگا۔ وہ چونکہ ہیرے کی خریداری کے لئے آئی ہوئی ہے اس لئے بہت بڑی رقم لائی ہوگی۔ سلطان کے منہ میں پانی بھر آیا ہو گا یا پھر اُسے اس بات کا شک ہو گیا ہوگا کہ خالدہ نے وہ ہیرا خرید لیا ہے۔''

''یہ تو بہت برا ہوا۔ سلطان نے میرا سارا منصوبہ چوپٹ کر دیا۔'' وہ بے دھیانی میں بولی۔

''کیا تمہارا ارادہ اُسے اغواء کر کے اُس سے مال بٹورنے کا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

وہ اُچھل پڑی اور اُس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ وہ دل میں بڑی حیران ہو رہی تھی کہ مجھے اس بات کی کیسے خبر ہوگئی؟ اُس نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ ''یہ تم سے کس نے کہہ دیا کہ میرا ارادہ اُسے اغوا کرنے کا تھا؟''

''ابھی تو تم نے یہ بات کہی ہے کہ...... یہ تو بہت برا ہوا۔ سلطان نے میرا سارا منصوبہ چوپٹ کر دیا۔'' میں نے کہا۔ ''کیا اس سے یہ بات ظاہر نہیں ہوتی ہے کہ تمہارے ارادے بھی نیک نہیں تھے۔ مگر سلطان سبقت لے گیا۔''

''میرا منصوبہ یہ تھا کہ میں وہ ہیرا خالدہ چودھری کے ہاتھ بیچوں۔ وہ سلطان کے مقابلے میں اس کی اچھی قیمت دے گی۔ سلطان صرف ایک لاکھ روپے دے گا۔ اس ایک لاکھ کی رقم سے کیا ہوتا ہے۔'' اُس نے بات بنائی۔

''اب خالدہ چودھری بھی تمہارے ہاتھ سے گئی اور سلطان بھی تمہاری تلاش میں ہے۔'' میں نے کہا۔

''مجھے اب ان باتوں کی کوئی فکر، ڈر اور پرواہ نہیں ہے۔'' وہ بولی۔ ''یہ بتاؤ کہ تم وہ ہیرا مجھ سے خریدنا پسند کرو گے؟ میری مراد میری معرفت...... تاکہ مجھے بھی دو پیسے مل جائیں۔''

''اس قدر قیمتی ہیرا خریدنا میرے بس کی بات نہیں ہے۔ وہ شاید کوہ نور ہیرا ہے۔ وہ دس لاکھ اسٹرلنگ پاؤنڈ کا نیلام ہوا اور پھر اس قدر مہنگے ہیرے یہاں کون خریدے گا؟'' میں نے کہا۔

''کیونکہ وہ ہیرا چوری کیا ہوا ہے اس لئے کوڑیوں کے مول بکے گا۔ چوری کا مال اسی طرح بہت کم قیمت پر فروخت ہوتا ہے۔ تم اسے لندن لے جا کر فروخت کر دینا۔ وہاں

تمہیں اس کی قیمت اسٹرلنگ پاؤنڈ میں ملے گی۔''

''آخر کتنی کم قیمت پر ملے گا؟'' میں نے کہا۔ ''تم اس کی قیمت بتاؤ تو میں سوچوں گا۔''

''پندرہ سے بیس لاکھ کے درمیان......'' اُس نے بتایا۔ ''تم مجھے دو لاکھ روپے کمیشن دو گے۔''

''تم جانتی ہو دس لاکھ اسٹرلنگ پاؤنڈ کی رقم کتنی بنتی ہے؟'' میں نے کہا۔

''ہاں...... میں جانتی ہوں۔ لیکن وہ اُن کے لئے دس لاکھ ہی ہیں۔ جبکہ ہماری کرنسی کے لحاظ سے وہ بہت بڑی رقم ہے۔''

''جو شخص یہاں چوری کا مال لا کر فروخت کرنا چاہتا ہے کیا وہ پرلے درجے کا بیوقوف ہے؟'' میں نے کہا۔

''ہیرا یہاں لا کر فروخت کرنے میں بیوقوفی کی کیا بات ہے؟'' ساجدہ ملک حیرت سے بولی۔

''بیوقوفی نہیں تو اور کیا ہے...... کیونکہ اسے کہیں بھی بہت اچھی قیمت مل سکتی ہے۔ وہ اسے یورپ لے جا کر فروخت کر سکتا ہے۔ پاکستان یا کسی بھی ایشیائی کرنسی کی یورپی کرنسی کے مقابلے میں قیمت ہی کیا ہے؟'' میں نے کہا۔

''میں اس کے بارے میں کیا کہہ سکتی ہوں؟ مجھے تو آم کھانے سے مطلب ہے، پیڑ گننے سے نہیں۔'' ساجدہ ملک نے جواب دیا۔

''کچھ سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے۔ میں یوں بھی چوری کا مال نہیں خریدتا۔'' میں نے کہا۔

''تم چوری کا مال نہیں خریدتے لیکن دل تو چرا لیتے ہو......'' اُس نے میرے پاس آ کر مجھے تیکھی نظروں سے دیکھا۔

''تم مجھے پستی میں گرانے کی کوشش مت کرو۔ میں ایسا آدمی نہیں ہوں جیسا تم سمجھ رہی ہو۔''

''میں یہ چاہتی ہوں کہ تم اُس شخص سے وہ ہیرا خرید کر خالدہ چودھری کے ہاتھ بیچ دو۔ اُس میں جو منافع ہو گا وہ ہم ففٹی ففٹی کر لیں گے۔ خالدہ چودھری چوری کا مال خریدتی رہتی ہے۔ اس طرح چوری کا مال اُس کے پاس رہے گا۔''

''لیکن خالدہ چودھری تو سلطان کی قید میں ہے۔ اب ہیرا اُس کے ہاتھ کیسے بیچا جا سکتا ہے؟'' میں نے کہا۔ ''میرا مشورہ تو یہ ہے کہ تم پوری روٹی کے چکر میں مت پڑو۔ آدھی روٹی بھی بہت ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ پوری روٹی کے چکر میں آدمی سے بھی جاؤ۔ تم سیدھے سیدھے یہ ہیرا سلطان کے ہاتھ فروخت کر دو اور اپنی خیر مناؤ۔''

''میں سلطان کے ہاتھ کسی قیمت پر اس ہیرے کو فروخت نہیں کروں گی۔ تم نہیں خرید رہے ہو تو پھر میں خالدہ چودھری کو یہ ہیرا دلا دوں گی...... وہ مجھے دو لاکھ روپے بطور کمیشن دے گی۔'' ساجدہ ملک نے کہا۔

''میں یہ ہیرا اس لئے بھی خرید نہیں سکتا کہ میرے پاس چار پانچ لاکھ سے زیادہ رقم نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''پہلے تم خالدہ چودھری کی رہائی کا سوچو! یا پھر اُس کی رہائی کا انتظار کرو۔ پھر تم اُس سے سودا کر لینا۔''

''اگر سلطان نے اُس کی ساری رقم تاوان میں وصول کر لی تو پھر وہ ہیرا کیسے خرید سکے گی؟'' وہ فکرمندی سے بولی۔

''تم سلطان کا ٹھکانہ جانتی ہو......؟ کیا تم یہ بھی جانتی ہو کہ سلطان نے اسے کہاں یرغمال بنا کر رکھا ہو گا؟''

''ہاں...... میں جانتی ہوں۔ لیکن یقین سے نہیں کہہ سکتی کہ خالدہ چودھری اُس کی کے ڈی اے سکیم نمبر ایک والی کوٹھی میں ہو گی۔ ہو بھی سکتی ہے۔ کیونکہ وہ چار ہزار گز کی کوٹھی ہے۔'' ساجدہ ملک نے بتایا۔

''تم پولیس میں اس کے اغوا کی رپورٹ درج کرا دو اور سلطان کے خلاف ایف آئی آر کٹوا......'' میں نے مشورہ دیا۔

''مجھے مرنا ہے کیا؟'' اُس نے چونک کر کہا۔ ''اس سے کچھ حاصل نہ ہو گا۔ کیونکہ اس کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔''

''تو پھر تم جہاں سے آئی ہو وہاں واپس چلی جاؤ...... خالدہ چودھری کو اس کے حال پر چھوڑ دو۔''

''نہیں...... میں خالدہ چودھری کو منجدھار میں نہیں چھوڑ سکتی۔ آخر وہ میری دوست اور سہیلی بھی ہے۔'' وہ بولی۔ ''میں یہ چاہتی ہوں کہ اُس کی رہائی کے سلسلے میں تم میری مدد

کرو۔ کوئی ایسی تدبیر کرو کہ وہ سلطان کے چنگل سے نکل جائے۔''

''میں کس طرح سے اُسے سلطان کے چنگل سے نکال کر لا سکتا ہوں؟ میں کوئی جیمز بانڈ نہیں ہوں۔'' میں نے کہا۔

''تم سلطان سے مل کر اُس سے رہائی کی بات کرو۔ شاید وہ تمہاری بات مان جائے۔'' ساجدہ ملک نے کہا۔

''کیا سلطان میرا چچا یا رشتہ دار ہے جو میری بات مان جائے گا؟ میری تو اُس سے ملاقات بھی نہیں ہوئی ہے۔''

''پھر ایک صورت یہ ہوسکتی ہے کہ رات کے اندھیرے میں ہم دونوں اُس کی کوٹھی میں داخل ہو کر خالدہ چودھری کو نکال لائیں۔ میرے پاس ریوالور وغیرہ بھی ہے۔ میرا ایک دوست لڑکا ہے وہ بھی اس مشن میں ساتھ دے سکتا ہے۔''

''تم کیوں مجھے کانٹوں میں گھسیٹ رہی ہو...... مجھے کیا فائدہ؟ مجھے تم معاف رکھو۔'' میں نے کہا۔

''میں تمہیں اُس کی بازیابی کے عوض ایک لاکھ روپے دینے کے لئے تیار ہوں۔'' وہ کہنے لگی۔ ''میں خالدہ چودھری سے بھی تمہیں دو تین لاکھ روپے دلا دوں گی۔ اس طرح سے تم چار لاکھ روپے تھوڑی سی محنت، جرأت اور حوصلے سے حاصل کر لو گے۔ سلطان کو قابو میں کرنا آسان ہے۔ میں جانتی ہوں اُسے کس طرح قابو میں کیا جا سکتا ہے۔ تم پر آنچ بھی نہیں آئے گی۔''

''میں نے تم سے کہا نا کہ میں جیمز بانڈ نہیں ہوں۔ تم اپنے دوست لڑکے کی مدد سے خالدہ چودھری کو اُس کے چنگل سے نکال لاؤ۔ اس لڑکے کی مالی مدد ہو جائے گی اور وہ تم سے خوش ہو جائے گا۔'' میں نے کہا۔

''یہ اُس لڑکے کے بس کی بات نہیں ہے۔'' ساجدہ ملک نے کہا۔ ''آخر تم پیچھے کس لئے ہٹ رہے ہو؟''

''میں ایک بزدل، ڈرپوک اور کمزور دل کا آدمی ہوں۔ میں ایک مرغی بھی ذبح نہیں کر سکتا۔ اس کی بجائے تم کوئی اور کام بتاؤ، کوئی اور حکم دو...... میں تمہاری ہر بات ماننے کے لئے تیار ہوں۔'' میں نے انکساری سے کہا۔

''ایک منٹ...... میں ابھی آتی ہوں۔'' اتنا کہہ کر وہ بیڈ رُوم کی طرف بڑھ گئی۔

بیڈ رُوم میں داخل ہو کر اُس نے سنگھار میز کے بڑے آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر اپنے سراپا کا ہر زاویے سے جائزہ لیا۔ پھر اسی لمحے اُس کے ذہن نے سوچا، سالار اس طرح راہِ راست پر نہیں آئے گا۔ عورت ہر مرد کی کمزوری ہوتی ہے۔ جب وہ خالدہ چودھری کے ساتھ رات گزار سکتا ہے تو وہ اس کے جال میں بھی پھنس سکتا ہے۔ وہ اسے اپنے جال میں پھانس کر اپنا آلہ کار بنا سکتی ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے آپ کو بطور چارہ استعمال کرے۔ اسے پیش قدمی کرنا ہوگی۔ اسے ہر قیمت پر خالدہ چودھری کو وہاں سے نکال کر لانا ہے۔ وہ ایک لاکھ اسٹرلنگ پاؤنڈ لے کر آئی ہوئی ہے۔

پھر اُس نے یہ سب کچھ سوچتے ہوئے الماری میں سے ایسا لباس نکال کر جلدی سے پہن لیا جو نا مناسب، مردوں کو متوجہ کرنے اور بہکانے والا تھا۔ وہ بلا کی جنسی کشش رکھتی تھی۔ ایک مرد تنہائی میں اُسے اس لباس میں دیکھ کر بہک سکتا تھا۔ پھر وہ مسکراتی ہوئی بیڈ رُوم سے نکل کر میری طرف وارفتگی سے بڑھی۔ اُس کی آنکھوں میں خود سپردگی تھی۔ وہ مجھ پر بڑی فیاضی سے مہربان ہو کر اپنا مہرہ بنانا چاہتی تھی۔ اُس نے میرے پاس آ کر پوچھا۔

''سالار! کیا تم کچھ پینا پسند کرو گے؟ میرے پاس چھ اقسام کی شراب موجود ہے۔''

''چھ نہیں بلکہ سات اقسام کی شراب ہے۔'' میں نے اُسے اُوپر سے نیچے دیکھا۔

''ساتویں قسم کون سی ہے؟'' ساجدہ ملک نے اپنی پلکیں جھپکائیں۔

''ساتویں قسم تم ہو...... بن پیئے ہی مجھ پر ایک نشہ سا چھا رہا ہے۔'' میں نے شوخی سے کہا۔

وہ میرے گلے میں اپنی عریاں مرمریں بانہیں ڈالنے کے لئے بڑھی۔ دفعتاً کسی نے باہر کا دروازہ بری طرح اور بھونڈے طریقے سے پیٹ ڈالا۔ وہ یکدم اُچھل پڑی اور دہشت زدہ ہو کر مجھ سے چمٹ گئی۔ اُس کے چہرے کی رنگت زرد پڑ گئی اور آنکھوں سے خوف و ہراس جھانکنے لگا۔

''سالار!'' وہ پھنسی پھنسی آواز مین بولی اور دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔ ''سلطان کے آدمی آخر میری تلاش میں پہنچ گئے ہیں...... اب میری خیر نہیں...... بتاؤ میں کیا کروں؟ مجھے کہیں چھپا دو۔''

''تم جلدی سے پلنگ کے نیچے یا الماری میں چھپ جاؤ۔'' میں نے اُسے مشورہ دیا۔ میں دروازے پر جا کر دیکھتا ہوں۔''

''ان دونوں جگہ چھپنا بہت مشکل ہے۔کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ وہ مجھے ڈھونڈ نکالیں گے۔''

دروازے پر پھر زور زور سے کوئی مکے مارنے لگا۔ پھر ہذیانی لہجے میں چیخنے لگا۔''او کمینی! جلدی سے دروازہ کھول......!''

''گھبراؤ نہیں...... میں دیکھتا ہوں۔'' میں نے ساجدہ ملک کو الگ کرتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں حالات کا سامنا کرنا ہوگا۔ اب ان بدمعاشوں سے بچنا مشکل ہے۔ دروازہ نہ کھولنے پر وہ دروازہ توڑ بھی سکتے ہیں۔''

میں نے جا کر دروازہ کھولا۔ دروازے پر ایک چالیس برس کا شخص کھڑا تھا۔ وہ نشے میں دھت دکھائی دے رہا تھا۔ اُس نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔ ''ڈیڈی! کیا یہ فلیٹ نمبر دو سو بیس ہے؟''

''نہیں میرے بیٹے! یہ فلیٹ نمبر چار سو بیس ہے۔'' میں نے اُسے جواب دیا۔ ''تمہارا فلیٹ اُوپر ہے۔'' میں نے اتنا کہہ کر دروازہ بند کر دیا۔ وہ تھینک یو...... تھینک یو...... کہتا ہوا زینے کی طرف بڑھ گیا۔

جب میں ساجدہ ملک کے پاس آیا تو اُس کی پیشانی عرق آلود ہو رہی تھی۔ اُس نے سکون کا گہرا سانس لیا۔ پھر وہ میرے سینے پر اپنا سر رکھ کر بولی۔ ''یہ شرابی اُوپر رہتا ہے۔ کئی بار میرے فلیٹ کے دروازے کو پیٹ کر مجھے پریشان کر چکا ہے۔''

''اچھا...... اب تم مجھے جانے دو۔'' میں نے اُس کا سر سینے پر سے ہٹاتے ہوئے کہا۔ ''تم جو چاہتی ہو وہ میں کر نہیں سکتا۔ سلطان کے چنگل سے میں خالدہ چودھری کو نکال کر نہیں لا سکتا۔''

''نہیں...... نہیں......'' وہ تڑپ کر بولی۔ ''میں تمہیں جانے نہیں دوں گی۔ تمہیں میری مدد کرنا ہوگی۔''

تبھی اطلاعی گھنٹی بجی۔ ساجدہ ملک نے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''وہ مردود شاید پھر آ گیا ہے۔''

پھر وہ پیچ و تاب کھاتی دروازے کی طرف بڑھی۔ میں اُسے روکتا رہ گیا۔ میں اُس

سے کہنا چاہتا تھا کہ دروازہ نہ کھولو! کیونکہ تمہارے لئے سرپرائز ہے لیکن وہ اس تیزی سے لپکی تھی کہ میں ایک لفظ بھی نہ کہہ سکا تھا۔

ساجدہ ملک نے جیسے ہی دروازہ ایک جھٹکے سے کھولا، تین بدمعاش اُسے اور دروازے کو دھکا دیتے ہوئے اندر گھس آئے۔ ساجدہ ملک اپنا توازن قائم نہ رکھ سکی اور فرش پر گر گئی۔ ایک بدمعاش نے فوراً ہی دروازہ بند کر کے اندر سے چٹخنی لگا دی۔ ساجدہ ملک فوراً ہی اُٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ تیزی سے میرے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔

وہ تینوں بدمعاش ہم دونوں کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ ایک بدمعاش نے ساجدہ ملک کو گھورتے ہوئے کہا۔ ''بھئی ہم رنگ میں بھنگ ڈالنے کی معافی چاہتے ہیں...... آپ سے بھی معذرت خواہ ہیں۔'' اُس نے میری طرف دیکھا۔

ساجدہ ملک نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔ اُس کی حالت غیر ہوئی جا رہی تھی، چہرہ فق ہو گیا تھا۔

''اس لباس میں تم کسی امریکن نائٹ کلب کی ڈانسر لگ رہی ہو۔'' دوسرے بدمعاش نے اُسے نظروں میں جذب کرتے ہوئے کہا۔

''لیکن مجھے تو تم کسی جل پری کی طرح لگ رہی ہو......'' تیسرا بدمعاش یہ کہتا ہوا ساجدہ ملک کی طرف بڑھا تو میں اُس کے اور ساجدہ ملک کے درمیان حائل ہو گیا۔ اُس نے مجھ سے کہا۔ ''آپ ہم دونوں کے درمیان سے ہٹ جائیں۔''

''نہیں......'' میں نے کہا۔ ''میں تمہیں کسی بدتمیزی کی اجازت نہیں دے سکتا۔ تم انہیں لے جانے آئے ہو، لہٰذا شرافت سے لے جاؤ۔''

''باس نے ہمیں ہر قسم کی چھوٹ دے رکھی ہے۔'' اُس نے جواب دیا۔ ''ہم ان محترمہ کو بیڈ رُوم میں بھی لے جا سکتے ہیں۔''

''تم جھوٹ بول رہے ہو'' میں نے ترش روئی سے کہا۔ ''باس اس قسم کی اجازت نہیں دے سکتا۔''

''ہم اُس کے سپیشل آدمی ہیں۔ ہمیں ہر قسم کی اجازت اور ہر بات کی آزادی ہے۔'' دوسرے بدمعاش نے کہا۔

''اگر ایسی بات ہے تو تم باس سے میری بات کراؤ...... اگر باس نے تصدیق کر دی تو

پھر مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔''

''بھئی یہ کیا بات ہوئی کہ آپ ان محترمہ سے من مانی کریں اور ہمیں اس کی اجازت نہ دیں۔'' تیسرے بدمعاش نے کہا۔

''سنو...... میں نے کوئی من مانی نہیں کی اور نہ مجھے اس کی کوئی ضرورت ہے۔'' میں نے سخت لہجے میں کہا۔

''سنو....'' پہلے بدمعاش نے کہا۔ ''ہمارا تم سے کوئی جھگڑا نہیں...... نہ باس نے تمہارے بارے میں ہم سے کچھ کہا ہے۔ ہم اسے لے جانے آئے ہیں۔ اگر یہ اس لباس میں نہ ہوتی تو ہماری نیت میں فتور نہ آتا...... تم اس کے اور ہمارے درمیان سے ہٹ جاؤ۔ ہم من مانی کر کے اسے لے جانا چاہتے ہیں۔ کیونکہ ہماری زندگی میں کبھی ایسی ایک نمبر کی چیز نہیں آئی نہ آئے گی۔ لہٰذا ہمیں بھی ذرا دل بہلانے دو۔''

''تم بدمعاشوں نے مجھے کیا سمجھ رکھا ہے؟'' وہ پھنکاری۔ ''تم میں سے کسی نے مجھے ہاتھ لگایا تو میں اُس کا منہ نوچ لوں گی۔''

''تم منہ نوچ لو یا آنکھیں پھوڑ دو...... یا ہمیں قتل کر دو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا میری جان!'' دوسرے بدمعاش نے فلمی ہیرو کے انداز سے کہا۔ ''آئی لو یو...... تم جانتی ہو محبت اندھی ہوتی ہے۔''

میں نے اُن تینوں بدمعاشوں کے ذہنوں کو پڑھ لیا جو ساجدہ ملک کی عزت کے درپے ہو رہے تھے۔ وہ پہلے ہی سے اُس کی بے حرمتی کا منصوبہ بنا کر آئے تھے۔ سلطان کے باز پرس کرنے پر اُنہوں نے یہ کہنے کا سوچ رکھا تھا کہ ساجدہ ملک نے چونکہ ان کے ساتھ بدتمیزی کی، گالیاں بکیں، منہ پر تھوکا اور سخت مزاحمت کی اس لئے وہ یہ سب کچھ برداشت نہ کر سکے اور اس کی بے عزتی کرنے پر مجبور ہو گئے۔ ان کا خیال تھا کہ باس کچھ نہیں کہے گا۔ وہ باس کی محبوبہ وغیرہ تو ہے نہیں۔

ایک بدمعاش میری طرف بڑھا تا کہ مجھے ہٹائے۔ ساجدہ ملک نے مجھے ڈھال بنا لیا۔ پھر مجھے ایک طرف ہٹا کر اُس نے اُس بدمعاش کے منہ پر ایک مُکا مارا۔ وہ جوڈو کراٹے کی ماہر تھی۔ وہ بدمعاش اُلٹ کر اپنے ساتھیوں پر جا گرا۔ اُن بدمعاشوں کو فوراً ہی اندازہ ہو گیا کہ ساجدہ ملک جوڈو کراٹے جانتی ہے اور وہ ان کے لئے خطرناک ثابت ہو

سکتی ہے۔ اسے بے بس کر کے قابو میں کرنا آسان نہیں ہے۔ ایک بدمعاش نے اپنی جیب سے پستول نکال لیا۔ دوسرے بدمعاش نے چاقو اور تیسرے بدمعاش نے جیب سے ایک بوتل نکال لی جس میں تیزاب بھرا ہوا تھا۔ پھر اُس بدمعاش نے ساجدہ ملک کو تیزاب کی بوتل دکھاتے ہوئے کہا۔

''اب تم شرافت سے ہمارے ساتھ چلی چلو...... ورنہ یہ تیزاب تمہارے چہرے پر پھینک دُوں گا۔ تم شاید بدصورت ہونا پسند نہیں کرو گی۔''

ساجدہ ملک نے خوفزدہ ہو کر میری طرف دیکھا، اس اُمید سے کہ میں ان بدمعاشوں سے اُسے بچا لوں گا۔ لیکن میں اُس کی کوئی بھی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ میرے پاس پستول ہوتا تو اُسے بچا لیتا۔ میں نے اُس سے کہا۔ ''تم ان کے ساتھ چلی جاؤ! اسی میں تمہاری بہتری ہے۔ یہ اپنے باس کے حکم سے مجبور ہو کر آئے ہیں۔ یہ تمہیں ہر قیمت پر لے جا کر رہیں گے۔''

''میں چلی تو جاؤں لیکن مجھے ڈر یہ ہے کہ کہیں یہ لوگ مجھے کسی اور جگہ برے ارادے سے نہ لے جائیں۔'' ساجدہ ملک نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔ ''یہ کمینے میرے پیچھے ہاتھ دھو کر کئی دنوں سے پڑے ہوئے ہیں۔''

''تم ابھی اور اسی وقت باس سے ٹیلی فون پر رابطہ کرو اور اُن سے کہو کہ میں ابھی اور اسی وقت تمہارے آدمیوں کے ساتھ آنا چاہتی ہوں۔ لیکن مجھے ان کے ارادے اچھے نہیں لگ رہے ہیں۔ ذرا آپ انہیں سمجھا دیں۔''

''ہاں...... یہ ٹھیک رہے گا۔'' ساجدہ ملک تیزی سے ٹیلی فون کی طرف لپک گئی۔

پستول والا بدمعاش ساجدہ ملک کو روکنے کے لئے بڑھا۔ وہ میرے پاس سے گزرنے لگا تو میں نے غیر محسوس انداز سے اور برقی سرعت سے اُس کے ہاتھ سے پستول جھپٹ لیا جس کی اُسے توقع نہیں تھی۔ پھر میں نے اُسے نشانے کی زد میں لیتے ہوئے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ ''تم شرافت سے ایک طرف کھڑے ہو جاؤ!''

میرے ہاتھ میں پستول دیکھ کر اُن تینوں کے چہرے فق ہو گئے۔ ساجدہ ملک کا چہرہ دمک اُٹھا۔ وہ میرے پاس آ کر بولی۔ ''لاؤ! یہ پستول مجھے دے دو تا کہ میں ان تینوں کو مزہ چکھاؤں۔''

''ان سے اُلجھنے کی ضرورت نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''تم اپنے باس سے جا کر ملو۔ یہ

تمہارے حق میں بہتر ہوگا۔''

''نہیں...... میں نہیں جاؤں گی۔ وہ مجھ سے ناراض ہے۔ مجھ سے اچھا سلوک نہیں کرے گا۔'' اُس نے تکرار کی۔

''تم خود چلی جاؤ گی تو اُس کی آدھی ناراضگی دُور ہو جائے گی۔'' میں نے اُسے مشورہ دیا۔ ''باس سے اُلجھنے اور ٹکر لینے کی ضرورت نہیں۔ میں ان تینوں کو روکے رکھتا ہوں۔ جب تک تم وہاں پہنچ کر مجھے ٹیلی فون نہیں کرو گی انہیں یہاں سے جانے نہیں دُوں گا۔ تمہارے پاس موبائل فون ہے تم باس کی کوٹھی کے باہر سے مجھے ٹیلی فون کر دینا۔''

ساجدہ ملک کی سمجھ میں بات آ گئی۔ وہ اسی وقت فلیٹ سے نکل گئی۔ اُس کے نکلتے ہی پہلے والے بدمعاش نے کہا۔ ''تم نے ہمارے ساتھ اچھا نہیں کیا...... تم نے ہمارے ارمانوں اور مسرتوں کا خون کر دیا...... ہماری زندگی میں کبھی ایسی عورت نہیں آئی۔ تم بھی فائدہ اُٹھاتے اور ہمیں بھی فائدہ اُٹھانے دیتے۔''

''یار!'' دوسرے بدمعاش نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ ''ان صاحب کو شاید موقع مل گیا تھا اسی لئے تو اُسے جانے دیا۔''

''ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' میں نے اپنی صفائی پیش کی۔ ''یہ تم لوگوں کے اندازے ہیں۔ میں تمہاری ذہنیت کے بارے میں کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ صرف یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ میں نے کوئی معیوب قسم کی حرکت نہیں کی۔ اگر میرے دل میں اس سے فائدہ اُٹھانے کی خواہش یا آرزو ہوتی تو پھر تم لوگوں کی بات مان لیتا۔''

''ایسی تنہائی اور ایسے لباس میں ایک جوان اور حسین عورت کو دیکھ کر زاہد بھی بہک جاتے ہیں۔'' دوسرے بدمعاش نے تمسخر سے کہا۔ ''کیا تم آسمان سے اُترے ہوئے فرشتے ہو جو سرفراز نہ ہو سکے؟''

''میں نہ زاہد ہوں اور نہ فرشتہ...... اصل بات یہ ہے کہ میں نے کبھی عورت کو اپنی کمزوری نہیں بنایا۔''

''اصل بات یہ کیوں نہیں کہتے کہ تم میں مردانہ کمزوری موجود ہے۔'' تیسرے بدمعاش نے تمسخر سے کہا۔

پھر وہ تینوں قہقہے مار کر ہنسنے لگے۔ پھر تیسرے بدمعاش نے کہا۔ ''تم نا اُمید اور مایوس

کیوں ہوتے ہو؟ اپنی مردانہ کمزوری کا علاج کروانا چاہو تو کروا سکتے ہو۔ ایسے علاج کرنے والے حکیموں اور دواخانوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔''

ساجدہ ملک کا ٹیلی فون آنے تک وہ تینوں مل کر بکواس کرتے اور میری مردانگی کا مذاق اُڑاتے رہے، نسخے بتاتے رہے۔ میں خاموشی سے اُن کے ریمارکس سنتا رہا۔ اُن کی کسی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ مجھے نہ تو غصہ آیا اور نہ ہی اُن کی کسی بات کا برا منایا۔ میں اُن سے اُلجھنا اور بگاڑ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔ میں چوکنا رہا اور وہ میرے پستول کی زد میں رہے۔

جب ساجدہ ملک کا ٹیلی فون آیا کہ وہ باس کے ہاں پہنچ گئی ہے اور باس کے ہاں سے ٹیلی فون کر رہی ہے تو میں نے اُس سے کہا کہ باس سے کہو وہ ان بدمعاشوں سے بات کر کے تصدیق کر دے۔ پہلے والے بدمعاش نے باس سے ٹیلی فون پر بات کی۔ پھر میں نے پستول اُس بدمعاش کو دے دیا جس سے چھینا تھا، پھر وہ تینوں خاموشی اور شرافت سے وہاں سے نکل گئے۔

اُن بدمعاشوں کے جانے کے بعد میں نے سوچا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہئے؟ کیا میں اپنی راہ لوں اور ان لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑ دُوں؟ تھوڑی دیر تک سوچ بچار کرنے کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ خالدہ چودھری کو سلطان کے ہاں سے کسی نہ کسی طرح نکالنا چاہئے، اُسے گن پوائنٹ پر شاید اغواء کیا گیا تھا، تاوان یا ہیرے کا چکر تھا۔ اُسے کیوں یرغمال بنایا ہوا تھا؟ وہاں پہنچ کر ہی پتہ چل سکتا تھا۔ دولت کی وجہ سے خالدہ چودھری کی ذات مصیبت بن گئی تھی۔ ساجدہ ملک بھی اُسے اغواء کر کے اُس سے ایک بڑی رقم ہتھیانا چاہتی تھی لیکن سلطان سبقت لے گیا تھا۔

میں کچھ دیر بعد سلطان کے ٹھکانے کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس کا پتہ مجھے کسی نے نہیں بتایا تھا، میں نے اُن بدمعاشوں کے ذہن سے معلوم کر لیا تھا۔ میں نے کچھ فاصلے پر ٹیکسی چھڑوالی، پھر اُس کی کوٹھی کی طرف بڑھا۔ ساجدہ ملک کی گاڑی گیٹ کے باہر پارک تھی۔ خالدہ چودھری کی رہائی کے لئے میرے ذہن میں ایک منصوبہ آیا تھا، اس پر عمل کرنے سے اُسے سلطان سے رہائی مل سکتی تھی۔ ویسے مجھے کامیابی کی توقع کم ہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد میں سلطان کے سامنے اُس کی نشست گاہ پر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ یہ سمجھا کہ اس کا پتہ مجھے ساجدہ ملک نے بتایا ہے۔ ایک پل میں، میں نے اُس کے ذہن سے بہت

کچھ معلوم کر لیا تھا۔ اُس نے خالدہ چودھری کو اس لئے اغواء کر کے یرغمال بنایا تھا کہ وہ ہیرا خالدہ چودھری نے کوڑیوں کے دام خرید لیا تھا۔ ساجدہ ملک کے بارے میں اس کا خیال یہ تھا کہ ساجدہ ملک نے وہ ہیرا خالدہ چودھری کے ہاتھ فروخت کیا ہے۔ اس طرح ساجدہ ملک نے اُسے دھوکہ دیا۔ جبکہ خالدہ چودھری نے اُسے یقین دلانے کی کوشش کی تھی کہ ہیرا نہ تو اس کے پاس ہے نہ اُس نے خریدا ہے اور نہ اس کی شکل دیکھی ہے۔ وہ ہیرے کی خریداری کے لئے آئی ہوئی ہے۔ پوری دنیا میں کل اصل کوہ نور ہیرے پچیس عدد ہیں۔''

ساجدہ ملک نے بھی اس سے اپنی صفائی پیش کی تھی کہ ہیرے والے نے اُس سے اب تک رابطہ نہیں کیا ہے۔ لیکن سلطان ان دونوں کی باتوں سے مطمئن نہیں ہوا تھا۔ اُس نے اُن دونوں کو ایک کمرے میں بند کر دیا تھا کیونکہ اس وقت میں پہنچ گیا تھا۔ وہ مجھ سے تنہائی میں اُن کی غیر موجودگی میں بات کرنا چاہتا تھا۔

''تمہیں یہاں کا پتہ کس نے دیا؟'' سلطان نے کرخت لہجے میں پوچھا۔ ''ساجدہ ملک نے تو نہیں دیا؟''

''آپ کا پتہ کسی نے نہیں دیا بلکہ میں آپ کے آدمیوں کا غیر محسوس انداز سے تعاقب کرتا ہوا یہاں پہنچا ہوں۔'' میں نے جھوٹ بولا۔ اس کے سوا چارہ بھی نہیں تھا۔ میں اُسے بتانا نہیں چاہتا تھا کہ میں ذہن پڑھ کر سب کچھ معلوم کر لیتا ہوں۔

''تم یہاں کس لئے آئے؟'' سلطان غرایا۔ ''کیا تم نہیں جانتے کہ میں کون ہوں؟''

''میں اس لئے آیا ہوں کہ آپ خالدہ چودھری کو رہا کر دیں۔ اُس نے نہ تو ہیرا خریدا ہے اور نہ ہی اس کی شکل دیکھی ہے۔ اُس سے ہیرا بیچنے والے نے بھی رابطہ نہیں کیا ہے۔ جس کے پاس ہیرا ہے اُسے صرف ساجدہ ملک جانتی ہے۔''

سلطان کچھ کہنا چاہتا تھا کہ اُس کے ملازم نے آ کر مؤدبانہ لہجے میں کہا۔ ''باس! اجمل صاحب آپ سے ملنے کے لئے آئے ہیں۔''

''اجمل صاحب؟'' اُس کا چہرہ دمک اُٹھا۔ پھر اُس نے اپنے ملازم سے کہا۔ ''ان صاحب کو اُس کمرے میں لے جاؤ جہاں ساجدہ ملک اور خالدہ چودھری بند ہیں۔'' پھر اُس نے میری طرف دیکھا۔ ''آپ کچھ دیر وہاں مہمان کی حیثیت سے ٹھہریں۔ ان دونوں کو سمجھائیں۔ میرے مہمان آئے ہیں، ان کے جانے کے بعد آپ سے بات کروں

گا۔'' اُس نے مجھے آپ سے مخاطب کیا۔

میں نے سلطان کے ذہن سے معلوم کر لیا تھا کہ یہ اجمل کون ہے۔ اجمل سمگلر تھا۔ وہ سونے اور ہیرے جواہرات کی سمگلنگ کرتا تھا۔ وہ بھی اس ہیرے میں دلچسپی لے رہا تھا۔ وہ سلطان سے ہیرا خریدنا چاہتا تھا کیونکہ وہ ہیرے ہی خریدتا تھا۔ سلطان نے اُس سے کہا تھا کہ ہیرا وہ مناسب قیمت پر اُس کے ہاتھ فروخت کر دے گا۔

میں اُس کے ملازم کے ساتھ اُس کمرے کی طرف بڑھ گیا جس کمرے میں خالدہ چودھری اور ساجدہ ملک کو بند کیا ہوا تھا۔ اُس کمرے کے دروازے کی باہر سے کنڈی لگی ہوئی تھی۔ باہر ایک مسلح بدمعاش پہرہ دے رہا تھا۔ اُس ملازم نے آگے بڑھ کر کنڈی کھول دی اور مجھے اندر جانے کے لئے کہا۔ جب میں اندر داخل ہوا تو اُس نے دروازہ بند کر کے باہر سے کنڈی لگا دی۔

خالدہ چودھری ہراساں اور پریشان سی بستر پر لیٹی ہوئی تھی اور ساجدہ ملک بڑی متفکر سی کرسی پر براجمان تھی۔ مجھے دیکھ کر دونوں چونک پڑیں اور ششدر ہو کر ایک دوسرے کی شکل دیکھنے لگیں۔

''تم یہاں کیوں اور کیسے آئے؟'' خالدہ چودھری نے اُٹھ کر بیٹھتے ہوئے حیرت سے مجھ سے پوچھا۔

''میں تم دونوں کو رہا کرانے کے لئے یہاں آیا ہوں۔'' میں نے بڑے صوفے پر بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔

''تمہیں یہاں کا پتہ کس نے دیا؟'' ساجدہ ملک کے لہجے میں بھی حیرت تھی۔

''میں بدمعاشوں کا غیر محسوس انداز سے تعاقب کرتے ہوئے یہاں پہنچ گیا۔'' میں نے اُسے بتایا۔

''لیکن تم نے بہت بڑا خطرہ مول لیا ہے سالار!'' خالدہ چودھری کہنے لگی۔ ''تمہیں یہاں نہیں آنا چاہئے تھا۔ کیونکہ سلطان بہت ہی خطرناک شخص ہے۔ وہ اپنے دشمن کو معاف کرنا جانتا ہی نہیں ہے۔''

''مارنے والے سے بچانے والا بڑا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''میری جان کی فکر نہ کرو، یہاں سے نکلنے کی تدبیر کرو۔ یہاں سے نکلتے ہی تم دونوں ملک چھوڑ کر چلی جاؤ۔ اُس

ہیرے کا خیال دل سے نکال دو۔''

''میں فوراً ہی یہ شہر اور ملک چھوڑ دُوں گی......'' خالدہ چودھری سراسیمگی سے بولی۔

''میں اب ایک دن کیا، ایک گھنٹہ بھی یہاں نہیں رُکوں گی۔ اب مجھے احساس ہو رہا ہے کہ ہیرا جان سے زیادہ عزیز نہیں ہے۔''

''لیکن میں یہاں سے ابھی جانا نہیں چاہتی۔'' ساجدہ ملک نے کہا۔

''ہاں...... مجھے یاد آیا۔'' میں نے ساجدہ ملک سے کہا۔ ''تمہارے جانے کے بعد ایک شخص تم سے ملنے آیا تھا۔ اُس نے اپنا نام جعفر بتایا تھا۔ وہ تمہاری تلاش میں لندن سے آیا ہوا ہے۔ اُس نے مجھ سے کہا کہ میں اس کا یہ پیغام تم تک پہنچا دُوں کہ اب پانی سر سے اُونچا ہو گیا ہے۔ اب صبر نہیں ہوسکتا......''

''جعفر......؟'' ساجدہ ملک حیرت اور خوف سے اُچھل پڑی۔ اُس کا چہرہ زرد پڑ گیا، پھر سفید پڑتا چلا گیا۔ اُس کی آنکھوں سے خوف و ہراس جھانکنے لگا۔ اُس کے سراپا میں ارتعاش کی ایک لہر سی اُٹھی۔ اُس پر چند ثانیوں تک سکتہ سا چھایا رہا۔ وہ اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتی ہوئی بولی۔ ''اُسے اس فلیٹ کا پتہ کیسے معلوم ہوا؟''

''میرے پوچھنے پر اُس نے بتایا کہ اس نے تمہیں اس عمارت سے نکل کر جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ ٹریفک کے رش کی وجہ سے تمہاری گاڑی کو اوورٹیک کر کے رُکوا نہ سکا تھا۔ اُس نے عمارت کے چوکیدار سے تمہارے بارے میں معلوم کیا تھا۔''

جعفر ایک بزنس مین تھا۔ دبئی میں اس کا کاروبار تھا۔ ساجدہ ملک نے اُسے پھانس کر تعلقات قائم کر لئے۔ پھر اُس نے کوہ نور ہیرے کا چارہ ڈال کر اُس سے دس لاکھ ریال ہتھیا لئے۔ پھر وہ اُسے لندن کا کہہ کر کراچی آ گئی۔ جعفر کو اُس کی دھوکہ بازی کا علم ہوا تو اُس نے ساجدہ ملک کے پیچھے دو آدمی لگا دیئے جو خطرناک قسم کے اور پیشہ ور بدمعاش تھے۔ جعفر فلیٹ پر نہیں آیا تھا۔ اُس کے ذہن میں جعفر کے بارے میں جو کچھ تھا، میں نے معلوم کر لیا تھا۔ اُسے جعفر سے خائف کر کے میں اُسے واپس لندن خالدہ چودھری کے ساتھ بھیجنا چاہتا تھا۔ اس لئے اُس کے سامنے جعفر کا نام لیا تھا۔ میرا چلایا ہوا تیر اپنے نشانے پر جا لگا تھا۔

''اب میں کیا کروں......؟'' ساجدہ ملک نے اپنا سر پیٹ لیا۔ ''یک شد نہ دو شد......''

''اگر تم وعدہ کرو کہ خالدہ چودھری کے ساتھ واپس چلی جاؤ گی تو میں تمہیں یہاں سے نکال دُوں گا۔'' میں نے کہا۔

''میں وعدہ کرتی ہوں...... لیکن تم ہمیں کس طرح یہاں سے نکالو گے؟''

''میرے ذہن میں ایک تدبیر ہے، اس پر عمل کر کے تم فرار ہوسکتی ہو۔ لیکن تم خالدہ چودھری کو بھی ساتھ لے جاؤ گی۔''

''میں خالدہ چودھری کو بھی ساتھ لے جاؤں گی...... تم مجھ پر اعتماد کرو۔'' ساجدہ ملک نے مجھے یقین دلایا۔

''اس وقت تمہارے پرس میں بے ہوشی کی دوا موجود ہے نا؟'' میں نے پوچھا۔

ساجدہ ملک بڑے زور سے چونکی۔ اُس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ''بھلا تم اس کے متعلق کیسے جانتے ہو؟''

''یہ دوا تمہارے دوست لڑکے سرفراز نے لا کر دی تھی تاکہ تم اس کی مدد سے کسی کو اغواء کر سکو۔'' میں کہنے لگا۔ ''اس دوا سے ایک شخص پورے اٹھارہ سے چوبیس گھنٹے کے لئے بے ہوش ہو جاتا ہے۔ تم ایک عورت کو دوا پلا کر بے ہوش کر دیتیں، اُسے ہسپتال لے جانے کے بہانے اس جگہ لے جاتیں جہاں اسے قید کر کے رکھنا تھا، پھر اس سے تاوان کی رقم وصول کر کے رہا کر دیتیں۔ لیکن تمہیں کسی وجہ سے اس کا موقع نہیں مل سکا۔ حالات نے ایک دم سے نئی کروٹ لے لی۔''

ایسا لگا ساجدہ ملک غش کھا جائے گی۔ وہ بھونچکی سی ہو گئی تھی کہ مجھے یہ سب کچھ کیسے معلوم ہوا اور کس نے بتایا ہوگا۔ وہ ڈر رہی تھی کہ کہیں میں خالدہ چودھری کا نام نہ لے دُوں۔ وہ خالدہ چودھری کو اغواء کر کے اس سے اسٹرلنگ پاؤنڈ حاصل کرنا چاہتی تھی جو وہ نقد رقم کی صورت میں سوٹ کیس میں چھپا کر لندن سے لے کر آئی تھی۔ ہوٹل کے کمرے میں جو سوٹ کیس تھا اس میں یہ رقم موجود تھی۔ اس وقت اُس کے پرس میں پانچ ہزار پاؤنڈ کے نوٹ موجود تھے۔

میں نے ساجدہ ملک کو پانی پلایا جو ایک جگ میں میز پر رکھا ہوا تھا۔ پانی پینے سے اُس کے اعصاب قدرے بہتر ہوئے۔ وہ مجھے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتی ہوئی بولی۔

''یہ سب کچھ تمہیں کس نے بتایا؟ سرفراز نے تو نہیں......؟''

''جس نے بھی بتایا...... میں نہیں بتاؤں گا۔'' میں نے کہا۔ ''تم چائے بہت اچھی بناتی ہو۔ سلطان اور اُس کے سارے آدمیوں کو تمہارے ہاتھ کی بنی ہوئی چائے بہت پسند ہے۔ سلطان شاید تم سے سب کے لئے چائے بنانے کے لئے کہے۔ تم چائے میں وہ دوا ملا دینا۔ جب چائے پی کر سب بے ہوش ہو جائیں تب تم دونوں یہاں سے فرار ہو جانا۔ پھر اس ملک سے نکل جانا۔ اسی طرح تم دونوں سلطان کے ہاتھوں سے بچ سکتی ہو۔''

''تم کس قدر ذہین اور ہوشیار ہو سالار!'' خالدہ چودھری نے مجھے رشک بھری نظروں سے دیکھا۔ ''تم کیوں نہ میرے ساتھ امریکہ چلو...... مجھے تم جیسے ذہین آدمی کی ضرورت ہے۔''

''میں امریکہ چل کر کیا کروں گا......؟ وہاں میرا مستقبل کیا ہوگا؟'' میں نے پوچھا۔

''میں تمہیں اپنا بزنس پارٹنر بنا لوں گی......تم میری جیولری شاپ سنبھال لینا۔ تم اس بزنس کا تجربہ بھی رکھتے ہو۔''

''اگر تم لائف پارٹنر بنانے کی پیش کرو تو میں تمہارے ساتھ چلنے کے لئے تیار ہوں۔'' میں نے کہا۔

''میں شادی کی قائل نہیں ہوں اور نہ بچوں کے جھنجھٹ میں پڑنا پسند کرتی ہوں۔ میں ایک امریکی عورت کی طرح ہوں۔ میں نے پوری طرح امریکی معاشرے میں اپنے آپ کو ڈھال لیا ہے۔ اب میری سوچ، خیالات اور نظریات ایک آزاد خیال امریکی عورت کی طرح ہیں۔ میں بغیر شادی کے تمہارے ساتھ بیوی کی طرح رہنے کے لئے تیار ہوں۔ جب دل سے دل مل جائیں تو شادی کی کیا ضرورت...... میں کسی بندھن کی قائل نہیں ہوں۔'' خالدہ چودھری بولی۔

''میں تمہارے ساتھ فوری طور پر امریکہ اس لئے بھی نہیں چل سکتا کہ نہ تو میرے پاس پاسپورٹ ہے اور نہ امریکی ویزا...... لاہور میں میری دُکان ہے، اُسے بھی سمیٹنا ہے اور پھر میں غیر قانونی میاں بیوی بن کر رہنا پسند نہیں کرتا۔ اور پھر میں ایک ایسی عورت سے کیسے شادی کر سکتا ہوں جو شادی کی قائل نہیں، جس میں مامتا نہیں، جو ماں بننا نہیں چاہتی اور پھر جس کی زندگی میں بہت سارے مرد آ چکے ہیں۔ جو کبھی کسی کی نہ ہو سکی وہ کب میری ہو سکتی ہے؟'' میں نے کہا۔

''تم کچھ دنوں بعد آ جانا!'' خالدہ چودھری نے کہا۔ ''میں تمہارے لئے امریکی ویزا کا بندوبست کر دوں گی...... تمہیں میرے ساتھ زندگی گزارتے ہوئے اس بات کی اجازت ہو گی کہ تم کسی بھی عورت سے تعلقات رکھ سکو...... امریکی معاشرے میں وہ عزت و آبرو کا تصور نہیں ہے جو مشرق میں ہے۔ ایک مرد کے دو تین عورتوں سے تعلقات ہوتے ہیں۔ اسی طرح ایک امریکی عورت جس مرد سے چاہے اپنا تعلق قائم کر لیتی ہے۔ تم کسی اجنبی لڑکی کو وقت گزاری کے لئے دعوت دو گے تو وہ قطعی برا نہیں منائے گی۔ اُس نے تمہیں پسند کر لیا اور اُس کے دل میں بھی خواہش ہوئی تو وہ تمہارے ساتھ وقت گزار لے گی۔ صرف امریکہ میں ہی نہیں بلکہ یورپ میں بھی یہ بات عام ہے۔''

''اس کا مطلب یہ ہے کہ امریکہ ایک مہذب جنگل ہے۔ وہاں حیوان نما انسان بستے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''اس وقت امریکہ دنیا میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ ملک ہے۔ ہر شخص اپنے جسم کا مالک ہے۔ جسم اس کی اپنی ملکیت ہوتی ہے وہ جسے چاہے پیش کر دے یہ اس کی اپنی مرضی ہے۔'' خالدہ چودھری نے مجھے قائل کرنے کی کوشش کی۔

اسی وقت دروازے کی کنڈی کھلنے کی آواز سنائی دی تو گفتگو ادھوری رہ گئی۔ ایک مسلح بدمعاش نے اندر جھانکتے ہوئے کہا۔ ''آپ تینوں تشریف لے آئیں...... باس نے بلایا ہے۔''

جب ہم تینوں نشست گاہ میں پہنچے تو سلطان بے قراری سے کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ اس وقت وہ اکیلا تھا۔ اُس نے چھوٹتے ہی ساجدہ ملک سے کہا۔ ''سالار نے بتایا ہے کہ تم اُس شخص کو جانتی ہو جو ہیرا لے کر آیا ہوا ہے؟''

ساجدہ ملک اس بات سے انکاری ہونا چاہتی تھی اس لئے میں نے فوراً ہی کہا۔ ''اُس شخص کا نام شیرازی ہے۔ وہ ہوٹل ریجنٹ میں ٹھہرا ہوا ہے، کمرہ نمبر سات سو دس...... آپ اُس سے رابطہ کر لیں۔''

ساجدہ ملک ششدر سی رہ گئی کہ مجھے کیسے معلوم ہوا۔ سلطان نے فوراً ہی ہوٹل ریجنٹ رابطہ کیا۔ وہاں سے پتہ چلا کہ وہ کمرے میں موجود نہیں ہے، کسی کام سے باہر گیا ہوا ہے۔

''اب آپ کی تسلی ہو گئی کہ ہیرا میں نے نہیں خریدا ہے اور نہ میرے پاس ہے اور نہ ہی

میں شیرازی کو جانتی ہوں۔ لہٰذا آپ مجھے جانے دیں۔ آپ کا ہیرا آپ کو مبارک ہو۔'' خالدہ چودھری نے کہا۔

''وہ ہیرا میں نے ابھی کہاں خریدا ہے؟'' سلطان نے کہا۔ ''اب خریدوں گا۔ لیکن میں آپ واس صورت میں یہاں سے جانے دُوں گا کہ آپ مجھے دس لاکھ پاؤنڈ ادا کر دیں۔''

''وہ کس خوشی میں......؟'' اُس نے حیرت سے سلطان کو گھورا۔

''رہائی کی خوشی میں......'' سلطان نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''میں تاوان طلب کر رہا ہوں۔ اس کے بغیر رہائی ناممکن ہے۔''

''یہ بڑی زیادتی کی بات ہے...... میں نے کیا قصور کیا جو آپ مجھ سے تاوان وصول کرنا چاہتے ہیں؟'' خالدہ چودھری تنک کر بولی۔

''سرمایہ داروں اور صنعت کاروں سے تاوان وصول کرنا میرا کام ہے...... اگر میں ایسا نہ کروں تو پھر میرا اور میرے آدمیوں کا گزارہ کیسے ہوگا...... ان کی دال روٹی کیسے چلے گی؟'' سلطان نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''میں آپ کو ایک راز کی بات بتاؤں؟'' میں نے سلطان سے کہا۔

''کون سی راز کی بات؟'' سلطان نے میری طرف گردن گھما کر سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''خالدہ چودھری کے پاس جو برٹش کرنسی ہے وہ جعلی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''آپ اسے لے کر کیا کریں گے؟ وہ کس کام کی؟''

''تم جھوٹ بول رہے ہو......'' سلطان نے غراتے ہوئے کہا۔ ''تم خالدہ چودھری کی رقم بچانا چاہتے ہو۔''

''آپ کو میری بات کا یقین نہیں آ رہا تو آپ ابھی اور اسی وقت اس بات کی تصدیق کر سکتے ہیں۔ ان کے پرس میں کچھ رقم پڑی ہے، آپ دیکھ لیں، وہ جعلی ہے۔'' میں نے کہا۔

میری بات سن کر خالدہ چودھری سناٹے میں آ گئی۔ وہ دل میں حیران تھی کہ مجھے اس کا کیونکر علم ہوا؟ یہ حقیقت بھی تھی۔ اُس نے یہ جعلی کرنسی اٹلی کی ایک مافیا سے خریدی تھی تا کہ اس سے ہیرا خرید سکے۔

سلطان کے کہنے پر خالدہ چودھری نے اپنے پرس سے ساری رقم نکال کر سلطان کے سامنے رکھ دی۔ سلطان نے اُس کرنسی کو چیک کیا تو میری بات سچ ثابت ہوئی۔ پھر اُس

نے کہا۔ ''تم دس دنوں تک میرے ہاں رہو گی تا کہ میں وقت گزاری کر سکوں۔ اسے تم ایک انوکھا تاوان سمجھ لو...... تم بہت حسین ہو مس خالدہ چودھری!''

میں نے خالدہ چودھری کو سلطان کی نظریں بچا کر آنکھ ماری کہ اس کی بات مان لو۔

''ٹھیک ہے۔'' خالدہ چودھری نے کہا۔ ''لیکن میری ایک شرط ہے کہ میں دس دن سے ایک دن بھی زیادہ نہیں رہوں گی۔''

''مجھے منظور ہے......'' سلطان نے کہا۔ ''مجھے اس بات سے بڑی خوشی ہوئی کہ تم نے ایک حقیقت پسند عورت کا ثبوت دیا۔''

''اس خوشی میں چائے یا شربت کا دور چلنا چاہئے۔'' میں نے کہا۔

''کیوں نہیں......'' سلطان نے کہا۔ ''ساجدہ بہت عمدہ چائے بناتی ہے۔ اس کے ہاتھ کی بنی ہوئی چائے نہ صرف مجھے بلکہ میرے آدمیوں کو بھی بہت پسند ہے۔ ساجدہ! تم جا کر ہمارے اور میرے تمام آدمیوں کے لئے چائے بنا لاؤ۔''

ساجدہ چائے بنانے کے لئے کمرے سے نکل گئی۔ کچھ دیر بعد چائے نہ صرف ہمیں بلکہ اُس کے تمام آدمیوں کو بھی پیش کر دی گئی۔ خالدہ چودھری نے کہا کہ وہ چائے نہیں پیتی، اس کے لئے کولڈ ڈرنک لایا گیا۔ ساجدہ نے بھی چائے نہیں پی۔ کوئی بیس منٹ کے بعد میں بھی اس بے ہوشی کی لپیٹ میں آ گیا۔

دوسرے دن ہوش آیا۔ سلطان پہلے ہوش میں آ چکا تھا۔ اُس نے بتایا کہ ساجدہ ملک اور خالدہ چودھری غائب ہیں۔ وہ دونوں ہوٹل ہی نہیں بلکہ ملک بھی چھوڑ چکی ہیں۔ سلطان نے معلوم کر لیا تھا۔

لیکن شیرازی موجود تھا۔ اُس سے رابطہ کیا گیا تو وہ اپنے ساتھ تین مسلح آدمیوں کے ہمراہ ہیرا لے کر پہنچا۔ یہ تینوں کمانڈوز تھے۔ جب اُس نے وہ ہیرا سلطان کے سامنے رکھا تو اُس کی آب و تاب آنکھوں کو خیرہ کرنے لگی۔ سلطان نے اس ہیرے کو اُٹھا کر دیکھا، اس کا بہت اچھی طرح سے معائنہ کیا اور اس کی قیمت دریافت کی۔

''دس لاکھ روپے......'' شیرازی نے خالص کاروباری لہجے میں کہا۔

''لیکن یہ دو ہزار روپے میں بھی بہت مہنگا ہے۔'' میں نے شیرازی کی طرف دیکھا۔

''کیا مطلب......؟'' شیرازی غرایا۔ اُس کی پیشانی پر لاتعداد شکنیں پڑ گئیں۔

''مطلب یہ کہ ہیرا نقلی ہے۔'' میں نے بڑے ٹھنڈے لہجے میں کہا۔

''تم کیسے جانتے ہو...... تمہارے پاس کیا ثبوت ہے؟'' شیرازی کا پارہ چڑھ گیا۔

''میں بھی ایک جوہری ہوں۔ اور لاہور میں میری ایک چھوٹی سی دُکان ہے۔ میں سنار ہوں۔ زیورات کی مرمت کا کام کرتا ہوں۔ اصلی نقلی ہیروں کی شناخت کر لیتا ہوں۔ ان کے متعلق میری معلومات بہت وسیع ہیں۔ بنکاک اور ہانگ کانگ میں ایسے ہیرے فٹ پاتھوں پر پندرہ بیس امریکی ڈالر میں مل جاتے ہیں۔'' میں اُس کا ذہن پڑھ چکا تھا۔ اُس نے یہ ہیرا بنکاک میں پندرہ ڈالر میں خریدا تھا۔

''تم جوہری نہیں بلکہ چمار ہو......'' اُس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ جلتی پر تیل گر گیا تھا۔ ''تمہارے باپ نے بھی کبھی ہیرے کی شکل دیکھی تھی؟ اگر کسی نے اسے نقلی ہیرا ثابت کیا تو میں اسے دس لاکھ روپے دینے کو تیار ہوں۔''

''اچھی طرح سوچ لیں مسٹر شیرازی!'' میں نے بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''کہیں آپ کو یہ شرط مہنگی نہ پڑے۔''

''یہ شرط مجھے نہیں تمہیں مہنگی پڑے گی۔'' وہ غرایا۔ ''اگر یہ ہیرا اصلی ثابت ہو گیا تو میں تمہاری ہڈی پسلی ایک کر دُوں گا۔''

''مجھے منظور ہے......'' میں نے پُرسکون لہجے میں جواب دیا۔ ''لیکن میں یہ بات جانتا ہوں کہ نقلی ہیرا ثابت ہونے پر آپ مجھے دس لاکھ کیا، دس روپے بھی نہیں دیں گے بلکہ میری جان کے دشمن بن جائیں گے۔''

شیرازی دل میں ششدر رہ گیا کہ میں نے اس کی بدنیتی کو کیسے تاڑ لیا؟ وہ اندر ہی اندر تلملا رہا تھا۔ اُس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ میری ہڈی پسلی ایک کر کے رکھ دے۔ وہ مجھے سلطان کا آدمی سمجھ کر میری باتوں کو برداشت کر رہا تھا۔ اُسے خبر تھی کہ سلطان زیر زمین دنیا کا خطرناک ترین شخص ہے۔ وہ میرا بال تک بیکا نہیں کر سکتا تھا۔

''مسٹر شیرازی!'' سلطان نے کہا۔ ''اگر یہ ہیرا نقلی ثابت ہو جاتا ہے تو آپ اسے دس لاکھ روپے دینے کے پابند ہوں گے۔ نقلی ثابت ہونے کی صورت میں، میں خود اس شخص کو عبرت ناک سزا دُوں گا۔ اسے آپ کے سامنے اُلٹا لٹکا کر اتنے کوڑے ماروں گا کہ اسے چھٹی کا دودھ یاد آ جائے گا۔''

''مسٹر شیرازی کے پاس ایسے دس نقلی ہیرے ہیں جو کوہ نور ہیرے کی نقل ہیں اور ان پر اصل کا دھوکہ ہوتا ہے۔ انہیں عام جوہری نقلی ثابت نہیں کر سکتا۔ مسٹر سلطان! آپ ان کا پہلا شکار ہیں۔ یہ ایسے شکار کی تلاش میں ہے کہ انہیں بیوقوف بنا کر فرار ہو جائے...... اخبارات میں کوہ نور ہیرا بیس لاکھ اسٹرلنگ پاؤنڈ میں نیلام اور چوری ہونے کی جو خبر شائع ہوئی اس میں کوئی صداقت نہیں ہے۔ یہ خبر مسٹر شیرازی کی مرہون منت ہے۔ یہ خبر اس لئے شائع کروائی گئی کہ دنیا والوں کی آنکھوں میں دُھول جھونکی جا سکے۔'' میں نے کہا۔

شیرازی اس طرح اُچھلا جیسے میں نے اُسے برقی جھٹکا دیا ہو۔ اُس کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ اُس کی کچھ میں نہیں آیا اور یہ سوچ کر اُس کا دماغ چکرانے لگا کہ یہ ساری باتیں میں کیسے جانتا ہوں؟ یہ راز کی باتیں مجھے کس نے بتائی ہوں گی؟ کہیں اس کی لبنانی محبوبہ تو نہیں جو ہوٹل میں اس کی بیوی کی حیثیت سے ٹھہری ہوئی ہے؟ لیکن اس کی بیوی تو یہاں کسی کو نہیں جانتی۔ وہ اس سے ابھی تک دس منٹ کے لئے جدا بھی نہیں ہوئی۔ اور پھر وہ فرانسیسی اور لبنانی کے سوا کوئی اور زبان نہیں جانتی ہے۔ اس کی محبوبہ کے علاوہ اس راز سے کوئی دوسرا شخص واقف نہیں ہے۔

اُس نے دیکھا اور محسوس کر لیا کہ اس کی دال یہاں نہیں گلے گی اس لئے اس نے یہاں سے نکل جانے میں ہی اپنی عافیت سمجھی۔ ہیرا نقلی ہے، نقلی ثابت ہو جائے گا تو وہ دس لاکھ روپے کیوں دے گا؟ کیا اسے کسی پاگل کتے نے کاٹا ہے؟ پھر اُس نے ہیرا اُٹھا کر جیب میں رکھ لیا اور جانے کے لئے اُٹھ کھڑا ہوا۔

''مسٹر شیرازی!'' سلطان نے کہا۔ ''آپ کہاں جا رہے ہیں؟ تشریف رکھیں، میں ابھی ٹیلی فون کر کے شہر کے سب سے بڑے جوہری مسٹر مانجی کو بلاتا ہوں۔ آپ اس کی باتیں نہ سنیں۔''

''مجھے ہیرا آپ کے ہاتھ نہیں بیچنا ہے۔ میرے پاس خریداروں کی کوئی کمی نہیں ہے۔ آپ کے اس آدمی نے میری سخت توہین کی ہے۔ آج تک میری کسی نے ایسی بے عزتی نہیں کی جو اس نے کی ہے۔ اس لئے میں جا رہا ہوں۔''

اتنا کہہ کر شیرازی رُکا نہیں اور تیزی کے ساتھ اپنے آدمیوں کو لے کر نکل گیا۔ اُس کے جاتے ہی سلطان مجھ پر برس پڑا کہ تمہیں کیا ضرورت تھی اپنی ٹانگ اڑانے کی......

تمہاری رخنہ اندازی کی وجہ سے میں ایک بڑے اور منافع بخش سودے سے محروم ہو گیا۔''

''آپ اس بات کے احسان مند کیوں نہیں ہیں کہ میں نے آپ کو ایک دھوکے باز، جعل ساز اور مکار شخص سے بچا لیا۔''

''نہیں...... وہ فراڈی نہیں تھا...... اُس کے پاس جو ہیرا تھا، وہ نقلی نہیں تھا، اصلی تھا۔'' سلطان نے تکرار کی۔

''اگر اُس کے پاس اصلی ہیرا تھا تو وہ چلا کیوں گیا؟ آپ نے مانجی کا نام لیا تو وہ بھاگ گیا۔ وہ جانتا ہے کہ پورے ملک میں مانجی واحد شخص ہے جو سونے اور ہیرے کی پرکھ میں اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ وہ مانجی کو بھی آزمانے گیا تھا۔ اُس نے ہیرا دیکھتے ہی کہہ دیا تھا کہ یہ نقلی ہے۔ بنکاک، ہانگ کانگ اور سنگاپور میں بھی ایسے ایسے ٹھگ موجود ہیں کہ وہ نقلی ہیروں کو اصل کہہ کر بیچتے ہیں اور لوگ ان کے فریب میں آ جاتے ہیں۔

''تمہاری بات میرے دل کو لگ رہی ہے...... تم نے یہاں آ کر اچھا کیا...... لیکن خالدہ چودھری اور ساجدہ ملک یہاں سے نکل گئیں، وہ دونوں بھی فراڈی تھیں۔ لیکن میرے دل میں یہ حسرت رہ گئی کہ خالدہ چودھری کو بستر کی زینت نہ بنا سکا۔''

''کیا اُن دونوں کے بارے میں کچھ پتہ چلا کہ وہ کہاں ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ دونوں اس ملک سے دبئی کے لئے روانہ ہو گئیں...... میرا آدمی بتا رہا تھا کہ ہوٹل والوں کو خالدہ چودھری نے جو غیر ملکی کرنسی دی وہ جعلی تھی۔ خالدہ چودھری کا اصل نام مہ ناز چودھری تھا۔ وہ خالدہ چودھری کے نام سے ٹھہری تھی۔

○

میں اپنے ہوٹل کے کمرے میں بیٹھا سوچ رہا تھا کہ کیا کروں......؟ سب سے پہلے میں نے فیصلہ کیا کہ کل یہ ہوٹل چھوڑ کر ایک درمیانے درجے کے ہوٹل میں کمرہ لے لوں۔ اب میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں؟ اپنے آپ کو کہاں تلاش کروں؟ مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ میں اپنے آپ کو ساری زندگی نہیں پا سکوں گا۔

پھر میں نے ایک فیصلہ کیا کہ کراچی میں ایک دو مہینے تک رہنے کے بعد لاہور چلا جاؤں۔ لاہور میں دو مہینے رہ کر اپنے آپ کو تلاش کیا۔ وہاں بھی ناکام رہا تو پھر راولپنڈی، پھر اسلام آباد...... باقی دوسرے بڑے شہروں کی خاک چھانی کہ شاید اپنے

آپ کو تلاش کر لوں، شاید میرا کوئی جاننے والا مل جائے۔ میرے پاس اتنی رقم تھی کہ چار پانچ برس تک میرا آسانی سے گزارہ ہو سکتا تھا۔

دوسرے دن صبح میں کراچی کی سڑکوں کی خاک چھانتا ہوا شیرٹن ہوٹل کی طرف آ نکلا۔ وہاں ایک نوادرات کی بڑی خوبصورت اور شاندار دُکان تھی۔ نجانے کیوں مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں ان نوادرات کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہوں۔ نوادرات میری بہت بڑی کمزوری ہیں۔

اگلے ہی لمحے میں نہ چاہتے ہوئے بھی دُکان میں داخل ہو گیا۔ دُکان میں تین لڑکیاں اور دو مرد سیلز مین تھے۔ میں نے اُن کے ذہنوں سے بہت کچھ معلوم کر لیا تھا۔ اس دُکان کی مالکن مقامی عورت تھی، اُس کا نام نسرین حمید تھا۔ میں اس وقت بہت صاف ستھرے اور قیمتی لباس میں تھا۔ ایک سیلز گرل جس کا نام شہناز تھا، وہ کاؤنٹر سے نکل کر تیزی سے میرے پاس آئی۔ وہ جتنی حسین تھی اُتنی ہی پُرکشش اور نفیس قسم کی بھی تھی۔ اُس نے مجھے بڑے تپاک سے سلام کیا اور شائستگی سے پوچھا۔ ''سر! میں آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں؟''

پہلے تو میں نے سوچا کہ اس سے کہوں کہ ملازمت کے سلسلے میں آیا ہوں اور بیگم صاحبہ سے ملنا چاہتا ہوں۔ پھر سوچا شاید اُس کی بیگم صاحبہ ملازمت کا سن کر ملنے سے صاف انکار کر دے۔ میں نے اُس سے کہا۔ ''میں آپ کی بیگم صاحبہ سے ملنا چاہتا ہوں۔ اُن سے ایک ضروری کام ہے۔''

''میں ابھی اُنہیں مطلع کئے دیتی ہوں......'' وہ مترنم لہجے میں بولی۔ ''اُنہیں آپ کا کیا نام بتاؤں؟''

''وہ مجھ سے واقف نہیں ہیں۔ میرا نام سالار ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

چند لمحوں کے بعد میں اُس کے دفتر میں موجود تھا۔ جب میں اندر داخل ہوا تو وہ میرے استقبال کے لئے کھڑی ہو گئی تھی۔ وہ پچاس برس کی قبول صورت اور بے حد پُرکشش عورت تھی۔ سفید ساڑھی اور بلاؤز میں اُس کا متناسب بدن خوب سج رہا تھا۔ وہ ایک تندمزاج کی عورت تھی۔ جب کوئی عورت خوب کماتی ہے اور اُس کے پاس دولت ہوتی ہے تو اُس کے اندر غرور اور تکبر پیدا ہو جاتا ہے۔ شہناز مجھے دفتر میں چھوڑ کر چلی گئی۔

اُس نے ملاقاتیوں کے لئے رکھی ہوئی کرسیوں کی طرف اشارہ کیا۔ میں بیٹھ گیا تو

اُس نے پوچھا۔ ''فرمائیے! میں کیا خدمت کرسکتی ہوں؟ آپ کو مجھ سے کیا کام ہے؟''

''جی...... میں ملازمت کے سلسلے میں حاضر ہوا ہوں۔'' میں نے بغیر کسی تمہید کے جواب دیا۔

''کیا......؟'' اُس کے چہرے پر تندی اور ناگواری پھیل گئی۔ وہ تنک کر بولی۔ ''میرے پاس کوئی ملازمت وغیرہ نہیں ہے۔ آپ تشریف لے جاسکتے ہیں۔''

''آپ نے میری قابلیت، صلاحیت اور خوبیوں کے بارے میں کچھ دریافت نہیں کیا؟'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''جب مجھے کسی ملازم کی ضرورت ہی نہیں ہے تو میں آپ کے کوائف معلوم کر کے کیا کروں گی؟'' وہ تیزی سے بولی۔

''آپ مجھے اپنے ہاں ملازم رکھیں یا نہ رکھیں لیکن میرا امتحان تو لے کر دیکھیں کہ میں کس قدر قابل انسان ہوں۔''

''آپ قابل ہوں گے تو ہوں گے...... میں کیا کروں؟'' وہ جھنجھلا گئی۔

''ویسے میرا دعویٰ ہے کہ آپ کو مجھ جیسا قابل شخص نہیں ملے گا جو دنیا کے تمام نوادرات کے بارے میں وسیع علم رکھتا ہے۔ میں آپ کے ہاں ملازمت کرنے کا اس لئے بھی خواہش مند ہوں کہ نوادرات میری کمزوری ہیں، مجھے ان سے ایک طرح کا جذباتی لگاؤ ہے۔ آپ کی دکان میں جو نوادرات ہیں وہ بہت انمول، قدیم اور بیش قیمت بھی ہیں۔'' میں نے کہا۔

''تم تو میرے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئے ہو۔'' اُس کا لہجہ تند ہو گیا۔ ''ایسا کرو...... تم کل شام کے وقت آ کر مجھ سے ملنا۔ اس وقت ایک صاحب آنے والے ہیں، میں نے اُنہیں وقت دیا ہوا ہے۔''

''غالباً شیرازی صاحب کوہ نور ہیرا بیچنے کے لئے آنے والے ہیں۔'' میں نے اُس کے ذہن سے معلوم کر کے کہا۔

''آپ یہ بات کیسے جانتے ہیں؟'' وہ حیران ہو کر بولی۔ ''دُکان میں تو کسی نے نہیں بتایا؟''

''کچھ دیر پہلے میں نے مسٹر شیرازی کو اُن کی لبنانی بیوی کے ساتھ بوتیک سے باہر آتے دیکھا تھا۔ میں شوکیس کے پاس کھڑا ملبوسات دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنی بیوی سے کہہ

رہے تھے کہ میں نے مسز نسرین حمید کو گیارہ بجے کا وقت دیا ہوا ہے۔ وہ کوہ نور ہیرا خریدنے میں دلچسپی رکھتی ہیں۔ میں تمہیں ہوٹل چھوڑ آتا ہوں۔ گیارہ بجنے میں ابھی کچھ دیر باقی ہے۔''

''یہ ایک محض اتفاق ہے جو یہ بات تمہارے علم میں آ گئی۔'' اُس نے حیرانی سے کہا۔

''لیکن میں یہ بات آپ سے عرض کر دُوں کہ مسٹر شیرازی جو ہیرا آپ کو فروخت کرنا چاہتے ہیں وہ نقلی ہے۔''

''میں اصلی نقلی کی خوب پہچان رکھتی ہوں۔'' وہ بولی۔ ''میں یہ دُکان بیس برس سے چلا رہی ہوں۔ میں نے ایک چیز بھی فالتو اور نقلی نہیں خریدی ہے۔ آج تک مجھے نہ تو کوئی دھوکہ دے سکا اور نہ ہی بیوقوف بنا سکا ہے۔ میرا روزانہ شاطر اور نوسربازوں سے بھی واسطہ پڑتا رہتا ہے۔ لیکن آپ یہ بات کیسے جانتے ہیں کہ ان کے پاس ہیرا نقلی ہے جو وہ مجھے فروخت کرنا چاہتے ہیں؟''

''کل وہ یہ ہیرا لے کر مسٹر مانجی کی دُکان پر گئے تھے، میں بھی وہاں موجود تھا۔ میں ایک دوست سے ملنے گیا تھا۔ وہ مجھے مانجی کے دفتر میں ملانے لے گیا تھا۔ چونکہ میں ہیروں کی پہچان رکھتا ہوں، میں نے دیکھتے ہی کہہ دیا تھا کہ یہ ہیرا نقلی ہے۔ مسٹر مانجی نے میری تصدیق کی تھی۔ وہ ہیرا واقعی نقلی تھا۔''

میں نے مبالغہ سے کام لیا تھا۔ دانستہ سلطان کا ذکر نہیں کیا تھا کیونکہ وہ بدک جاتی اور مجھے اُس کا آدمی سمجھتی اور مشکوک ہو جاتی۔ سلطان بدنام زمانہ آدمی تھا۔ اُسے کون نہیں جانتا تھا؟

''گویا تم ایک جوہری ہو؟'' نسرین حمید کو حیرت اور دلچسپی سی ہوئی۔

''میں جوہری تو نہیں ہوں لیکن ہیروں کی پہچان رکھتا ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''مجھ میں یہ خداداد صلاحیت موجود ہے۔ میں صرف ہیروں کو ہی نہیں کسی بھی چیز کو ایک نظر دیکھتے ہی بتا سکتا ہوں کہ یہ اصلی ہے یا نقلی۔''

''اگر ایسی بات ہے تو پھر تم کمال کے آدمی ہو......'' نسرین نے حیرت سے پلکیں جھپکائیں۔ ''لیکن میں تمہارا امتحان لوں گی...... کیا تم امتحان دینا پسند کرو گے؟ وہ آپ سے تم کے تخاطب پر آ گئی تھی۔''

''یوں نہیں......'' میں نے سر ہلایا۔ ''میں نے آپ سے پہلے ہی عرض کر دیا تھا کہ آپ مجھے پرکھ کر دیکھیں۔''

وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ اس تجوری کے پاس گئی جو کمرے کے ایک کونے میں موجود تھی۔ اُس میں نہ صرف وہ نوادرات بلکہ رقم بھی رکھتی تھی۔ وہ الماری کے پاس جا کر دروازے پر لگے ہوئے ڈائل کو گھما کر کوڈ نمبر سیٹ کرنے لگی۔ میں نے اُس کے ذہن سے تجوری کھولنے کا کوڈ نمبر معلوم کر لیا۔ اُس نے تجوری کا دروازہ کھولا، اُس میں بہت سارے خانے اور دو تجوریاں بھی تھیں۔ اُس نے ایک تجوری کھول کر اُس میں سے دو مخملی ڈبیاں نکالیں۔ ایک لال رنگ کی تھی دوسری جامن رنگ کی۔ اُس نے دونوں کھول کر میرے سامنے رکھ دیں۔

میں نے اُن دونوں ہیروں پر ایک نظر ڈالی۔ پھر میں نے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''جامنی رنگ کی ڈبیہ میں جو ہیرا ہے وہ نقلی ہے۔ اس کی قیمت پانچ سو روپے سے زیادہ نہیں ہے۔ مگر لال رنگ کی ڈبیہ میں جو ہیرا ہے وہ اصلی ہے۔ اس کی مالیت پچاس ہزار کی ہوگی، اس سے کم یا زیادہ بھی ہو سکتی ہے۔''

وہ ششدر سی ہو کر رہ گئی۔ پھر اُس نے پُرستائش نظروں سے مجھے دیکھا۔ ''واقعی تم بہت ماہر جوہری ہو۔ میں نے اپنی زندگی میں تم جیسا جوہری نہیں دیکھا۔ تمہاری جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ تم حیرت انگیز حد تک ذہین اور باصلاحیت شخص ہو۔ میں تمہاری معلومات عامہ کا ایک امتحان لینا چاہتی ہوں۔''

''آپ ایک نہیں دس امتحان لیں......'' میں نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہا۔

اُس نے تجوری کی ایک دراز سے دو مجسمے نکال کر میرے سامنے رکھ دیئے جو مہاتما گوتم بدھ کے تھے۔ اُس کی رنگت، بناوٹ اور ساخت میں معمولی سا فرق تھا۔

''یہ گندھارا آرٹ کے شاہکار ہیں۔'' میں کہنے لگا۔ ''گندھارا ماضی میں مختلف ثقافتوں کے ملاپ کا مرکز رہا ہے۔ مہاتما گوتم بدھ جو صرف اوتار تھے لیکن اُن کے عقیدت مندوں نے اُنہیں دیوتا بنا دیا۔ جب تک اُنہیں اوتار سمجھا جاتا تھا اُن کا کوئی بُت تراشا نہیں گیا۔ وہ دیوتا نہیں ایک برگزیدہ انسان تھے۔ لیکن جب اُنہیں دیوتا تسلیم کیا گیا تو اُن کے مجسمے تراشنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس کا رواج سب سے پہلے کنشک کے زمانے میں

ہوا جس کی نمائندگی گندھارا آرٹ کرتا ہے۔ بدھ کو الوہی حیثیت دے دی گئی اور فن کے ہر نمونے کی بنیاد بن گئے۔ یہاں بدھ کی تعلیمات میں نمایاں فرق آیا، اُن کے عقیدت مندوں نے لکڑی کی بجائے پتھر کو بولنے کے لئے ایک فصیح و بلیغ زبان عطا کی۔ پتھر کی سلوں کو صحیفوں کا سا تقدس دیا گیا۔ جس میں بدھا کی پوری زندگی کو ریکارڈ کر لیا گیا۔ گندھارا آرٹ کے افغانستان اور خصوصاً سوات میں پتھر کے مجسمے کثرت سے برآمد ہوئے ہیں۔ اور یوں محسوس ہوتا ہے ان علاقوں میں صنم تراشی کی ٹیکڑیاں کھلی ہوئی ہیں۔

یہ بھورے رنگ کا سنگی مجسمہ ہے جو دو ہزار برس قدیم ہے۔ یہ جو دوسرا مجسمہ ہے جو یونانی اور ایرانی فن کی آمیزش ہے، یہ دونوں مجسمے ان ہزاروں مجسموں میں سے ہیں جو کھدائی کے وقت برآمد ہوئے۔''

وہ میری باتیں سن کر دل میں عش عش کر اُٹھی تھی۔ میں نے اُس سے جو کچھ کہا وہ اُس کے ذہن میں نہیں تھا بلکہ میرے ذہن میں جانے کہاں سے یہ ساری باتیں آپ ہی آپ نازل ہونے لگی تھیں۔ میں خود اُس سے کہیں حیران تھا۔ یہ معلومات میرے ذہن کے کسی گوشے میں تھیں جو زبان پر آ گئی تھیں۔

''شیرازی کے آنے میں صرف سات منٹ باقی ہیں۔'' وہ دستی گھڑی میں وقت دیکھتی ہوئی بولی۔ ''کیا تم شیرازی کے سامنے موجود رہنا پسند کرو گے؟''

''جی نہیں......'' میں نے سر ہلایا۔ ''انہیں میری موجودگی سخت ناگوار گزرے گی۔ وہ میری شکل دیکھتے ہی چل دیں گے۔ آپ خود ہی اُس ہیرے کو دیکھ لیں، پھر آپ شیرازی سے کہیں کہ مانجی میرے دوست ہیں، آپ اجازت دیں تو میں مسٹر مانجی کو بلا کر یہ ہیرا دکھا دُوں......؟ وہ ان کا نام سنتے ہی اُڑن چھو ہو جائے گا۔ اس طرح آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ شیرازی ایک فراڈی شخص ہے۔''

اُس دفتر سے ایک ملحقہ کمرہ تھا جس میں ایک بستر تھا۔ وہ دوپہر کے وقت آرام کرتی تھی۔ اس میں ملحقہ باتھ رُوم بھی تھا، ایک ہینگر میں اُس کی نائٹی بھی لگی ہوئی تھی، مجھے اس کمرے میں بٹھا دیا گیا۔ شیرازی ٹھیک گیارہ بجے دفتر کے کمرے میں آیا۔ رسمی بات چیت کے بعد اُس نے ہیرا نکال کر نسرین حمید کے سامنے میز پر رکھ دیا۔ نسرین حمید نے اس ہیرے کو اُلٹ پلٹ کر دیکھا، پھر اُس سے پوچھا۔ ''اس کی کیا قیمت ہے؟''

''دس لاکھ روپے......'' شیرازی نے خالص کاروباری لہجے میں جواب دیا۔

''کیا دس لاکھ روپے بہت زیادہ قیمت نہیں ہے؟'' نسرین حمید نے ہیرے کو اُلٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے کہا۔

''محترمہ! یہ کوہ نور ہیرا ہے۔ اگر اسے لندن میں لے جا کر فروخت کیا جائے تو دس لاکھ پاؤنڈ مل سکتے ہیں۔''

''میں اسے صرف ایک شرط پر خرید سکتی ہوں۔'' اُس نے کہا۔

''کس شرط پر؟'' شیرازی نے اُسے حیرت سے دیکھا۔

''مسٹر مانجی میرے دوست اور مشیر بھی ہیں۔ جب میں سونا اور ہیرے جواہرات خریدتی ہوں تو اُنہیں ضرور دکھا لیتی ہوں۔ میں اُنہیں ٹیلی فون کر کے بلا لیتی ہوں تاکہ وہ اس ہیرے کو دیکھ لیں۔ وہ دس منٹ میں پہنچ جائیں گے۔''

شیرازی نے اُس کے ہاتھ سے ہیرا لے کر جیب میں رکھ لیا۔ پھر وہ اس طرح سے خوفزدہ ہو کر دفتر سے نکلا جیسے کوئی عفریت اُسے نگلنے والا ہو۔ اُس نے ایک لفظ بھی نسرین حمید سے نہیں کہا۔ اُس کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔

جب وہ چلا گیا تو نسرین حمید نے مجھے اپنے دفتر میں بلایا، پھر اُس نے مجھے ممنون نگاہوں سے دیکھا۔ ''تم نے مجھے ایک فراڈی کے ہاتھوں لٹنے سے بچا لیا...... واقعی وہ نقلی ہیرا ایسا تھا کہ بالکل اصلی دکھائی دے رہا تھا۔ میں بھی دھوکہ کھا گئی تھی۔ وہ ہیرا بالکل اصلی لگ رہا تھا۔ تم نے نہ بتایا ہوتا تو میں شاید خرید لیتی۔ ہیرا دیکھ کر پہلے میرے دل میں خیال آیا تھا کہ تم نے مجھ سے اس سلسلے میں غلط بیانی سے کام لیا ہے۔ جب میں نے مانجی کو یہ ہیرا دکھانے کے لئے کہا تو وہ فوراً ہی نکل گیا۔

''اب آپ میری ملازمت کے بارے میں کیا فرماتی ہیں؟ کیا میں اہل نہیں ہوں؟'' میں نے پوچھا۔

''تم آج بلکہ ابھی اور اسی وقت سے اپنے آپ کو ملازمت پر سمجھو!'' اُس نے جواب دیا۔ ''میں دو ہزار روپے ماہانہ تنخواہ دُوں گی...... تم ایک دن کی بھی چھٹی نہیں کرو گے...... چھٹی کی تو دو سو روپے کٹ جائیں گے۔''

دو ہزار روپے کی تنخواہ کا سن کر مجھے کوئی حیرت اور افسوس نہ ہوا اس لئے کہ نسرین حمید

خود غرض قسم کی عورت تھی۔ غصیلی قسم کی تھی۔ اُس کی دُکان میں جو سٹاف تھا ان کی تنخواہیں بھی کم تھیں جبکہ اس کی یومیہ آمدن ایک ڈیڑھ لاکھ کی تھی۔ کسی کسی دن تو تین چار لاکھ روپے بھی ہو جاتی تھی۔ ماہانہ آمدن مجموعی طور پر ایک کروڑ سے بھی تجاوز کر جاتی تھی۔ وہ خوب منافع لیتی تھی۔ دس ہزار کی چیز ایک لاکھ روپے میں فروخت ہوتی تھی۔ جیسی چیز، جیسا گاہک ویسا منافع بھی لیا جاتا تھا۔ منافع کی کوئی حد مقرر نہ تھی۔ لیکن وہ اپنے ملازمین کے سامنے ہمیشہ رونا رہتی تھی کہ کاروبار خسارے میں جا رہا ہے۔ اخراجات بہت زیادہ ہو گئے ہیں، خاطر خواہ منافع نہیں مل رہا ہے۔ سوچ رہی ہوں کہ کاروبار بند کر دُوں، دوسرا کاروبار کروں۔ وہ یہ باتیں اس لئے کہتی تھی کہ ملازمین تنخواہ میں اضافے کے لئے نہ کہیں، ایڈوانس رقم نہ مانگ لیں۔ اُس نے یہ دیکھنے کے لئے مجھے دو ہزار روپے تنخواہ کی پیشکش کی تھی کہ میرا کیا ردِعمل ہوتا ہے، میرے انکار پر پانچ سو روپے اور بڑھا دے گی۔ میرے خیال میں، میں دس ہزار روپے کی تنخواہ میں بھی مہنگا نہیں تھا۔ وہ لڑکیوں کو پانچ ہزار روپے اور لڑکوں کو چار ہزار روپے تنخواہ دے رہی تھی۔ ایک دن کی غیر حاضری کے دو سو روپے کاٹ لیتی تھی۔ وہ یہ دیکھ رہی تھی کہ میں کس قدر مجبور ہوں۔ یہ بڑے لوگ مجبوریوں سے فائدہ اُٹھانا اپنا حق سمجھتے ہیں۔

''میں پانچ ہزار روپے سے ایک روپیہ کم نہیں لوں گا۔'' میں نے کہا۔ ''آج کل ایک چپڑاسی کو بھی تین ہزار روپے سے کم تنخواہ نہیں ملتی ہے۔ دیکھا جائے تو میری تنخواہ دس ہزار روپے بھی کم ہے۔ لیکن چونکہ نوادرات سے مجھے جذباتی لگاؤ ہے اور میری بہت بڑی کمزوری ہے اس لئے پانچ ہزار روپے تنخواہ لوں گا۔''

وہ میری بات سن کر اندر ہی اندر بڑی جز بز ہوئی۔ اُسے توقع نہیں تھی کہ میں اس سے ایسی کھری کھری بات کروں گا۔ چونکہ وہ بھی گھاگ قسم کی عورت تھی، کاروباری تھی، نفسیات کی ماہر بھی تھی اس لئے اُس نے کہا۔ ''اس شہر میں اور بھی نوادرات کی دُکانیں ہیں۔ تم نے وہاں جا کر ملازمت کے حصول کی کوشش کیوں نہیں کی؟''

''اس لئے کہ آپ کی دُکان میں جو انتخاب ہے، جو انمول نوادرات ہیں وہ شہر کی کسی دُکان پر موجود نہیں ہیں۔''

''لیکن تمہیں سیلز مین شپ کا کوئی تجربہ نہیں ہے لہٰذا ایک ناتجربہ کار شخص کو اتنی تنخواہ

کیسے دی جا سکتی ہے؟''

''مجھے لاہور کی ایک نوادرات کی دُکان پر کام کرنے کا پانچ برس کا تجربہ ہے۔'' میں نے کہا۔ ''آپ کی دُکان میں سلومی کا کانسی کا جو مجسمہ رکھا ہوا ہے جس پر قیمت تیس ہزار روپے لکھی ہوئی ہے وہ تین ہزار سات سو روپے کا ہے۔ لاہور میں پانچ ہزار روپے میں فروخت ہو رہا ہے۔''

''لیکن میں نے اسے اٹھائیس ہزار روپے میں خریدا تھا۔'' نسرین حمید اندر ہی اندر پیچ وتاب کھا گئی۔ پھر اُس نے کہا۔ ''اصل بات یہ ہے کہ آج کل کاروبار بہت مندا ہے۔ اور پھر کراچی میں جو لوگ نوادرات لا کر بیچتے ہیں وہ بہت مہنگی ہوتی ہیں۔ تم اچھی طرح سوچ لو! میں تین ہزار روپے ماہانہ تنخواہ دے سکتی ہوں۔''

چونکہ میرے ذہن کی رسائی اُس کے ذہن سے ہو رہی تھی، اُس کے کاروباری ذہن اور فطرت سے میں پوری طرح واقف ہو چکا تھا اس لئے میں ایک دم سے اُٹھ کھڑا ہوا پھر بڑی شائستگی سے کہا۔ ''میں معافی چاہتا ہوں کہ میں نے آپ کا قیمتی وقت ضائع کیا۔ میں مسٹر مانجی کے پاس جا رہا ہوں۔ وہ ایک جوہری ہیں۔ وہ میری صحیح قدر کریں گے۔''

''اچھا...... تم ایک منٹ کے لئے تو بیٹھو!'' اُس نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ ''میں تمہیں پانچ ہزار روپے ماہانہ دُوں گی۔ لیکن میری ایک شرط ہے۔ تم دُکان میں کسی کو کسی چیز کی اصل قیمت کے بارے میں نہیں بتاؤ گے۔''

''نہیں...... میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گا، اپنے کام سے کام رکھوں گا۔ لیکن میڈم! میری بھی ایک شرط ہے۔''

''کیا شرط ہے تمہاری......؟'' نسرین حمید کے چہرے پر اُلجھن پیدا ہو گئی۔

''یوں تو میں کسی دن غیر حاضر تو کیا ایک گھنٹہ دیر سے بھی نہیں آؤں گا۔ لیکن اگر کسی سبب ایک دن غیر حاضر ہوا تو آپ دو سو روپے نہیں بلکہ ایک دن کی تنخواہ کاٹیں گی۔ اور پھر آپ اوور ٹائم بھی دیں گی۔''

میں ایک طرح سے اُس کی مجبوری بن گیا تھا۔ اس لئے وہ نہیں چاہتی تھی کہ میں اس کے ہاتھ سے نکل جاؤں۔ میں اُس کے لئے ایک ایسا نوادر تھا جو اُسے کبھی نہیں مل سکتا تھا۔ اس لئے بھی کہ جو بھی سیلز مین ملتے تھے وہ نوادرات کے بارے میں مجھ جیسی معلومات

اور تجربہ نہیں رکھتے تھے۔

''ٹھیک ہے......'' وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ ''چلو میں تمہیں اپنے سٹاف سے ملا دُوں۔''

پھر ہم دونوں دفتر سے نکل کر دُکان میں آئے۔ پھر اُس نے دونوں سیلز مینوں اور تینوں سیلز گرلز سے تعارف کرایا۔ وہ تعارف کرا کے اپنے دفتر میں چلی گئی۔ ان تینوں لڑکیوں میں شہناز ہی بہت خوبصورت تھی۔ اُس میں بڑی سادگی تھی اور پندارِ حسن بالکل بھی نہ تھا۔ اُس کا لباس بھی تہذیب کے دائرے میں تھا اور اُس کا میک اپ بہت ہی ہلکا اور نفیس قسم کا تھا۔ وہ ایک شائستہ، پُروقار اور نفیس قسم کی لڑکی دکھائی دیتی تھی۔ اس دُکان میں جتنے نوادرات تھے وہ ان سب میں انمول، منفرد اور بے مثال تھی۔

دوسری سیلز گرل کا نام نورین تھا۔ وہ بائیس برس کی تھی۔ وہ قبول صورت اور بے حد پُرکشش تھی۔ اُس نے اپنی جسمانی کشش اور نشیب و فراز کو نمایاں کرنے کے لئے لباس اور میک اپ کا سہارا لیا ہوا تھا تاکہ مرد اُس کی طرف متوجہ ہو سکیں۔ وہ اچھے کردار کی مالک نہیں تھی۔ اُس کے حلقے میں بہت سے دوست لڑکے تھے۔ شاہینہ بھی اُس کی عمر کی تھی۔ اُس کا جسم بھی بھڑکیلا تھا۔ وہ بھی حسین تھی۔ وہ لباس بھی تنگ اور چست پہنے ہوئے تھی۔ وہ دونوں اپنے آپ کو دنیا کی حسین ترین لڑکیاں سمجھتی تھیں۔ اس لئے کسی کو خاطر میں نہ لاتی تھیں۔ شاہینہ نے ایک امیر کبیر گھرانے کے لڑکے کو اپنی محبت کے جال میں پھانسا ہوا تھا۔ وہ دونوں اپنی بہت ساری ضروریات دوست لڑکوں سے پوری کر لیتی تھیں۔

شہناز کا تعلق متوسط گھرانے سے تھا۔ اُس کے بہت سارے مسائل تھے۔ وہ ایک بڑے کنبے کو پال رہی تھی۔ اُس کے والد حیات نہیں تھے۔ اُس سے دو چھوٹی بہنیں اور دو بھائی تھے۔ وہ دُکان سے گھر جانے کے بعد رات بارہ ایک بجے تک ماں اور ایک چھوٹی بہن کے ساتھ مل کر سلائی کرتی تھی تاکہ گھر کے اخراجات پورے ہو سکیں۔ وہ بس سے دُکان آتی جاتی تھی۔ جبکہ نورین اور شاہینہ رکشہ ٹیکسی سے کم بات نہیں کرتی تھیں۔

دونوں مرد سیلز مین اقبال اور ناصر بہت مخلص اور بے لوث قسم کے تھے۔ وہ مجھ سے مل کر بہت خوش ہوئے تھے۔ اُنہیں اس بات سے بھی خوشی ہوئی تھی کہ مجھے ملازم رکھ لیا گیا ہے۔ جبکہ نورین اور شاہینہ نے ناک بھنویں چڑھائیں تھیں کہ مجھے ملازم کس لئے رکھ لیا گیا ہے؟ اور حیرت بھی ہوئی تھی کیونکہ اُن کی باس جنہیں وہ سب میڈم کہتے تھے وہ زیادہ

ملازم رکھنے کی قائل نہ تھی۔ دفتر میں جو چپڑاسی تھا اُس کا نام عباس تھا۔ اُس کی عمر ستر برس کی ہو گی۔ وہ اس عمر میں بھی چاق و چوبند تھا۔ ایک سیدھا سادھا اور پنج وقتہ نمازی تھا۔ اُس کا نماز پڑھنا میڈم کو بہت کھلتا تھا۔ وہ اُسے دو ہزار روپے تنخواہ دیتی تھی۔ وہ غریب بھی مجبوری میں ملازمت کر رہا تھا۔

میڈم نے شہناز کے ذمہ یہ ڈیوٹی لگائی تھی کہ وہ مجھے دُکان میں رکھی ہوئی ایک ایک نوادرات کے بارے میں تفصیل سے بتا دے۔ جب میں نے اُسے ان کے بارے میں بتانا شروع کیا تو اُسے جیسے یقین نہیں آیا۔ وہ دنگ سی رہ گئی۔ پھر اُس نے حیرانی سے کہا۔

''ایسا لگ رہا ہے کہ آپ اس دُکان میں برسوں سے ملازمت کر رہے ہیں۔''

''چونکہ میں ایک نوادرات کی دُکان میں برسوں کام کر چکا ہوں اس لئے میرے لئے یہ نوادرات نئے نہیں ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''میں ان کے پس منظر اور ان کے تعلق سے واقف ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

''آپ نے ہم سب کی مشکل آسان کر دی۔'' وہ خوش دلی سے بولی۔ ''آپ کا تجربہ بہت زیادہ معلوم ہوتا ہے۔''

''دراصل نوادرات میری بہت بڑی کمزوری ہیں۔ اس لئے بھی تجربہ اور معلومات بہت وسیع ہیں۔''

''یہ جو گل کاریاں اور کندہ کاریاں اس لکڑی، کھال اور چمڑے پر ہیں ان کے بارے میں کیا جانتے ہیں؟'' نورین نے میرا امتحان لینے کے خیال سے ان تینوں چیزوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نخوت کے انداز سے پوچھا۔

''یہ سب گندھارا آرٹ کے شاہکار ہیں۔ یہ کوئی دو سو برس قدیم ہیں۔ آج بھی اس قسم کی گل کاریاں کندہ کی جا رہی ہیں۔ یہ سلسلہ صدیوں سے چلا آ رہا ہے اور تا ابد تک جاری رہے گا۔'' میں نے جواب دیا۔

یہ نوادرات کی دُکان اس لئے بھی خوب چلتی تھی کہ ایک مشہور و معروف فائیو سٹار ہوٹل کی دُکان میں بڑی خوب صورتی اور نہایت آراستہ و پیراستہ طریقے سے نوادرات سجائے ہوئے تھے۔ اس ہوٹل میں اور آس پاس جو ہوٹل تھے اس میں بھی غیر ملکی سیاح آ کر ٹھہرتے تھے۔ اس کے علاوہ دولت مند طبقہ بھی خریداری کے لئے آتا تھا۔ سب سے

زیادہ خرید و فروخت غیر ملکی سیاح کیا کرتے تھے۔ وہ غیر ملکی کرنسی میں خریداری کرتے تھے جس میڈم کے وارے نیارے ہو جاتے تھے۔ اس دُکان کی پبلسٹی ملکی اور غیر ملکی رسائل میں ہونے کی وجہ سے اُس کی دُکان پر گاہک بہت آتے تھے۔

مجھ پر ایک انکشاف اور ہوا کہ میں نہ صرف انگریزی بلکہ فرانسیسی اور جرمن زبان بھی شستہ اور روانی سے بول سکتا تھا۔ اُن کے لب و لہجے میں بات کر سکتا تھا۔ وہ اس طرح سے معلوم ہوا تھا کہ ایک فرانسیسی جوڑا مہاتما گوتم بدھ کے مجسمے کے بارے میں شہناز سے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں دریافت کرنے لگا تو وہ اُسے سمجھانے سے قاصر تھی۔ اس وقت میڈم بھی کسی کام سے دفتر میں موجود نہیں تھی۔ میں شہناز کے پاس ہی کھڑا تھا۔ میں غیر اختیاری طور پر اُس جوڑے کے پاس گیا، پھر اُسے فرانسیسی زبان میں اس مجسمے کے بارے میں بتانے لگا۔ وہ دونوں خوش ہو گئے۔

''کیا تم فرانسیسی ہو......؟'' اُس عورت نے مجھے اُوپر تے نیچے تک حیرت و خوشی بھری نظروں سے دیکھا۔

''نہیں......'' میں نے سر ہلایا۔ ''میں پاکستانی ہوں۔''

''مجھے یقین نہیں آ رہا کہ تم پاکستانی ہو۔'' فرانسیسی مرد نے مجھ سے کہا۔

''وہ کس لئے موسیو؟'' میں نے مسکراتے ہوئے اُس سے سوال کیا۔

''اس لئے کہ تمہارا لب و لہجہ بتا رہا ہے کہ تم فرانسیسی ہو۔'' مرد کہنے لگا۔ ''ایک شخص کوئی بھی زبان کتنا ہی سیکھ لے اور اسے کتنی ہی مہارت حاصل ہو جائے وہ اس قدر شستہ زبان بول ہی نہیں سکتا۔ تم اس طرح فرنچ بول رہے ہو جیسے یہ تمہاری مادری زبان ہو۔''

''شکریہ...'' میں نے کہا۔ ''میں نے اپنی صلاحیت سے اس زبان کے بولنے پر عبور حاصل کیا ہے۔ میں اپنی اس کوشش میں کس قدر کامیاب ہوا ہوں؟ یہ آپ ہی بتا سکتے ہیں۔''

''ہمیں تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔'' عورت نے پُرستائش نظروں سے مجھے دیکھا۔

''تم سے بات کر کے ایسا محسوس کر رہی ہوں جیسے میں اپنے ملک میں ہوں۔ تین ماہ کی سیر و سیاحت کے دوران مجھے پہلی بار اتنی اچھی فرنچ سننے کا موقع ملا ہے۔''

ان دونوں نے خاصی خریداری کی۔ پھر مجھے سو فرانک کا ایک نوٹ بخشش کے طور پر دیا جو میں نے شکریہ ادا کرتے ہوئے قبول کر لیا۔ نسرین حمید اور دوسرے دونوں سیلز مین اور

تینوں سیلز گرلز مجھے حیرت سے دیکھ رہی تھیں۔ اُن کے نکلتے ہی ایک جرمن جوڑا داخل ہوا اور سیدھا شہناز کے کاؤنٹر پر آیا۔ وہ بھی انگریزی سے نابلد تھا اور جرمن بول رہا تھا۔ میں اُن کی طرف بڑھا۔ پھر میں جرمن زبان بولنے لگا جس پر مجھے سخت حیرت ہوئی۔

میری زبان سے جرمن زبان سن کر دونوں میاں بیوی بہت خوش ہوئے۔ اُنہیں بھی یقین نہیں آیا کہ میں پاکستانی ہوں۔ وہ مجھے جرمن نژاد ہی سمجھتے رہے۔ اُنہوں نے بھی زبردست خریداری کی۔ اس شخص کی بیوی نے بھی سو مارک کا ایک نوٹ مجھے بطور ٹپ دیا۔

ان دو غیر ملکی زبانوں سے واقفیت نے میڈم کو مجھ سے بہت مرعوب اور متاثر کر دیا تھا۔ وہ بہت حیران ہو رہی تھی کہ میں کیا چیز ہوں۔ اس جرمن جوڑے کے جانے کے بعد میڈم نے مجھ سے کہا۔ ''سو فرانک اور سو مارک کا نوٹ جو ٹپ میں ملا ہے وہ مجھے دے دو۔''

''وہ کس لئے......؟'' میں نے اُس کے چہرے پر نظریں مرکوز کر کے پوچھا۔

''اس لئے کہ اس ٹپ پر بھی میرا حق بنتا ہے...... جو بھی ٹپ غیر ملکی سے اور غیر ملکی کرنسی میں ملتی ہے وہ مجھے دے دی جاتی ہے۔ یہ اس دُکان کا اصول ہے۔ کوئی ٹپ وصول کر کے جیب میں نہیں رکھ سکتا۔''

''کسی بھی لحاظ سے آپ اس ٹپ کی حقدار نہیں ہیں۔'' میں نے صاف لہجے میں کہا۔ ''آپ کا یہ اصول غلط ہے۔ کیونکہ یہ حق صرف ملازمین کا ہے بلکہ اس کا ہے جسے یہ ٹپ ملتی ہے۔ میں آپ کو یہ ٹپ نہیں دے سکتا۔ یہ مجھے اپنی سیلز مین شپ کی وجہ سے ملی ہے۔''

نسرین حمید کو توقع نہیں تھی کہ میں اُسے اُس کے منہ پر صاف صاف سنا دوں گا۔ وہ پیچ و تاب کھا گئی۔ اُس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ نرم پڑ گئی کہ مجھے دو غیر ملکی زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ اور اُس کی دُکان میں یورپی سیاح بہت آتے تھے۔ اسی وقت تین عرب شیخ اندر داخل ہوئے تو شہناز اُن کی طرف بڑھی۔ وہ عربی کے سوا کوئی اور زبان نہیں جانتے تھے کیونکہ مجھے اس وقت ایسا لگا کہ میں عربی زبان سے بھی واقف ہوں۔ یہ ناقابل یقین سی بات تھی۔

اُن شیخوں کو بھی میں نے ہی ڈیل کیا۔ اُنہوں نے کوئی سات لاکھ روپے کا مال خریدا۔ میری عربی سے اس قدر خوش ہوئے کہ ایک ہزار ریال بخشش کے طور پر دے دیئے۔ میڈم اندر ہی اندر خار کھا گئی۔ اُن کے جانے کے بعد پھر اُس کی ہوسِ زر عود آئی۔

''سالار! تم ساری ٹپ مجھے دے دو۔''

''آئی ایم سوری میڈم......'' میں نے کہا۔ ''آپ یہ مت بھولیں کہ میری وجہ سے ان تینوں غیر ملکیوں نے زبردست خریداری کی...... اصولی طور پر آپ کو چاہئے کہ اس سیل پر مجھے دس فیصد کمیشن دیں۔''

''تم اس دُکان کے اصول کی خلاف ورزی کر رہے ہو۔ تمہیں ٹپ دینا ہو گی۔'' وہ برافروختہ ہو گئی۔

''آپ اپنا اصول اپنے پاس رکھیں۔'' میں نے تیزی سے کہا۔ ''میں نے آپ کو دس لاکھ روپے کی چوٹ پڑنے سے بچایا۔ میں نہ ہوتا تو آپ نقلی ہیرا خرید چکی ہوتیں۔ اس کے علاوہ ایک ڈیڑھ گھنٹے کی سیل میں آپ نے چھ لاکھ روپے کا خالص منافع کما لیا۔ آپ سے اتنا بھی نہیں ہوا کہ اس خوشی میں سٹاف کو لنچ منگوا کر کھلائیں۔ لنچ کھلانے کی بجائے آپ ٹپ بھی وصول کر لینا چاہتی ہیں۔ میں جا رہا ہوں۔ اس ہوٹل میں جو شیخ اینٹکس کی دُکان ہے میں اُس میں جا کر ملازمت کروں گا۔ وہ مجھ جیسے شخص کو آپ سے اچھی تنخواہ دیں گے اور مراعات بھی......''

''تم مجھے بلیک میل کر رہے ہو......؟'' نسرین حمید نے تیز لہجے میں کہا۔

''میں بلیک میل نہیں کر رہا ہوں بلکہ اصول کی بات کر رہا ہوں۔ آپ ہی سب کچھ سمیٹ لینا چاہتی ہیں۔ آخر ہم غریب لوگوں کو بھی کچھ کمانے دیں۔ آخر آپ کے پاس کس چیز کی کمی ہے جو آپ نے اس ٹپ کو انا کا مسئلہ بنا لیا ہے؟ اچھا...... اب آپ مجھے اجازت دیں۔ مجھے آپ کے ہاں ملازمت نہیں کرنی ہے۔''

میری اس دھمکی سے اُس کی عقل ٹھکانے آ گئی۔ وہ ایک دم سے نرم پڑ کر بولی۔ ''میں تو مذاق کر رہی تھی۔ یہ ٹپ تم رکھو! میں تم سب کے لئے لنچ، آئس کریم اور سویٹ ڈش منگواتی ہوں۔''

اتنا کہہ کر وہ تیزی سے دفتر کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ جب وہ اندر چلی گئی تو اقبال نے بڑی آہستگی سے کہا۔ ''آپ نے ہماری میڈم کا دماغ درست کر کے رکھ دیا...... مجھے کتنی خوشی ہوئی، بتا نہیں سکتا۔''

''میڈم ایک کروڑ پتی خاتون ہیں...... لیکن ان کا گھٹیا پن دیکھیں کہ ہمیں جو ایک سے

دس ڈالر یا سو دو سو روپے کی ٹپ بھی ملے تو وہ بھی ہتھیا لیتی ہیں۔'' ناصر نے کہا۔ ''جبکہ اس ٹپ پر اس کا حق ہے جسے ملے۔ ہم ٹپ کے دس روپے تک اپنے پاس نہیں رکھ سکتے۔ یہ ظلم ہے۔ سراسر زیادتی ہے۔''

''یہ میڈم کی دُکان ہے اور اس کی ہر قسم کی آمدنی کی بخشش پر ان کا حق ہے۔'' نورین نے کہا۔ ''میڈم ہم سب کے لئے لنچ منگوا رہی ہیں اس کے باوجود تم لوگ اُن کی برائی کر رہے ہو؟''

''تم میڈم کی حمایت میں اس لئے بول رہی ہو کہ تم اُن کی کسی رشتہ دار کی جاننے والی ہو'' ناصر نے کہا۔

''میں اس لئے ان کی حمایت میں بول رہی ہوں کہ ان کا نمک کھاتی ہوں۔'' نورین نے تڑ سے جواب دیا۔

''نمک تو ہم سب کھا رہے ہیں۔'' اقبال نے کہا۔ ''ہم نے کبھی نمک حرامی نہیں کی۔ اُن سے صرف یہ شکایت ہے کہ وہ ہماری ٹپ ہم سے لے لیتی ہیں جو کہ صرف ہمارا جائز حق ہے۔ یہ اصول بالکل غلط ہے۔''

''میں بخشش کو اچھا نہیں سمجھتی ہوں۔ وہ لے لیتی ہیں لینے دو۔ اس میں برا ماننے والی کیا بات ہے؟'' نورین تنک کر بولی۔

''لیکن میڈم تو اسے بہت اچھا سمجھتی ہیں اس لئے وہ ہڑپ کر لیتی ہیں۔'' اقبال نے تکرار کی۔ ''ہم ٹپ گاہکوں سے مانگتے نہیں ہیں، غیر ملکی سیاح اپنی خوشی اور مرضی سے ٹپ دیتے ہیں کیونکہ ان کے ہاں اس کا رواج ہے۔ چونکہ ٹپ غیر ملکی کرنسی میں ہوتی ہے اس لئے میڈم کا دل اس پر آ جاتا ہے۔''

''تم میڈم کی بے عزتی کر رہے ہو......؟'' نورین نے ہذیانی لہجے میں کہا۔

''اس میں بے عزتی کی کیا بات ہے؟'' ناصر نے کہا۔ ''کیا یہ حقیقت نہیں ہے......؟ آخر تم کس لئے میڈم کی اتنی حمایت کر رہی ہو؟''

''اس لئے کہ میڈم نے اسے اپنا مخبر بنایا ہوا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''وہ اس سے رتی رتی کی باتوں کی خبر لیتی رہتی ہیں۔'' میں نے کہا۔

نورین دل میں بھونچکی ہو کر اور خود کو سنبھالتے ہوئے تیزی سے بولی۔ ''یہ جھوٹ ہے

اور مجھ پر جھوٹا الزام ہے۔''

''میرا خیال ہے کہ ہم اس بحث کو ختم کریں۔'' شہناز نے کہا۔ ''ہم لوگ ملازم ہیں۔ ہمیں اپنے کام سے کام رکھنا چاہئے۔ آپس میں تلخی پیدا نہ کریں۔ کیونکہ ہم سب یہاں گھر کے ایک فرد کی طرح ہیں۔''

''میں ایک بات اور بتا دُوں...... مالک کبھی ملازم کا نہیں ہوتا۔ ہم لاکھ اس کی خیر خواہی کر لیں، کیوں نہ لاکھوں کا فائدہ پہنچائیں، وہ کسی بھی بات پر دودھ میں گری مکھی کی طرح نکال کر پھینک دے گا۔ برسوں کی خدمات کو پل بھر میں فراموش کر دے گا۔ لاکھوں میں ایک مالک ایسا ہوتا ہے جو ملازم کی قدر کرتا ہے۔ لہٰذا ہمیں میڈم سے زیادہ خلوص برتنے کی ضرورت ہے اور نہ ہی کام میں کوئی کوتاہی کریں۔ بلکہ ہم اپنی اپنی اوقات میں رہیں۔ ان سے زیادہ توقعات وابستہ نہ کریں اور نہ ہی خواب دیکھا کریں۔'' میں نے کہا۔

''آپ ہم سب کو میڈم کے خلاف بدظن کر رہے ہیں۔'' شاہینہ نے برہمی کے انداز میں کہا۔ ''آپ کو کیا معلوم کہ میڈم کتنی اچھی عورت ہیں، ہمارا کتنا خیال کرتی ہیں۔ وہ ہمیں جو تنخواہ دیتی ہیں اس سے ہم خوش اور مطمئن ہیں۔''

''مجھے بدظن کرنے سے کیا حاصل ہوگا......؟'' میں نے جواب دیا۔ ''لیکن میں اتنا جانتا ہوں کہ میڈم نے تین چار برسوں میں کروڑوں کما لئے لیکن اُنہوں نے آپ کو کیا دیا؟ ایک لاکھ کیا...... ایک ہزار روپے دیئے؟ بونس تک نہیں دیا۔ ایک مکان تک خرید کر نہیں دیا۔ جبکہ خود اُس نے دو کوٹھیاں بنا لیں اور لاکھوں کی مالیت کی گاڑیاں بھی خرید لیں۔ ایسی مالکن کو کون ملازم کا خیر خواہ کہہ سکتا ہے؟''

چونکہ اس وقت گاہک دُکان میں داخل ہوئے تھے اس لئے ہم سب اپنے اپنے کاؤنٹر پر چلے گئے۔

میڈم نے جو لنچ منگوایا وہ درمیانہ درجے کے ہوٹل سے تھا۔ آئس کریم اور سویٹ ڈش بھی خاص نہ تھی۔ چھٹی سے تھوڑی دیر پہلے شہناز میڈم کے دفتر میں گئی۔ وہ تھوڑی دیر بعد باہر نکلی تو اُس کا چہرہ پھول کی طرح مرجھایا ہوا تھا اور اُس کی آنکھوں میں گہری اُداسی تھی۔

دُکان مقفل کرنے کے بعد میڈم اپنی کیڈلک گاڑی میں چلی گئی۔ اقبال کے پاس اسکوٹر تھا۔ ناصر بھی اُس کے ساتھ آتا جاتا تھا۔ نورین اور شاہینہ ٹیکسی کر کے چلی گئیں۔ اُنہوں

نے جھوٹے منہ بھی شہناز کو لفٹ نہیں دی۔ شہناز بٹ سٹاپ کی طرف روانہ ہوئی تو میں بھی اُس کے ہمراہ ہولیا۔ بس سٹاپ کے پاس ایک ریسٹورنٹ تھا۔ ہم دونوں نے بڑی خاموشی سے راستہ طے کیا تھا۔ وہ بڑی متفکر اور پریشان سی تھی۔ میں نے اُس سے پوچھا۔

''کیا آپ میرے ساتھ ایک کپ چائے پینا پسند کریں گی؟''

''مجھے جلدی ہے کیونکہ امی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔'' اُس نے افسردگی سے کہا۔ ''پھر کسی اور دن سہی۔''

''میں زیادہ وقت نہیں لوں گا۔'' میں نے کہا۔ ''مجھے آپ سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔''

''کیا یہ باتیں کل نہیں ہوسکتیں؟'' اُس نے اپنی منجمد آنکھوں سے مجھے دیکھا۔

''بڑے لوگ کہہ گئے ہیں کہ آج کا کام کل پر مت ڈالو......'' میں مسکرایا۔ ''یہ بہت ہی ضروری باتیں ہیں۔''

وہ میرے ساتھ بادل نخواستہ ریسٹورنٹ میں داخل ہوگئی۔ یہ ایئر کنڈیشنڈ تھا۔ میں اُسے ایک کونے والی میز پر لے آیا۔ چائے کا آرڈر دینے کے بعد میں نے بغیر کسی تمہید کے کہا۔ ''آپ مجھے ایک مخلص دوست سمجھ کر سچ سچ بتائیں کہ آپ کس لئے اتنی پریشان ہیں...... امی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اس وجہ سے یا کسی اور وجہ سے......؟''

''امی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ اور پھر مکان کا دو ماہ کا کرایہ بھی باقی ہے۔ مالک مکان، مکان خالی کرنے کے لئے کہہ رہا ہے۔''

''آپ میڈم سے کتنی رقم ایڈوانس لینے گئی تھیں جو اُس نے انکار کر دیا؟'' میں نے پوچھا۔

''میں نے میڈم سے تین ہزار ایڈوانس مانگے اور کہا کہ تنخواہ ملنے میں صرف پانچ دن باقی ہیں اس لئے آج دے دیں۔ مگر میڈم نے صاف انکار کر دیا جبکہ میں نے تین برسوں میں پہلی بار ایڈوانس رقم مانگی تھی۔'' وہ دل گرفتہ لہجے میں بولی۔ ''آپ کو کیونکر علم ہوا کہ میں ایڈوانس لینے گئی تھی اور اُنہوں نے انکار کر دیا؟''

''آپ کے چہرے سے......'' میں نے جواب دیا۔ ''آپ اللہ کی ذات سے مایوس اور دلبرداشتہ نہ ہوں۔ وہ بڑا کارساز ہے۔ یہ لیجئے!'' میں نے اُس کی طرف ایک لفافہ بڑھایا۔

''اس میں کیا ہے؟'' اُس نے حیرت سے لفافے کی طرف دیکھا۔ ''کیا اس میں رقم ہے؟''

''جی ہاں...... اس میں اتنی رقم ہے کہ آپ کی ضرورت پوری ہو جائے گی۔'' میں نے جواب دیا۔

''آپ کا بہت بہت شکریہ......'' وہ خوش ہو کر بولی۔ ''جس روز تنخواہ ملے گی اسی روز آپ کو ساری رقم ادا کر دوں گی۔''

''اسے لوٹانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ کیونکہ یہ رقم میری نہیں بلکہ آپ کی امانت ہے۔''

''میری رقم......؟ کون سی رقم......؟'' اُس نے حیرت سے پلکیں جھپکائیں۔

''یہ ٹپ کی رقم ہے۔ اس میں فرانک، مارک اور ریال ہیں۔'' میں نے اُسے بتایا۔

''لیکن یہ ٹپ میری کیسے ہوئی؟ یہ تو آپ کو ملی ہے۔ میں اسے نہیں لوں گی۔'' اُس نے کہا۔

''یہ ٹپ مجھے آپ کے کاؤنٹر پر ملی ہے لہٰذا آپ اس کی حقدار ہیں...... اسے رکھ لیں۔ مجھے ابھی اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میرے پاس اللہ کا دیا بہت کچھ ہے۔ میں نے یہ ملازمت محض اپنے شوق کی خاطر کی ہے۔''

''میں نے بہ دقت تمام یہ غیر ملکی کرنسی اُسے لینے پر آمادہ کر لیا۔ میرے اس خلوص پر اُس کی آنکھیں بھر آئیں تو میں نے کہا۔ ''نہ...... نہ...... رونے کے لئے یہ جگہ مناسب نہیں ہے۔ آپ گھر جا کر جتنا چاہیں رولیں۔''

وہ میری بات سن کر بڑے زور سے ہنس پڑی۔

میں اُسے ریسٹورنٹ سے باہر لے کر آیا۔ سیدھا منی چینجر کے ہاں پہنچا، غیر ملکی کرنسی کو ملکی کرنسی میں کیش کرایا پھر اُسے ٹیکسی میں لے جا کر اُس کے گھر چھوڑا۔ اُس نے مجھ سے بہت کہا کہ میں کھانا کھا کر جاؤں لیکن میں شکریہ ادا کر کے اپنے ہوٹل چلا آیا۔

میں رات بھر شہناز کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس بھولی بھالی اور موہنی صورت کی لڑکی نے مجھ پر جادو کر دیا تھا۔ یہ پہلی لڑکی تھی جو مجھے بہت پسند آئی تھی۔ میں نے اس وقت یہ سوچا کہ...... کاش! مجھے میرے گھر والے مل جائیں، میں اپنے آپ کو تلاش کر لوں تو اسے اپنا جیون ساتھی بنا لوں۔ شہناز میری پسند اور معیار کی لڑکی تھی۔

میں نے پیچھے پلٹ کر دیکھا۔ مجھے جن لوگوں سے واسطہ پڑا تھا وہ سارے کے سارے سیاہ کار، دھوکے باز اور غلط قسم کے تھے۔ خطرناک اور ریاکار بھی تھے۔ مجھے جن حالات اور واقعات سے واسطہ پڑا تھا میں اُن سے بال بال بچا تھا۔ میں اب تک اپنی منزل پر نہیں پہنچ سکا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ میری منزل کہاں ہے؟ میں اندھیرے میں کھڑا تھا۔

دوسرے دن میں شہناز سے پہلے ہی دُکان پہنچ گیا۔ وہ آئی تو بہت خوش تھی۔ اُس کا چہرہ گلنار ہو رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں ہزاروں برقی قمقموں کی روشنی تھی۔ خوشی نے اُس کے چہرے پر ایک نکھار سا پیدا کر دیا تھا۔ ایک کاؤنٹر پر میری اور شہناز کی ڈیوٹی تھی، دوسرا کاؤنٹر نورین اور شاہینہ نے اور تیسرا کاؤنٹر اقبال اور ناصر نے سنبھالا ہوا تھا۔ ان دونوں کاؤنٹروں پر خریدار نوادرات دیکھنے میں مصروف تھے۔

''میری امی آپ کی بے حد ممنون و مشکور ہیں۔'' شہناز نے شگفتگی سے کہا۔ ''انہوں نے کہا ہے کہ آپ کی اس بروقت مدد نے ہماری لاج رکھ لی۔ ورنہ جانے ہمارا کیا حشر ہوتا...... امی آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔''

''وہ کس لئے......؟'' میں نے پوچھا۔

''اس لئے کہ محسن کو دیکھیں...... شکریہ ادا کریں۔'' اُس نے جواب دیا۔

''میں نہ تو محسن ہوں اور نہ ہی میں نے آپ کی مدد کی ہے۔ اس میں کوئی خاص جذبہ کارفرما ہے۔'' میں نے کہا۔ ''میں کسی دن آپ کی والدہ سے ملنے ضرور آؤں گا...... اس لئے کہ مجھے ممتا کی چھاؤں کی ضرورت ہے۔ میں اس دنیا میں......'' ایک گاہک آنے کی وجہ سے میری بات ادھوری رہ گئی۔

شام کے وقت دُکان سے نکل کر ہم دونوں ایک ریسٹورنٹ میں آ گئے۔ اُس نے کہا۔ ''آپ نے دُکان میں مجھ سے کہا تھا کہ مجھے ممتا کی چھاؤں کی ضرورت ہے۔ میں اس دنیا میں...... گاہک آنے کی وجہ سے آپ بات ادھوری رہ گئی تھی۔''

''میں اس دنیا میں اکیلا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''میں اپنے والدین اور گھر والوں کو تلاش کر رہا ہوں۔ معلوم نہیں وہ زندہ ہیں یا نہیں...... اگر زندہ ہیں تو کہاں ہیں۔''

''میں کچھ سمجھی نہیں۔'' وہ تحیر زدہ لہجے میں بولی۔ ''کیا آپ کو نہیں معلوم کہ آپ کا گھر کہاں ہے؟''

''جی نہیں......'' میں نے سر ہلایا۔

''عجیب سی بات ہے۔'' اُس کے حسین چہرے پر گہرا استعجاب چھا گیا۔ ''آپ کو والدین کا نام تو یاد ہوگا۔''

''اصل بات یہ ہے کہ میں اپنی یادداشت سے محروم ہو چکا ہوں۔ اس لئے مجھے کچھ یاد نہیں کہ میں کون ہوں؟ مجھے اپنا نام، والدین اور بھائی بہنوں کے نام بھی یاد نہیں رہے۔''

میں نے توقف کر کے اُسے صرف اتنا بتایا کہ سفر کے دوران میرا سوٹ کیس اور بریف کیس چوری ہو گیا جس میں میرا پاسپورٹ، شناختی کارڈ اور ٹکٹ تھے۔ میرے ہم سفر نے میرا نام پوچھا تو مجھے احساس ہوا کہ مجھے اپنا نام یاد نہیں آ رہا ہے۔ میں نے اپنا نام سالار رکھ لیا۔ میں نے اخبار میں اپنی تصویر اور اشتہار بھی چھپوایا تھا، اس کا بھی کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ میں اپنی تلاش میں مارا مارا پھر رہا ہوں۔

''آپ کی کہانی بڑی عجیب و غریب، حیرت انگیز اور پراسرار سی ہے۔'' وہ حیرانی سے بولی۔ ''آپ کا قیام کہاں ہے؟ آپ نے کہاں مکان لیا ہوا ہے؟''

''میں ایک ہوٹل میں کمرہ کرائے پر لے کر رہ رہا ہوں۔'' میں کہنے لگا۔ ''میں کوئی ڈیڑھ ماہ سے بہت سارے خطرناک اور عجیب و غریب واقعات سے دوچار رہا ہوں۔ ایسے حالات کی زد پر رہا ہوں کہ بیان نہیں کر سکتا۔ مجھے جن سے بھی واسطہ پڑا وہ ریاکار، سیاہ کار اور خودغرض نکلے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ دنیا میں اتنی گندگی ہے، یہ دنیا غلاظت کے دلدل سے بھری ہوئی ہے۔ حیرت تو اس بات کی ہے یہ دنیا اس طرف تیزی سے واپس جا رہی ہے جب تہذیب نے انسان کو چھوا نہیں تھا۔ لباس پہن کر آدمی متمدن نہیں ہو جاتا ہے۔ میڈم کی مثال لے لیں، اس عورت نے بیس لاکھ ریال کے آرڈر کے لئے اپنے آپ کو اور اپنی سولہ برس کی بہن صاعقہ کو ایک شیخ کی جھولی میں ڈال دیا۔''

''یہ بات آپ کو کس نے بتائی......؟'' شہناز نے ششدر ہو کر پوچھا۔

''یہ ایسی بات ہے جو بہت سارے لوگوں کے علم میں آ چکی ہے۔ اور اب پھیلتی بھی جا رہی ہے۔''

''یہ بات تو میں نے بھی سنی ہے۔ لیکن نجانے کیوں اس کا یقین نہیں۔'' وہ بولی۔

''یہ ایک ایسی بات ہے جس کا آپ کو کیا کسی کو بھی یقین نہیں آئے گا کیونکہ وہ ایک

مالدار عورت ہے۔ جس کے پاس کسی چیز کی کمی نہیں ہے، دولت اُبلی پڑ رہی ہے، یہ دُکان سونے کی ایک کان کی طرح ہے۔ اس کے علاوہ یہ عورت شادی شدہ بھی ہے۔ اس عمر میں بھی اس قدر حسین وجمیل ہے کہ مرد اس کی طرف متوجہ ہوئے بغیر نہیں رہ پاتے ہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ جس کے پاس جتنی دولت ہوتی ہے اس میں اتنی ہی ہوس ہوتی ہے۔ وہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ یہ دولت قبر میں نہیں لے جاسکتا دولت کے اندھے جنون میں ہر بات کی تمیز کھو بیٹھتا ہے۔ ہم لوگ جن کے پاس دولت نہیں ہے، ہمیں دولت کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے لیکن ہم ان کی طرح پستی میں نہیں گرتے ہیں، اچھے برے کی تمیز رکھتے ہیں۔

مجھے اس عرصے میں بہت سارے دولت مندوں سے واسطہ پڑا۔ اُنھیں قریب سے دیکھا۔ ساری دنیا کالی، ان کے دل کالے دکھائی دیئے۔ میں نے ان لوگوں کے ہاں اس خیال سے ملازمت کی کہ یہاں خلوص، محبت اور اپنائیت مل جائے تو زندگی گزار لوں، اپنے آپ کو تلاش کرتا رہوں۔ لیکن ان لوگوں نے مجھے اپنے غرض کی بھینٹ چڑھانے کی کوشش کی۔ میں یہ سوچتا ہوں کہ آخر کب تک اس بھری دنیا میں اکیلا خوار ہوتا اور بھٹکتا رہوں گا؟ کیا اس دنیا میں میرے گھر والے نہیں ہیں؟''

''آپ اللہ کی ذات سے مایوس نہ ہوں۔'' شہناز نے دلاسہ دیا۔ ''آپ ایک غیر معمولی انسان ہیں۔ اللہ نے آپ کو جو صلاحیتیں دی ہیں شاید ہی کوئی ان کا ثانی ہو۔ یادداشت سے محروم ہوجانے کے بعد ان عظیم ترین صلاحیتوں کا برقرار رہنا تعجب خیز بات ہے۔''

''ہر روز میری کیفیت ایک ماہی بے آب کی سی ہوجاتی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''آپ اندازہ نہیں کرسکتیں کہ مجھ پر کیا بیت رہی ہے۔ اپنے آپ کو اور گھر والوں کو پانے کے لئے میں بہت بے چین ہوں۔''

''آپ کے گھر والوں کی تلاش میں، میں آپ کی جو مدد کرسکتی ہوں وہ ضرور کروں گی۔'' وہ اپنائیت کے لہجے میں بولی۔ ''حیرت کی بات یہ ہے کہ آپ کے گھر والوں نے آپ کو تلاش کرنے کی کوشش کیوں نہیں کی؟ آپ کی شخصیت بڑی پراسرار اور معمہ بن گئی ہے۔ آپ کی گمشدگی کا اُنہوں نے نوٹس کیوں نہیں لیا؟''

''ہاں۔ یہ بات میرے لئے حیرت ناک ہے اور ایک معمہ بھی ہے۔'' میں نے کہا۔

''یا پھر یہ ہوسکتا ہے کہ اس دنیا میں میرا کوئی نہ ہو۔۔ والدین اور بہن بھائی وغیرہ نہ ہوں۔''

''لیکن رشتہ دار وغیرہ تو ہوں گے......'' اُس نے کہا۔ ''وہ تو خبر لے سکتے تھے۔''

''رشتہ داروں کو کیا پڑی ہے؟'' میں نے کہا۔ ''یہ دور ہی ریاکاری اور منافقت کا ہے۔''

''آپ ٹھیک کہتے ہیں۔'' شہناز نے کہا۔ ''آپ ہمارے ہاں آئیں۔ آپ اب تک ہمارے ہاں نہیں آئے۔ میری امی اور بہنوں اور بھائیوں سے مل کر آپ بہت خوشی محسوس کریں گے۔ آپ کو اپنے گھر کا سا ماحول ملے گا۔ آپ اپنے آپ کو تنہا محسوس نہیں کریں گے۔ کسی بات کی کمی محسوس نہیں ہوگی۔''

''میں کسی دن حاضر ہوجاؤں گا۔'' میں نے جواب دیا۔

○

میں نے محسوس کیا تھا کہ شہناز میری ذات میں غیر محسوس انداز سے دلچسپی لے رہی ہے۔ لیکن وہ خواب نہیں دیکھ رہی ہے جو عام طور پر لڑکیاں دیکھنے لگتی ہیں۔ میں نے اُسے جب سے یہ بتایا تھا کہ میں اپنی یادداشت سے محروم ہوچکا ہوں اور اپنے گھر والوں کو تلاش کر رہا ہوں وہ میرے بارے میں کچھ زیادہ ہی سوچنے لگی تھی۔ اُس کی خواہش تھی کہ میرے گھر والے مجھے مل جائیں۔

دس پندرہ دن تیزی سے گزر گئے۔ اس عرصے میں ایک بار بھی کسی وجہ سے میں شہناز کے ہاں نہ جاسکا۔ وہ غریب کئی بار مجھے اپنے ہاں مدعو کرچکی تھی۔ میں اُسے کسی نہ کسی بہانے سے ٹالتا رہا۔ لیکن ان دس دنوں میں کوئی دو تین مرتبہ ہم دونوں دُکان سے چھٹی ہونے پر ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر باتیں کرتے رہے تھے۔ شہناز میری محبت اور کمزوری بن گئی تھی۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ بڑی نفیس، شائستہ، بے حد مخلص اور بے غرض لڑکی ہے۔ ایسی لڑکی کسی کی جیون ساتھی بن جائے تو وہ دنیا کا خوش نصیب ترین شخص کہلائے۔ شہناز جیسی لڑکیاں ہزاروں میں نہیں بلکہ لاکھوں میں ایک پیدا ہوتی ہیں۔

ایک روز میڈم نے مجھے اور شہناز کو اپنے دفتر کے کمرے میں بلایا۔ وہ بہت خوش دکھائی دے رہی تھی۔ اس خوشی نے اُسے اور حسین بنا دیا تھا۔ اس عمر میں بھی اُس میں بلا کی کشش تھی۔ اسی لئے عرب شیخ اُسے اپنے بستر کی زینت بنا چکے تھے۔ وہ اپنا تن من میلا کرچکی تھی۔ جبکہ اس کی ضرورت نہیں تھی۔ اُس نے ہم دونوں کو بیٹھنے کے لئے کہا۔ جب

ہم بیٹھ گئے تو وہ بولی۔

''کناڈا سے ایک پاکستانی فیملی بیس برس بعد پاکستان مستقل رہائش کے لئے آئی ہے۔ اُنہیں آئے ہوئے ایک ماہ سے زائد عرصہ ہورہا ہے۔ اس خاندان کے سربراہ کا نام عبدالہارون ہے۔ ان کی بیگم اور دولڑکیاں ہیں۔ یہ وہاں کی ارب پتی فیملی ہے۔ سیٹھ ہارون نے ایک کوٹھی جو آٹھ ہزار گز پر کے ڈی اے سکیم نمبر ایک میں بنی ہوئی ہے وہ نوے کروڑ میں خریدی ہے۔ اُنہیں نوادرات سے بہت دلچسپی ہے۔ وہ اپنی کوٹھی کو نوادرات سے سجانا چاہتے ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق پچاس لاکھ کی نوادرات کی اُنہیں فی الحال ضرورت ہے۔ انہوں نے استاد اللہ بخش کی دو عدد پینٹنگز منگوائی ہیں۔ تم دونوں میری گاڑی میں رکھ کر لے جاؤ۔ نوادرات کے بارے میں تبادلہ خیال کرنا اور آرڈر دینا چاہئے۔ لٰہذا تم دونوں فہرست بنا کر اور پیشگی رقم کا چیک لے آؤ۔ اس بات کی کوشش کرنا کہ یہ آرڈر ایک کروڑ تک پہنچ جائے۔''

''کیا آپ اس آرڈر پر ہم دونوں کو کوئی کمیشن دیں گی؟'' میں نے پوچھا۔

''میں کمیشن کس لئے دُوں......؟ تم میری دُکان میں سیلز مین ہو، کمیشن ایجنٹ نہیں۔''

''آپ پانچ سے دس فیصد کمیشن دے دیں گی تو کیا فرق پڑے گا؟'' میں نے کہا۔ ''کیونکہ ایک کروڑ کے آرڈر پر آپ کے ستر اسّی لاکھ روپے کہیں نہیں گئے...... اس قدر زبردست منافع آپ کو ملے گا کہ تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔''

''یہ تم سے کس نے کہہ دیا کہ میں زبردست منافع لے رہی ہوں؟ مجھے ایک کروڑ کے مال پر صرف پچاس ہزار روپے ملیں گے...... اگر ایک کروڑ کے مال پر مجھے ستر اسّی لاکھ روپے مل جائیں تو میں کروڑ پتی نہ بن جاؤں؟''

''آپ اس وقت ایک ارب پتی سے کم نہیں ہیں۔ یہاں آپ جیسی دُکان کسی کی نہیں چلتی ہے۔''

''یہ تم سے کس نے کہہ دیا کہ میں ارب پتی ہوں؟'' وہ ہنس پڑی۔ ''اس دُکان کا کرایہ، بجلی اور دیگر اخراجات، تم لوگوں کی تنخواہیں...... اور پھر انکم ٹیکس والے ساری آمدنی ورمنافع لے جاتے ہیں۔ تم لوگ کیا جانو میں کس مشکل سے گزارہ کرتی ہوں۔ شاید سال یڑھ سال بعد دُکان بیچ دُوں...... آخر کب تک خسارہ برداشت کرتی رہوں گی؟''

''میں بحث میں نہیں پڑنا چاہتا۔ لیکن اتنا بتا دُوں کہ آپ کو اپنی جائیداد سے ماہانہ چھ لاکھ روپے کرایہ وصول ہوتا ہے۔ اس دُکان سے چالیس لاکھ روپے سارے اخراجات نکال کر آپ انکم ٹیکس بارہ ہزار روپے اور انکم ٹیکس کے بدعنوان افسر کو ماہانہ دو ہزار روپے دیتی ہیں۔ اس طرح سالانہ انکم ٹیکس تیس لاکھ روپے بچاتی ہیں۔ آپ کا کل اثاثہ ایک ارب بارہ کروڑ روپے کا ہے۔ سوئٹزرلینڈ کے ایک بینک میں آپ کے ایک لاکھ ڈالر ڈیپازٹ ہیں۔ یہاں پر بینک بیلنس مختلف بینکوں میں نوے لاکھ روپے ہیں۔ پھر بھی آپ خسارے میں ہیں؟''

وہ بھونچکی سی ہوگئی۔ پھر سنبھل کر بولی۔ ''سالار! کہیں تم نشے میں تو نہیں ہو؟''

''آئی ایم سوری میڈم!'' میں نے معذرت کی۔ ''میں نیند کی حالت میں نجانے کیا کیا بول گیا۔''

گاڑی میں جس وقت ہم دونوں عبدالہارون کی کوٹھی جا رہے تھے تب شہناز نے پوچھا۔ ''آپ نے بیگم صاحبہ کو ان کا جو گوشوارہ سنایا کیا وہ ایک مذاق تھا؟ اُن کا چہرہ فق ہو گیا تھا۔''

''وہ بالکل سچ تھا......'' میں نے جواب دیا۔ ''اس میں ایک بات بھی غلط نہ تھی۔''

''لیکن یہ سب کچھ آپ کے علم میں کیسے آیا؟'' شہناز نے مجھے متعجب نظروں سے دیکھا۔

''کل جب میں کسی کام سے اُن کے دفتر میں یا تو وہ واش رُوم میں تھیں۔ یہ گوشوارہ ان کی میز پر رکھا ہوا تھا۔ اسے میں نے پڑھ لیا۔'' مجھے جھوٹ بولنا پڑا۔ میں نے بتانا مناسب نہیں سمجھا کہ میں نے میڈم کے ذہن سے معلوم کیا تھا۔

ہم عبدالہارون صاحب کی پُرشکوہ کوٹھی پر پہنچے۔ ملازمہ نے ہمیں نشست گاہ میں بٹھایا اور اندر اطلاع دینے چلی گئی۔ شہناز صوفے پر بیٹھ گئی، میں ایک یونانی پینٹنگ دیکھنے لگا۔ یہ مجھے بہت مانوس سی لگی۔ میں اُسے دیکھ رہا تھا کہ مجھے چاپیں سنائی دیں۔ میں نے مڑ کے دیکھا، ایک اٹھارہ برس کی خوبصورت لڑکی اندر داخل ہوئی۔ اُس نے ٹھٹک کر مجھے دیکھا۔ پھر میری طرف والہانہ انداز سے بڑھی۔

''بھائی جان! ثاقب بھائی جان...... آپ...... آپ......'' وہ میرے سینے سے لگ کر سسک پڑی۔ یہ میری چھوٹی بہن مہ جبین تھی۔ ''آپ کہاں چلے گئے تھے......؟''

مجھے یقین نہیں آیا...... ایسا لگا میں خواب دیکھ رہا ہوں۔ پھر وہ میرے سینے سے الگ ہو کر آوازیں دینے لگی۔ ''امی.... ابو.... باجی.... افضال....! ثاقب بھائی جان آئے ہیں۔''

تھوڑی دیر بعد میرے والدین، بھائی اور بہنیں میرے سامنے موجود تھیں...... ایک اتفاقیہ ملاقات نے ڈرامائی انداز میں مجھے ان سے ملا دیا تھا۔ مجھے میری منزل مل گئی تھی۔ میرا بچھڑا سویرا مل گیا تھا...... ایک جذباتی اور رقت آمیز منظر تھا جس نے ہماری آنکھیں اشکبار کر دی تھیں۔ ہر کسی نے مجھے گلے لگایا...... وہ سب میری پراسرار گمشدگی پر بہت دُکھی تھے۔

پھر مجھے سب کچھ یاد آنے لگا...... میری یادداشت واپس آنے لگی۔ میں کاروبار اور رہائش اختیار کرنے کے لئے پاکستان آ رہا تھا تو دبئی چلا گیا تھا۔ وہاں سے اسلام آباد پہنچا۔ اسلام آباد میں ٹرین پر سوار ہوتے وقت گر پڑا۔ سر پر چوٹ لگنے سے میں بے ہوش ہو گیا۔ ہوش آیا تو میں اپنی یادداشت سے محروم ہو چکا تھا۔ میرے ہم سفروں نے مجھے برتھ پر لٹا دیا تھا۔ گھر والے ملتے ہی میری یادداشت لوٹ آئی تھی۔ پھر میں نے محسوس کیا کہ میں اب کسی کا ذہن پڑھ نہیں سکتا ہوں...... میں اس صلاحیت سے محروم ہو گیا تھا۔ یہ میرے لئے ایک طرح سے اچھا ہی ہوا تھا۔ گھر والوں سے جو ملاقات ہوئی اس خوشی میں مجھے شہناز کا خیال ہی نہیں رہا۔ جب وہ جانے لگی تو میں نے اُس سے کہا۔

''شہناز! معاف کرنا...... میں تمہیں بھول گیا تھا۔ آؤ! تم میرے گھر والوں سے ملو۔''

''امی، بھائی، بہنوں اور والد صاحب نے اُس کی طرف دیکھا۔ امی نے پوچھا۔

''بیٹے! یہ کون ہے؟''

''آپ کی ہونے والی بہو....'' میں نے شہناز کی طرف محبت بھری نظروں سے دیکھا۔ شہناز گلابی ہو گئی۔ اُس نے اپنی نظریں نیچی کر لیں۔ وہ کسی دُلہن کی طرح دکھائی دینے لگی۔ امی اُس کی بلائیں لینے لگیں تو مہ جبین نے آگے بڑھ کر اُسے چوم لیا۔ پھر بولی۔

''اللہ میاں نے نہ صرف بچھڑے بھائی کو ملا دیا بلکہ ایک چاند سی بھابھی بھی دے دی۔''

(ختم شد)